تجزیہء ادب کے جدید تناظرات: معاصر اردو ترقی پسند شاعری کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

سائرہ بانو

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۲ء

تجزیہء ادب کے جدید تناظرات: معاصر اردو ترقی پسند شاعری کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

سائرہ بانو

یہ مقالہ

پی ایچ-ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو ئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۲ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: تجزیہء ادب کے جدید تناظرات: معاصر اردو ترقی پسند شاعری کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

پیش کار: سائرہ بانو رجسٹریشن نمبر: 886/P/U/F19

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

ڈاکٹر ظفر احمد _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر _____

ریکٹر

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، سائرہ بانو حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ-ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ظفر احمد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

سائرہ بانو

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۲ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	i
اقرار نامہ	ii
فہرستِ ابواب	iii
Abstract	viii
اظہارِ تشکّر	x

باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف	2
Ii۔ بیان مسئلہ	2
iii۔ مقاصد تحقیق	3
iv۔ تحقیقی سوالات	3
v۔ نظری دائرہ کار	4
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	5
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	6
viii۔ تحدید	6
ix۔ پس منظری مطالعہ	6
x۔ تحقیق کی اہمیت	7

ب ۔ تجزیہ ادب کے جدید تناظرات	8
ج۔مابعد نو آبادیات	9
1۔تعارف	9
2۔مابعد نو آبادیاتی نظام کا پس منظر	24
3۔مابعد نو آبادیات کے ابتدائی مفکرین	28
ا۔فرانز فینن	28
۲۔ایڈورڈ سعید	33
۳۔ہومی کے بھابھا	37
۴۔گائیرتی چکرورتی اسپی وک	40
4۔ادب اور مابعد نو آبادیات مختصر جائزہ	42
حوالہ جات	44
باب دوم: معاصر ترقی پسند شعراء کا فکری ڈھانچہ	48
الف۔ادب برائے زندگی	48
ب۔اکیسویں صدی کی شاعری کا منظر نامہ	59
ج۔گلابلائزیشن اور ترقی پسند شاعری	69
د۔جدید فکری مباحث	78
ا۔ساختیات	78
۲۔پس ساختیات	80
۳۔جدیدیت	80
۴۔مابعد جدیدیت	83
۵۔تاریخیت	84

۶۔نو تاریخیت 86

۷۔مارکسیت 87

۸۔نومارکسیت 88

۹۔ردِ تشکیل 89

حوالہ جات 92

باب سوم: معاصر ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے سیاسی و سماجی اثرات 96

الف۔ معاصر ترقی پسند شاعری پر مابعد نوابادیات کے سیاسی اثرات 96

ب۔ معاصر ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے سماجی اثرات 132

حوالہ جات 182

باب چہارم: معاصر اردو ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے فنی و لسانی اثرات 191

الف۔ معاصر اردو ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے فنی اثرات 191

ا۔ تشبیہ و استعارہ 191

۲۔ تلمیح 197

۳۔منظر نگاری 202

۴۔صنعت تضاد 203

۵۔استفہامیہ انداز 205

۶۔ تمثال کاری 207

۷۔صنعت لف و نشر 209

۸۔ تکرار لفظی	211
۹۔ کردار نگاری	212
۱۰۔ شعور کی رو	213
۱۱۔ مراعاۃ النظیر	214
۱۲۔ قافیہ وردیف	214
۱۳۔ مجاز مرسل	216
۱۴۔ نظمیہ اسلوب	216
۱۵۔ مکالماتی انداز	217
۱۶۔ خود کلامی	218
ب۔ معاصر اردو ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے اسلوبی اثرات	219
حوالہ جات	241
باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات	248
الف۔ مجموعی جائزہ	248
ب۔ تحقیقی نتائج	256
ج۔ سفارشات	257
کتابیات	258

ABSTRACT

Title:

Modern perspectives of Literature Analysis: A Post-colonial study of contemporary Urdu progressive poetry

Abstract:

With the advent of human existence, the concept of ruler and subjugated emerged. From the time of the Cave to the present 21st century , the concept of master and slave has not been eradicated, but with the passage of time , this concept has matured. Post –colonialism is a form of critique that studies the cultural relations between the colonialist and the colonized. Because the cultural relation between the two are established under the colonial system. In the system , the colonizers has a monopoly at every level. As a result , new cultural , intellectual and literary styles are created in the colonies.

The purpose of the study is to bring to light the distinctions of contemporary Urdu progressive poetry. It also include an analysis of post colonial trends in contemporary Urdu progressive poetry.

To know in what form progressive poetry has adapted to the contemporary landscape of Urdu poetry and whether it has maintained its traditions or has withdrawn from it. How demographics left their mark on contemporary Urdu poetry.

This dissertation has been completed by using qualitative research method. In which the basic ideas are introduced along with the early thinkers of the post-colonial period. Literature for life as well as literature and globalization were examined. The political and social effect of post-colonialism on contemporary poetry as well as the artistic and stylistic features of contemporary poetry while adopting descriptive method were also mentioned. In this regard Colonialism and progressivism have been chosen as theoretical frame work.

As time went on, the priorities of the poets began to change and this had an effect on their progressive thinking. Most contemporary poets are still associated with progressive thought, while a few poets have given secondary status to progressive thought.

Contemporary progressive poetry must also be addressed in the context of modern 21st century intellectual discourse. So that not only the effect of post-colonialism but also the effects of other intellectual discourses can be examined.

اظہار تشکر

خدائے لم یزل کی شکر گزار ہوں کہ آج میرا پی ایچ-ڈی کا مقالہ مکمل ہوا۔ پی ایچ -ڈی کرنا میرے لیے کسی خواب سے کم نہ تھا اور اس خواب کی تکمیل میں جن احباب نے میرا ساتھ دیا ان کی میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ ان کے حوصلے اور دعاؤں نے آج مجھے اس مقام پر پہنچایا۔

اپنے والدین، بہن بھائی، اور ان تمام احباب کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہر موڑ پر دعا دی اور یہ ان کی دعا کا ہی ثمر ہے کہ میں آج مقالہ لکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ درس ہذا کے اساتذہ کرام اور خصوصاً صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ اور کوارڈینیٹر ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ کا شکریہ ادا کروں گی کہ انہوں نے پر موڑ پر محبت اور شفقت کے ساتھ رہنمائی کی۔ ڈاکٹر عابد حسین سیال کی شفقت بھری ڈانٹ ہمیشہ یاد رہے گی جو اس سفر کو مکمل کرنے میں کار گر ثابت ہوئی۔ نگران مقالہ ڈاکٹر ظفر احمد کی شکر گزار ہوں جنہوں نے موضوع کے انتخاب اور خاکے کی تیاری سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر طرح سے رہنمائی کی اور مواد کی فراہمی کو یقینی بنایا۔ مقالے کی تکمیل میں جہاں میرے قدم ڈگمگائے اور ہمت پست ہوئی وہیں ڈاکٹر ظفر احمد صاحب نے شفقت بھرے انداز میں رہنمائی کرتے ہوئے اس کام کو سہل بنایا۔

ان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر روش ندیم، ڈاکٹر مشتاق عادل، ڈاکٹر رحمت علی شاد، ڈاکٹر شعیب عتیق، ڈاکٹر سلمان اطہر، ضیاء اللہ خان سیال اور منور اقبال کی شکر گزار ہوں جنہوں نے خصوصی شفقت سے نوازا اور جب بھی ان سے رہنمائی طلب کی گئی انہوں نے ہر طرح سے رہنمائی کی۔ اپنے ہم جماعت اور دوستوں خصوصاً ثناء یٰسین، سدرہ طاہر، سمیرا ملک، محسن بخاری، ظفر گیلانی اور محمد رمضان کی شکر گزار ہوں جنہوں نے پی ایچ-ڈی کے سفر کو میرے لیے آسان بنایا۔

آخر میں خاص طور پر اپنے شریک حیات محمد مشتاق اور بیٹے کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے میرے اس خواب کو مکمل کرنے میں میرا ساتھ دیا۔

رب تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

سائرہ بانو

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

(الف) تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف(INTRODUCTION)

مجوزہ موضوع تجزیہء ادب کے جدید تناظرات کے حوالے سے ہے۔اس میں معاصر اردو ترقی پسند شاعری کا مابعد نو آبادیات کے تناظر میں مطالعہ کیا گیا۔ نو آبادیات سے مراد کسی ایک علاقے کے لوگوں کا دوسرے علاقے میں جا کر اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا اور ارد گرد کے علاقوں پر قبضہ کر کے اسے توسیع دینا ہے۔ جہاں یہ نو آبادی قائم کی جاتی ہے وہاں کے اصل باشندوں پر قابض گروہ اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت بھی مسلط کر دیتے ہیں۔مابعد نو آبادیات سے مراد نو آبادیات کے بعد کا دور یا زمانہ ہے یعنی نو آبادیاتی نظام سے چھٹکارے کے بعد کا دور۔ اس اصطلاح اور سوچ کو ایڈورڈ سعید کی ۱۹۷۸ء میں شائع ہونے والی کتاب ''اوریئنٹل ازم'' سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس بات سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ مابعد نو آبادیات تنقید کا ایک نیا طرز ہے جو استعمار کار اور استعمار زدہ کے ثقافتی رشتوں کا مطالعہ کرتا ہے ۔ کیونکہ دونوں کے ثقافتی رشتے نو آبادیاتی و استعماری نظام کے تحت قائم ہوتے ہیں۔

اس نظام میں استعمار کار کو ہر سطح پر اجارہ داری حاصل ہوتی ہے۔ وہ طاقت کی اکثر صورتوں سیاسی، علمی، معاشی، تعلیمی اور فنی کو پیدا کرنے اور نو آبادیوں میں سیاسی، آئینی اور تعلیمی اصلاحات کے ذریعے ان کے نفوذ کو ممکن بنانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں نو آبادیات میں نئی تہذیبی، فکری اور ادبی روشیں پیدا ہوتی ہیں۔ مابعد نو آبادیات ثقافت اور طاقت کے انہی رشتوں کا تجزیہ کرتی ہے جن میں استعمار کار کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

زیرِ بحث موضوع میں ترقی پسند شاعری کے حوالے سے بات کی گئی ترقی پسند شاعری سے مراد ایسی شاعری ہے جس میں پرانے اور فرسودہ خیالات کو رد کر کے نئے اصول، قاعدے اور رجحانات کو قبول کیا جائے۔ ترقی پسند شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے ہوتا ہے۔ جس کا اصل مقصد "ادب برائے ادب" کی بجائے "ادب برائے زندگی" کو پروان چڑھانا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جو شاعری کی گئی اس کا مقصد عوام کے مسائل کو منظر عام پر لانا تھا۔ اس وقت کے معروف ترقی پسند شعراء میں احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، احمد فراز، امرتہ پریتم، احمد علی، اختر الایمان، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، فراق گورکھپوری اور ساحر لدھیانوی نمایاں ہیں۔

زیرِ بحث موضوع میں معاصر ترقی پسند شاعری کی بات کی گئی ہے۔ موضوع کی تحدید کرتے ہوئے ۱۹۸۵ء سے ۲۰۲۰ء تک کے ان معاصر ترقی پسند شعراء کے کام کو شامل تحقیق کیا گیا جو باقاعدہ انجمن کا حصہ رہے ہوں اور اس معاصر عرصے میں ان کا کم از کم ایک مجموعہ منظر عام پر آچکا ہو۔ مجوزہ موضوع میں نو آبادیات کے بعد کی بات کی گئی ہے۔ ترقی پسند شاعری میں نو آبادیات کے اثرات کے تحت کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ شعراء کی فکری ترجیحات کے بدلنے کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ اور کس طرح مابعد نو آبادیات نے معاصر ترقی پسند شاعری پر اپنا اثر چھوڑا۔ مجوزہ موضوع میں ان امور کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

۲۔ بیان مسئلہ (STATEMENT OF PROBLEM)

ہر دور کے حالات و واقعات ادب کے مزاج کا حصہ بنتے رہے اردو ادب بھی ہر دور کے تمام فکری رجحانات کا علمبردار رہا ہے۔ مابعد نو آبادیات ایک جدید نظریہ ہے جس نے بہت تیزی سے اردو ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ترقی پسند تحریک کا وجود بھی ایک خاص فکری نظام کا مرہون منت ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادیب ہر دور کی جدید مباحث کو اپنی تخلیقات کا حصہ بناتے چلے آرہے ہیں۔ ابتداء میں اس تحریک سے منسلک شاعروں اور ادیبوں نے مشنری جذبے کے تحت تحریک کے منشور کو سامنے رکھتے ہوئے علمی و ادبی تخلیقات کیں۔ یوں اس تحریک نے چند سالوں میں ہی نہ صرف علم وادب کے میدان میں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں دیرپا اثرات چھوڑے۔ ادب میں نو آبادیات کی روایتی بحث جب مابعد نو آبادیات کے جدید فکری قالب میں ڈھلی تو اس فکر نے ہمہ جہت انداز سے اپنے اثرات معاصر اردو شاعری پر بھی مرتب کیے۔ شاعری

کے موضوعات اسلوب، پیش کش وغیرہ ایک نئے انداز سے سامنے آئے۔ اس مقالے میں ان سب عوامل کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ مقاصد تحقیق (RESEARCH OBJECTIVE)

۱۔ معاصر ترقی پسند اردو شاعری کے بنیادی امتیازات کی نشاندہی کرنا۔
۲۔ معاصر ترقی پسند اردو شاعری میں مابعد نو آبادیاتی فکری رجحانات کا تجزیہ کرنا۔
۳۔ معاصر ترقی پسند اردو شاعری میں دیگر معاصر فکری مباحث کے اثرات کا جائزہ لینا ۔

۴۔ سوالات تحقیق (RESEARCH QUESTION)

۱۔ معاصر ترقی پسند اردو شاعری کے بنیادی امتیازات کی اساس کیا ہے ؟
۲۔ مابعد نو آبادیاتی فکر نے معاصر ترقی پسند اردو شاعری کے فکری نظام کو کیسے متاثر کیا ہے ؟
۳۔ معاصر ترقی پسند اردو شاعری میں دیگر فکری مباحث کس صورت میں موجود ہیں ؟

۵۔ نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAMEWORK)

مابعد نو آبادیات تنقید کا ایک نیا طرز ہے جو استعمار کار اور استعمار زدہ کے ثقافتی رشتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے ثقافتی رشتے نو آبادیاتی و استعماری نظام کے تحت قائم ہوتے ہیں۔ ادب میں مابعد نو آبادیات کے حوالے سے بہت سے مفکرین نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ جن میں فرانز فینن، ایڈورڈ سعید اور ھومی کے بھابھا کے نام قابل ذکر ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی نظریات میں فرانز فینن کو بنیادی مفکر مانا جاتا ہے۔ ان کی کتب Black skin White Mask,A Dying of Colonialsm,The Wretched of Earth, ان کے نو آبادیاتی نظریات کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

ایڈورڈ ڈبلیو سعید مابعد نو آبادیاتی نظریات کے حوالے سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس نظریے کی وضاحت اپنی تین اہم کتب میں کی ہے۔ اس حوالے سے ان کی پہلی کتاب Orientalism جس کا اردو ترجمہ محمد عباس نے "شرق شناسی" کے نام سے کیا اور اس کتاب کو مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے شائع کیا

گیا۔ دوسری کتاب Imperialism and Culture ہے جس کا ترجمہ یاسر جواد نے "ثقافت اور سامراج" کے نام سے کیا ہے اسے بھی مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ تیسری کتاب Covering Islam جس کا ترجمہ اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ کے نام سے کیا گیا اسے بھی مقتدرہ قومی زبان نے شائع کیا۔ ایڈورڈ سعید نے ان کتب میں اپنے مابعد نو آبادیاتی نظریات کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

مابعد نو آبادیات کے حوالے سے ھومی کے بھابھا نے The Location Of Culture کے نام سے کتاب تحریر کی۔ اس کتاب کو بیسویں صدی کی اہم کتاب مانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بھابھا نے چند اصطلاحات وضع کر کے ان کی وضاحت کی ہے۔ استعمار کار اور استعمار زدہ کے ثقافتی رشتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بھابھا کو جن نفسیاتی معاملات سے آگاہی ہوئی ان کے لیے بھابھا نے باقاعدہ اصطلاحات وضع کیں۔ جن میں Mimicri (نقل)، Ambivilance (ثقافتی تذبذب) اور Hybridity (ثقافتی ادغام) شامل ہے۔

زیر نظر مقالے کو ایڈورڈ سعید کی کتابوں میں بیان کردہ نظریات کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ ان کے نزدیک

۱۔ مشرق اور مغرب کی تاریخ، جغرافیہ، فکری روایات اور مناظر الگ ہیں۔

۲۔ مغرب کی طرح مشرق کا الگ وجود، پہچان اور شناخت ہے۔

۳۔ مشرق کا اپنا نظریہ ہے اور مغرب کا اپنا نظریہ ہے۔

۴۔ مشرق کی اپنی لسانی پہچان اور ذخیرہ الفاظ ہے جو مغرب کے لیے مشرق کے وجودِ حقیقی کو ثابت کرتا ہے۔

۵۔ مغرب مشرق کو خاص نظر سے دیکھتا ہے۔

۶۔ مغرب نے مشرق میں غیر منصفانہ اور سرمایہ دارانہ نظام متعارف کروایا۔

۷۔ مغرب مشرق کو پسماندہ، کم فہم اور ناخواندہ سمجھتا ہے۔

۸۔ مشرق تہذیب و ثقافت، زبان اور رسم و رواج میں کم تر درجے پر فائز ہے۔

۹۔ مغرب نے مشرق میں احساسِ کمتری پیدا کر دی۔

۱۰۔ مشرق ہر معاملے میں مغرب سے رہنمائی لیتا ہے۔

۱۱۔ مشرق علوم و فنون خصوصا ٹیکنالوجی پر مغرب کی اجارہ داری کو تسلیم کرتا ہے۔ مغرب نے جدید علوم اور ٹیکنالوجی کی مدد سے ہنوز اس کام کو جاری رکھا ہوا ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ ترقی پسند شعراء ایک نظریے اور منشور کے تحت ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں ۔ لیکن وقت کے ساتھ ان انجمن سے وابستہ شعراء نے اپنی شاعری میں جدید اثرات کو قبول کیا۔ اکیسویں

صدی میں جہاں علمی و ادبی رویے ان شعراء کی شاعری پر اثر انداز ہوئے ہیں وہاں مابعد نو آبادیاتی عناصر بھی ان شعراء کے ہاں قابلِ ذکر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔لہذا یہ امر ضروری قرار پاتا ہے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ اس پیمانے کے تحت بھی کیا جائے۔تاکہ ترقی پسند شاعری کے معاصر موضوعات کی وضاحت ہو سکے۔اس سے ترقی پسند شاعری کے ارتقائی سفر کی موجودہ منزل کی نشاندہی اور انفرادیت بھی قائم ہو سکے گی۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار(RESEARCH METHODOLOGY)

مجوزہ تحقیقی موضوع معاصر ترقی پسند شاعری کے حوالے سے ہے۔ترقی پسند شاعری فرسودہ رسم و رواج اور عقائد و نظریات کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ نئی فکر اور سوچ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔زیر بحث موضوع میں جن شعراء کو شامل تحقیق کیا گیا ہے ان کے انتخاب کے لیے ترقی پسند ادب کے ترجمان رسالوں "انگارے" اور "فنون" سے مدد لی گئی ہے۔ان رسالوں میں چھپنے والی شاعری کو ان کے تخلیق کار کے لحاظ سے منتخب کیا گیا ہے۔جن شعراء کا کلام ابھی اشاعت پذیر نہیں ہوا ان کو شامل تحقیق نہیں کیا گیا۔جو شعراء ۱۹۸۵ء سے قبل کے ہیں اور مذکورہ جرائد کی فہرستوں میں شامل ہیں اور وہ شاعر جو باقاعدہ انجمن سے جڑے ہوئے ہیں یا ترقی پسند فکر کے ترجمان رسالوں کے نمائندہ ہیں،ان کا انتخاب انجمن کے سیکٹریز سے رابطہ کر کے کیا گیا ہے۔ زمانی اعتبار سے ۱۹۸۵ء سے ۲۰۲۰ء تک کے شعراء کی شاعری کو اس تحقیق میں شامل کیا گیا ہے۔ان شعرا میں روش ندیم،ارشد معراج، سعادت سعید،اشکر فاروقی،حارث خلیق،ضیاءالحسن، فضل احمد خسرو،کاشف رضا،مظہر حسین سید،اور نواز شاہد شامل ہیں۔

اِن شعراء کے کلام کا تجزیہ مابعد نو آبادیاتی نظریات کے تحت کیا گیا ہے۔مابعد نو آبادیاتی اثرات کس طرح شعراء کی شاعری پر اثر انداز ہوئے اور شعراء نے کن فکری ترجیحات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاعری کی، مجوزہ موضوع میں ان سب کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس حوالے سے مابعد نو آبادیاتی مفکر ایڈورڈ سعید کے ما بعد نو آبادیاتی نظریات کو کلیدی حیثیت حاصل ہو گی۔ان کے بیان کردہ نظریات کی روشنی میں ان شعراء کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مجوزہ تحقیقی مقالے کی نوعیت دستاویزی تحقیق(Qualitative Nature of Research) ہے۔ مجوزہ موضوع میں معلومات، تصورات، نظریات اور شواہد کو اکٹھا کر کے آخر میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ مقالے کی تکمیل کے لیے بنیادی مآخذ کے علاوہ ثانوی مآخذ کے طور پر موضوع سے متعلق اردو انگریزی کتب، لغات، ریسرچ پیپر، رسائل و جرائد اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ موضوع سے مطابقت رکھنے والے مقالات اور مختلف برقی سائٹ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف لائبریریز جیسے نمل کی لائبریری، مقتدرہ قومی زبان کی لائبریری، اکادمی ادبیات، کنٹونمنٹ بورڈ لائبریری، نیشنل لائبریری اور علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کی لائبریری میں موجود تحقیقی و تنقیدی مواد اور کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق(WORKS ALREADY DONE)

مجوزہ موضوع تحقیق کے لحاظ سے ایک منفرد موضوع ہے۔ جامعاتی سطح پر اس موضوع پر باقاعدہ کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا جس میں معاصر ترقی پسند شاعری کا جائزہ اس تناظر میں لیا گیا ہو۔ البتہ کچھ شعراء کی شاعری پر عمومی نوعیت کا تحقیقی کام ہوا ہے۔ چند اہم کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ شادب گل، روش ندیم کی نظم نگاری، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

۲۔ منظور حسین، ارشد معراج کی نظم نگاری، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے، نمل اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

۳۔ صبغت اللہ، لیہ میں اردو شاعری کے ترقی پسندانہ عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم فل، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۔۲۰۱۸ء

۴۔ حامد اقبال بٹ، ترقی پسند تحریک کے انتقاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم اے، جی سی یونیورسٹی، لاہور، س۔ن

۸۔ تحدید(DELIMITATION)

مجوزہ موضوع میں معاصر شاعری کو مابعد نو آبادیات کے تناظر میں پرکھا گیا ہے۔ زمانی لحاظ سے ۱۹۸۵ء سے ۲۰۲۰ء تک کے ان ترقی پسند شعراء کو شامل تحقیق کیا گیا ہے جن کو ترقی پسند فکر کے ترجمان رسالوں میں مرکزی حیثیت دی گئی۔ موضوع کے حوالے سے ترقی پسند شاعری پر بات کی گئی ہے۔ ناول اور ترقی پسند افسانہ کو اس بحث میں شامل نہیں کیا گیا۔

۹۔ پس منظری مطالعہ(LITERATURE REVIEW)

پس منظری مطالعہ کے طور پر ترقی پسند تحریک، ادب خصوصاً شاعری پر موجود کتب کا مطالعہ کیا گیا۔ جن میں جمال نقوی کی ترقی پسند تحریک: ادب اور سجاد ظہیر، سجاد ظہیر کی روشنائی،نسر اج رہبر کی ترقی پسند ادب ایک جائزہ، علی احمد فاطمی کی ترقی پسند تحریک سفر در سفر،یعقوب یاور کی ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری شامل ہیں۔ مابعد نو آبادیات کے مطالعے کے لیے سہیل احمد کی کی مرتب کتاب ''نو آبادیات و مابعد نو آبادیات (نظریہ، تاریخ، اطلاق) کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ناصر عباس نیر کی کتاب "مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں "کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت (RESEARCH GAP)

اُردو میں ترقی پسند تحریک کی حیثیت نمایاں اور واضح ہے۔ اس تحریک سے ادب کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ ترقی پسند تحریک کی بدولت ہی ترقی پسند شاعری منظر عام پر آئی جس میں عوام کے احساسات کا ذکر بڑے بے باک انداز میں کیا گیا۔ ترقی پسند ادب کے ذریعے ''ادب برائے زندگی''کا جو نعرہ بلند ہوا تھا اسی کی وجہ سے شعرا میں ایسا جذبہ اورولولہ پیدا ہوا کہ وہ ادب کے ذریعے پسے ہوئے اور مظلوم طبقے کی نمائندگی شاعری کے ذریعے کر سکیں۔ اردو شاعری کے معاصر منظر نامے میں ترقی پسند شاعری کس صورت میں ڈھل چکی ہے کیا یہ اُپنی روایات بر قرار رکھے ہے یا ان سے کنارہ کشی کر چکی ہے ان سب سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس تحقیق کی ضرورت ہے۔ جس سے معاصر ترقی پسند شعرا کی شاعری کی قدر و اہمیت کی نشاندہی کرنے میں آسانی ہو گی ۔ معاصر ترقی پسند شعراء کے فکری ڈھانچے سے آگاہی حاصل کرنے اور ان کی تخلیقات کو مابعد نو آبادیات کے تناظر میں پرکھنے کے لیے یہ تحقیق کی گئی ہے ۔ اردو ادب میں اس سے قبل ترقی پسند شاعروں کی تخلیقیت کو مابعد نو آبادیات کے حوالے سے نہیں پرکھا گیا۔ ادب میں یہ تحقیق اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہو گی کیونکہ شاعر اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہو کر ہی اپنی تخلیق تحریر کرتا ہے اور معاشرے میں رونما ہونے والے مسائل اور پیچیدگیوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔ اس تحقیقی کاوش سے اردو زبان و ادب کے طالب علم معاصر ترقی پسند شعراء کے کام سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

(ب) تجزیہ ادب کے جدید تناظرات

ادب میں تجزیہ سے مراد کسی ادبی کام جیسا کہ نظم، نثر، افسانہ، ناول یا ڈرامہ وغیرہ کا گہرائی سے مطالعہ اور اس کی ساخت، موضوعات، کرداروں، اسلوب اور دیگر عناصر کا تفصیلی جائزہ لینا ہے۔ اس میں ادبی تخلیق کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ اس کے معانی، ساخت، اثرات اور تخلیق کی نوعیت کو بہتر طور پر جانچا جاسکے۔ ادب کے چند جدید تناظرات کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

1۔ماحولیاتی تنقید: ادب میں قدرتی ماحول، حیاتیاتی تنوع اور انسانوں کا فطرت کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟ ان سب کا مطالعہ ماحولیاتی تنقید میں کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ادب میں فطری دنیا کے بارے میں انسان کی سوچ اور اس کے کردار کو پرکھتا ہے۔

2۔نفسیاتی تنقید: نفسیاتی نقاد ادب کو فریڈ اور جنگیائی نظریات کے تناظر میں دیکھتے ہیں مصنف اور کرداروں کے نفسیاتی عناصر کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ ادب میں پوشیدہ خواہشات، لاشعوری رجحانات اور نفسیاتی تنازعات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

3۔مابعد جدید تنقید: یہ تنقید پس ساختیات کی طرح حقیقت، معانی اور شناخت کے بارے میں سوالات اٹھاتی ہے۔ مابعد جدید نقاد ادب میں ماضی کی روایت کو چیلنج کرتے ہیں۔ اس کا مقصد سماج، حقیقت اور ادب کے اندر موجود مستقل تبدیلیوں اور حالات کی عکاسی کرنا ہے۔ اس جدید نظریے میں ادب کی نوعیت، اس کی تخلیق،، اثرات اور سماجی یا ثقافتی حوالوں کو مختلف طریقوں سے سمجھا جاتا ہے۔

4۔نسائی تنقید: یہ تنقید ادب میں خواتین کی نمائندگی اور خواتین کے حقوق پر زور دیتی ہے۔ اس تنقید کے تحت ادب میں خواتین کے کرداروں کو کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ اور مردوں کے مقابلے میں ان کے کرداروں کو کس طرح کم تر کرکے دکھایا جاتا ہے۔ نسائی نقاد خواتین کی آوازوں کو بلند کرتے ہیں۔

اس طرح کے مذید جدید تناظرات نے عہد حاضر میں ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ جن میں ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مارکسیت، نومارکسیت، نو آبادیات، مابعد نو آبادیات، کرٹسزم، نیو کرٹسزم، تاریخیت اور نو تاریخیت جیسے مباحث شامل ہیں۔ عصر حاضر میں جدید انسان جہاں بہت سی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوا ہے وہاں یہ جدید فکری مباحث ہیں جو ادب کے ساتھ اپنی جڑت قائم رکھنے میں

کامیاب ہوئے ہیں۔ان کے مطالعے سے نہ صرف نفسیاتی کشمکش سے چھٹکارا ملتا ہے بلکہ ذہن کے دریچے بھی کھلتے ہیں نت نئے تناظرات کی بدولت ہی لفظ سے اس کے ایک معانی تک اور ایک معانی سے بڑھ کر جملے کی تہہ تک پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک لفظ اپنے اندر کتنے مفاہیم کا ذخیرہ رکھتا ہے یہ سب انہی نظریات کی بدولت معلوم ہوتا ہے۔

(ج) مابعد نو آبادیات:

ا۔ تعارف :مابعد نو آبادیات کے تعارف سے قبل ضروری ٹھہرتا ہے کہ نو آبادیات اور اس کے متعلقات کا تعارف بیان کیا جائے۔انسانی زندگی چونکہ حرکت سے عبارت ہے۔حرکت زندگی اور جمود موت کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔انسان سے سرزد ہونے والا کوئی بھی فعل ضرورت اور سہولت کے تحت کیا جاتا ہے۔یہی ضرورت اور سہولت کا نظریہ ہی نو آبادیات کے آغاز کا باعث بنا۔نو آبادیات کا تصور بھی نظریہ ضرورت اور سہولت کے تحت وجود میں آیا۔دنیا میں سپر پاور بننے والی اقوام بھی اسی نظریے کے تحت کامیاب ہوئیں ہیں۔اپنی سہولت کے تحت انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا اور یہی منتقلی دراصل نو آبادیات کے آغاز کا پیش خیمہ بنی۔نو آبادیات سے مراد "نئی آبادی بسانا"۔یعنی کسی بھی ایسی جگہ جا کر آبادی قائم کرنا جہاں پہلے سے آبادی کا وجود نہ ہو یا وہاں آبادی کے آثار نہ ہوں پہلے سے موجود آبادی میں جا کر نئی آبادی قائم کرنا نو آبادیات میں شامل نہیں ہوتی۔

نو آبادیات(Colonies) کا لفظ آبادی(Colony) سے اسم جمع ہے۔جس کا مطلب نئی آبادی یا نئی بستی کے ہیں۔اصل میں یہ لفظ لاطینی اصطلاح Colonia سے نکلا ہے۔جس کا مطلب کچھ منظم افراد کا کسی بھی دوسری انسانی آبادی پر قبضہ کر کے اس کے استحصال کے لیے وہاں نئی آبادی قائم کرنا۔ نو آبادیات کے لیے انگریزی میں Colonialism کا لفظ رائج ہے۔اے ڈکشنری آف پالیٹکس میں نو آبادیات کی تعریف اس انداز میں کی گئی ہے۔

> Colonialism strictly refered to the polices and methods by Which an imperial power maintained and extended it control Over other tellitories or

peoples;now more frequently used In a pe jorative sense,often synonymous with imperialism. (1)

نو آبادیات کی تعریف مختلف لغات میں الگ الگ انداز سے بیان کی گئی ہے۔ فرہنگ اصطلاحات کے مطابق:

" فرہنگ اصطلاحات میں اس لفظ کے معانی استعمار پسندی یا استعماریت بیان کیے گئے ہیں۔" (۲)

ڈکشنری آف دی لینگوئج کے انسائیکلوپیڈیا ایڈیشن میں نو آبادیاتی نظام کی تعریف اس انداز میں کی گئی ہے۔

The policy of a nation seeking to acquire extend or retain overseas dependencies.(3)

آکسفورڈ ایڈوانس لرنر میں نو آبادیاتی نظام کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

The practice by which a powerful country controls less power ful countries and uses their resources to increase its own power and wealth.(4)

نو آبادیات کی اصطلاح سب سے پہلے کس نے استعمال کی؟ اس بات کے حوالے سے مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہے ۔کچھ کے نزدیک رومیوں نے اس کا آغاز کیا تو بعض مفکرین اس کے آغاز کا سہرا پرتگالیوں کے سر باندھتے ہیں۔ڈاکٹر مبارک علی کے نزدیک:

" نو آبادیات کی اصطلاح سب سے پہلے رومیوں نے استعمال کی۔وہ جب کسی علاقے پر قبضہ کرتے تو وہاں اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے اپنے افراد پر مشتمل نئی آبادیاں قائم کر لیتے تھے۔ آج کل یہ اصطلاح غیر ملکی اقتدار اور تسلط کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔" (۵)

ناصر عباس نیر کے مطابق:

"یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کی خاطر برپا ہونے والی صورت حال ہے۔"(۶)

نو آباد کار اپنے آپ کو افضل اور مقتدر طبقے کو کم تر خیال کرتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ قدرت نے ہمیں ان پر قابض کیا ہے۔ تا کہ ہم ان جاہل اور گنوار لوگوں کو علم دے کر ان کو مہذب بنا سکیں۔ استعمار کار اپنے آپ کو Civilized اور استعمار زدہ کو Uncivilized مانتے تھے نو آباد کار یہ سمجھتے تھے کہ:

"ہم بہتر قوم ہیں لہذا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ہم مہذب اور ترقی یافتہ ہیں اس لیے غلام قوموں کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔" (۷)

موجودہ دور میں نو آبادیات ایک اصطلاح کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس کا مفہوم لغوی اور قیاسی ہی مراد نہیں لیا جاتا۔ اب نو آبادیات کے معانی صرف نئ آبادی کے قیام تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ پندرھویں صدی کے بعد سے ہی نو آبادیات کا مفہوم سیاسی، معاشی اور ثقافتی انداز سے بدل گیا۔ بات ضرورت سے نکل کر سہولت میں داخل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ نو آبادیات اب ایک نو آبادیاتی نظام میں بدل گیا ہے۔ عامر سہیل کے نزدیک:

"نو آبادیاتی نظام (Colonialism) سے مراد ایک سیاسی، معاشی اور ثقافتی نظام ہے جس میں ایک ملک علم، ٹیکنالوجی اور فوجی طاقت کی بنیاد پر دوسرے ملک کو ہر سطح سے مغلوب کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں غالب ملک کو ہر سطح پر فائدہ میسر آئے۔ ایک ملک اپنی جغرافیائی حدود سے نکل کر دوسرے ملک کی جغرافیائی حدود میں عملا داخل ہو کر وہاں کے باشندوں کو مختلف حکمت عملیوں سے مغلوب کرتا ہے۔۔۔۔ نو آبادیاتی (Colonialism) نظام ایک ایسا سیاسی و معاشی عمل ہے جس میں یورپین اقوام نے مختلف علاقوں میں پہنچ کر وہاں پہلے سے موجود آبادیوں پر دھاوا بول کر انہیں زراعت پر منجمند کر کے وہاں سے خام مال حاصل کیا۔" (۸)

بر صغیر پاک و ہند میں برطانوی نو آبادیاتی نظام کے قیام اور اس قیام کے درپردہ مقاصد کا جائزہ لینے کے لیے نو آبادیاتی نظام کی وضاحت ضروری ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کا سہارا لیا جائے تو اس کی وضاحت کچھ یوں ہوتی ہے۔

"لفظ کلونیل ازم دراصل رومن لفظ کلونیا (Colonia) سے مشتق ہے جس کے معانی "Farm" یعنی کھیت یا پھر سیٹلمنٹ یعنی بستی کے ہیں۔ اور یہ

اصطلاح ان جگہوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جہاں رومن اپنے آبائی اوطان چھوڑ کر جا بستے تھے۔ البتہ وہ ابھی بھی رومن شہری (Citizen) کے سٹیٹس کے حامل تھے۔" (۹)

نو آبادیاتی نظام کا آغاز کب اور کیسے ہوا اس حوالے سے مختلف مفکرین اپنی رائے دیتے ہیں۔

Modern colonialism goes back to the era of European discovery in the fifteenth century, connecting exploitation of raw materials with missionary ideas. Since then colonialism has taken several and different forms, and various colonial powers(such as the portguese and french in Africa,French and British in Middle East and south Asia,the Dutch in South East Asia, the Spanish in South America) tried to support their own hegemonies in Europe as well as competing and contesting materially and politically in border to control the new world. (10)

نو آبادیاتی نظام کی اس تعریف سے ہمارے سامنے کچھ نکات آتے ہیں۔

۱۔ نو آبادیاتی نظام کے درپردہ عیسائی مشنریز کے عزائم کارفرما تھے۔ ۲۔ خام مال تک رسائی کے لیے ترقی یافتہ ملکوں کی تجارتی منڈیوں کی تلاش۔ ۳۔ سیاسی طور پر غلبہ حاصل کر کے وہاں کے نظام معیشت کو کنٹرول کرنا۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے بہت سے طریقے اپنائے مثلاً، تجارت، لوٹ مار، مزاکرات، جنگ و جدل، نسل کشی، مقامیوں کو غلام بنانا اور بغاوت کو فروغ دینا وغیرہ۔

کے۔ کے۔ عزیز برطانوی امپیریل ازم کے متعلق یوں لکھتے ہیں

The Indian ,Mutiny of 1857 hardened the imperial resolve to keep India at any cost:had so much

English bloodshed in quelling the rising so that a few years later the rebels should be rewarded freedom! British Imperialism has a long history.In the visible Elizabethan age seaman explored markets and ships full of gold trading companies were founded and the mercantilist theory of state soon made the flag fellow the trade.North America and the West India fell into british hands and the first British empire was born.It was an empire of settlement immigrants from the home country peopling the colonies.(11)

نو آبادیات کے حوالے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ذکر کرتے ہوئے ہمفرے نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہمفرے جو کمپنی کی ملازمت کے بعد وزاراتِ خزانہ میں ایک اعلی مقام فائز تھا وہ کمپنی کے حوالے سے کہتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہتی تھی جس کے ذریعے وہ نو آبادیوں میں اپنا قبضہ مضبوط کر لیں اور ایسے پروگرام ترتیب دے رہی تھی کہ جن کے ذریعے وہ علاقے جہاں کمپنی کا اثر ورسوخ قائم نہیں ہے وہاں بھی نو آبادیاتی نظام رائج کروا سکے۔ ہمفرے کے نزدیک:

"ایسٹ انڈیا کمپنی بظاہر تجارتی نوعیت کی تھی مگر در حقیقت جاسوسی کا اڈہ تھا اور اس کے قیام کا مقصد ہندوستان میں ان صورتوں یا ان راستوں کی تلاش تھی جن کے ذریعے سرزمین پر مکمل طور پر برطانیہ کا اثر رسوخ قائم ہو سکے اور مشرقِ وسطی پر اس کی گرفت مضبوط کی جا سکے یہ تدابیر طویل المعیاد پروگراموں کی صورت میں ان سرزمینوں پر جاری ہوئیں جو تمام کی تمام افتراق، جہالت، بیماری اور غربت پر استوار تھیں۔ (۱۲)

الغرض تجارت کی غرض سے رہائش اختیار کرنے کے لیے یورپی اقوام نے جب کمزور ممالک پر غلبہ قائم کیا تو اس صورت میں اپنایا جانے والا نظام نو آبادیاتی نظام (Colonialism) کہلایا۔ سیاسی، سماجی، معاشی اور لسانی

سے بڑھ کر یہ غلبہ ثقافتی نوعیت کا ہے۔ جس کی وجہ سے محکوم ملک اپنی شناخت کھو بیٹھا اور شناخت کھونے کے بعد وہ غالب ملک کی ثقافت اور معیشت کا محتاج بن کر رہ گیا۔ نو آبادیاتی نظام کی جگہ اگر ہندوستان میں "سامراج" کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہ زیادہ مناسب ہو گا۔ کیونکہ سامراج کا مطلب "غیروں کا راج" ہے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور ان کا مقامی آبادی کا استحصال کرنا اس کی واضح مثال ہے۔

نو آبادیاتی نظام میں نئی آبادیاں قائم کی جاتی ہیں۔ اپنا علاقہ چھوڑ کر نئی جگہ جا کر آبادی قائم کرنا نو آبادیاتی نظام کہلاتا ہے۔ جبکہ سامراج چونکہ غیروں کے راج سے متعلق ہے اس کا مطلب اپنے تصرف کی زمین کو چھوڑ کر اس زمین کے متعلق سوچنا اور قبضہ کرنا جو اپنی نہیں ہے۔ سامراجیت میں اپنے علاقے میں رہتے ہوئے غیر جگہ پر قبضہ کرنا اور وہاں اُپنی حکومت قائم کروانا ہے۔ بقول عامر سہیل:

> "نو آبادیاتی نظام اور سامراجیت میں فرق یہ ہے کہ نو آبادیاتی نظام (Colonialism) سے مراد اپنی آبادی چھوڑ کر دوسری آبادی میں مکمل رہائش اختیار کر کے وہاں کی آبادی کا استحصال کرنا، جیسا کہ یورپی اقوام نے امریکہ ،افریقہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں کیا۔ یعنی استعمار کار خود وہاں منتقل ہو جاتا ہے اور پہلے سے موجود لوگوں کا استحصال کرتا ہے انہیں غلام بنا لیتا ہے۔۔۔ سامراجیت (Imperialism) سے مراد اپنے علاقے ،ملک میں رہتے ہوئے دوسرے علاقوں میں موجود آبادی کا استحصال کرنا اپنا علاقہ یا ملک نہ چھوڑنا اور دوسرے علاقے یا ملک کی آبادی پر سیاسی، معاشی اور ثقافتی تسلط قائم کرنا۔" (۱۳)

نو آبادیاتی نظام (Colonialism) اور (Imperialism) میں فرق کرتے ہوئے ناصر عباس نیر کا کہنا ہے کہ:

> "امپائر اپنے پایہ تخت میٹروپولیٹن مرکز کی طاقت اور اختیار کو مسلسل وسعت ضرور دیتی ہے مگر اپنی محکوم آبادیوں سے صرف سیاسی اطاعت کی طالب ہوتی ہے۔ ان کو ثقافتی طور پر مغلوب کرنے کی کوشش عام طور پر نہیں کی جاتی۔ اس کی مثال میں یونانی امپائر، رومی امپائر، مغل امپائر پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان امپائر کے اپنی محکوم آبادیوں پر ثقافتی، لسانی، مذہبی اثرات

ضرور مرتب ہوئے اور ان کے نتیجے میں ایک نئی ثقافت نئی زبان اور مذہبی رواداری کا ایک نیا تصور وجود میں آیا۔ مگر یہ نقل کے اس فطری اصول کے تحت ہوا جو کلچر کے فروغ کا بنیادی اصول ہے اس میں جبر، زبردستی، مسخ کرنے کے وہ تمام عناصر عام طور پر نہیں آتے جو نو آبادیات کا خاصہ ہیں۔"
(۱۴)

نو آبادیات میں استعمار کار مقامی باشندوں کی ملکی معیشت کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ معاشی مفاد کے حصول کے لیے استعمار کار مقامی باشندے کو نشانہ بناتا ہے۔ مقامی باشندے کا علم، ثقافت، سیاست، سماجیت اور معیشت سب پر نو آبادکار کی چھاپ ہوتی ہے۔ اور جب نو آبادکار چلے گئے تو ان کے جانے کے بعد کا دور مابعد نو آبادیاتی دور کہلایا۔ یہ بنیادی طور پر سیاسی، معاشی، ثقافتی اور ادبی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب نو آبادیاتی عہد کے بعد کا دور یا زمانہ۔ ادبی اصطلاح کے طور پر اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک مکمل تھیوری ہے۔ اسی تھیوری کی وجہ سے بعض ناقدین اس کے لیے مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ اس میں نو آبادیاتی عہد کے ادب کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ نو آبادکار اور مقامی باشندے کے ثقافتی رشتے کا مطالعہ اس میں شامل ہوتا تھا۔ مابعد نو آبادیات کو باقاعدہ تھیوری کے طور پر ۱۹۸۰ء میں متعارف کرایا گیا۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

The Politicalor Cultural Condition of a former Colony, for all involved, the racism Poverty and Social injustice that we experienced gave us a new perspective on the reality of a Colonialism, Post Colonialism, and Globalism.(15)

مابعد نو آبادیات کے حوالے سے بہت سے ناقدین نے اپنی آراء پیش کی ہیں۔ عینیہ لومبا کا کہنا ہے:

Post Colonialism has become an equally pervasive term ,especially instudies of the enduring after-effects of colonial rule and oppressive necropolitics of post independence and elities.(۱۶)

مابعد نو آبادیات کی اصطلاح کو سب سے پہلے ایڈورڈ سعید کی کتاب "اورینٹل ازم"(Orientalism) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے ہی عربی میں اس لفظ کے لیے "مابعد الاستعمار" کا لفظ استعمال کیا۔ جسے ہمارے ہاں مابعد نو آبادیات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایڈورڈ سعید سے پہلے اس کا تصور نہ تھا بلکہ ایڈورڈ سعید سے بہت پہلے فرانز فینن، ایمی سیز ائر نے نہ صرف اس تصور کو پیش کیا بلکہ اس کے اثرات کو بھی نمایاں کر کے پیش کیا۔ اس بات سے کسی طور اختلاف ممکن نہیں کہ مابعد نو آبادیات تنقید کا ایسا طرز ہے جو استعمار کار اور استعمارزدہ کے ثقافتی رشتے کا مطالعہ کرتا ہے۔ استعمار کار(Colonizer) اور استعمار زدہ(Colonized) کے ثقافتی رشتے اسی نو آبادیاتی و استعماری نظام کے تحت قائم ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ ایڈورڈ سعید استعمار کار اور استعمار زدہ کے ثقافتی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "Politics is everywhere, There can be no escape in to the Realm of pure art,or for that Martter into the Relam of Disiterested Objectivity of Transcendental thiry. (۱۷)
>
> ترجمہ:(سیاست ہر جگہ ہے۔ خالص آرٹ کے خطے میں بھی اور اس طرح بے مقصد اور بے کار کی خارجیت و مبہم، غیر واضح اور محض خیالی تھیوری میں کوئی پناہ نہیں لے سکتا۔)

مابعد نو آبادیاتی نظام میں استعمار کار(بالادست) کو ہر سطح پر سیاسی، سماجی اور معاشی اجارہ داری حاصل ہوتی ہے۔ وہ سیاسی، معاشرتی اور علمی سطح پر نئی اصطلاحات نافذ کرواتا ہے اور ان کے نفوذ کو یقینی بناتا ہے۔ جس کے رد عمل کے طور پر نو آبادیات میں نئی تہذیبی، علمی، فکری اور ادبی روشیں پیدا ہوتی ہیں غلام ہندوستان کی تاریخ میں نو آبادیاتی عہد ایک پر آشوب اور ہنگامہ خیز دور کا حامل رہا ہے۔ نو آبادکاروں نے ہندوستان میں اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے علم کو طاقت کا ذریعہ بنایا۔ یہ علم بظاہر تو سچائی کے دعوی کا حامل تھا مگر در حقیقت ان کا حقیقی مقصد اپنی سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ تھا۔ مابعد نو آبادیات ان قائم شدہ نو آبادیوں کا ذکر کرتی ہے جس کے ذریعے انسان کو مفتوح بنا کر ان پر حکومت کی گئی۔ مابعد نو آبادیات میں ان باتوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے جن کی بدولت نو آبادیاتی نظام فروغ پایا۔ مابعد نو آبادیاتی نظام جہاں محکوم معاشرے کے

رد عمل کے طور پر حیات کا ثبوت ہے وہیں اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ کس طرح نو آبادیاتی نظام اپنا تسلط قائم رکھے ہوئے ہے اور مسلسل تشکیل نو کے عمل سے گزر کر ہر لمحہ نئی صورت اختیار کر رہا ہے۔

مابعد نو آبادیات کے حوالے سے ہیرن گوہین (Hiren Gohain) کا کہنا ہے:

> "پوسٹ کلونیل ازم انسانیت کو نجات دلانے کے لیے کسی جدوجہد یا کسی آئیڈیالوجی کی تدوین کی بات نہیں کرتی بلکہ سابق کالونیاں بنانے والوں یا کالونیوں میں برتے جانے والے طور طریقوں کے خلاف مقاومت کی لفٹ لبرل دانشوروں کی آواز ہے جو ایسے مغربی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف اٹھی ہے جو کالونیاں بنانے پر یقین رکھتے تھے اور اپنے اس عمل کو حق بجانب سمجھتے تھے۔"(۱۸)

مابعد نو آبادیاتی دور میں سوچ کی تبدیلی منظر عام پر آئی جس سے کلچر بھی تبدیل ہوا اور نہ صرف کلچر بلکہ زبان میں بھی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ آزادی کی جدوجہد کی صورت میں ہجرت کا تصور ابھرا، نظام تعلیم تبدیل ہوا، برطانوی ایجوکیشن سسٹم رائج ہوا جس سے برطانوی کلچر کو فروغ ملا۔ یہی وجہ تھی کی مغرب کی تقلید کرنے والے اپنے آپ کو مہذب شمار کرنے لگے۔ نو آبادیات نے نہ صرف معاشرے پر اپنے اثرات مرتب کیے بلکہ زبان اور ثقافت کی تبدیلی بھی دیکھنے میں آئی۔

نو بادکار آئے، انہوں نے نئی تبدیلیاں اور کالونیاں قائم کیں اور حکومت کا عمل شروع کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مقامیوں کے پاس کوئی علم نہیں، کوئی تہذیب نہیں، کوئی کلچر نہیں۔ ہم ان کو تعلیم دیں گے ان کو مہذب بنائیں گے، انہوں نے عوام کو یہ باور کرایا کہ یہ ہمارا (انگریزوں کا) فرض ہے کہ ہم مقامیوں کی اصلاح کریں کیونکہ وہ White man اپنے اوپر یہ بوجھ محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے Blacks کی تربیت کرنی ہے۔ ان کو تہذیب یافتہ بنانا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مغرب نے تہذیب کا نام دے کر مشرق کا ہر سطح اور ہر طرح سے استحصال شروع کر دیا حالانکہ مشرق کا مغرب کے مقابلے میں الگ وجود ہے، الگ پہچان ہے اور اس کا اپنا جغرافیہ اور ذخیرہ الفاظ ہے جو اس کی شناخت ہے۔ ایڈورڈ سعید کے بقول:

> "ہر وہ جغرافیائی اور تمدنی وجود (تاریخی وجود کی تو بات ہی نہیں) جیسا کہ مقام، خطے، جغرافیائی علاقے جن کو ہم مشرق یا مغرب کہتے ہیں انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے مشرق کی طرح مغرب کا بھی ایک تصور ہے جس

کی اپنی ایک تاریخ، فکری روایات اور مناظر ہیں اور اس کا اپنا ذخیرہ الفاظ ہے۔ جنہوں نے اسے اپنے اور مغرب کے لیے ایک وجودِ حقیقی بنا دیا ہے۔ یہ دونوں جغرافیائی وجود ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں اور کسی حد تک ایک دوسرے کی عکاسی کرتے ہیں۔(۱۹)

یہ بات تو طے ہے کہ جب بھی تنقید اور ادب میں مابعد نو آبادیاتی حوالے سے گفتگو کہ جائے گی تو ادب اور سیاست کے میل جول، مسائل اور محرکات کے حوالے سے بھی باتیں ہوں گی۔ تہذیبوں کے بدلنے کا ذکر اور تاریخ کی تبدیلی کا ذکر لازمی ہو گا۔ کچھ ناقدین کے نزدیک مابعد نو آبادیات کا ذکر سرے سے ہوا ہی نہ ہوتا اگر محوری طاقتوں(Allied Forces) کو یہ خطرہ لاحق نہ ہوتا کہ جنگ کے بعد ان کے پاس کون سے وسائل بچے اور کون سے علاقے ان کے قبضے میں آئے، اور پھر یہ کہ معاشی لحاظ سے وہ کہاں کھڑے ہیں۔ فرانز فینن کا کہنا ہے،

When the immense majority of humanity is living through these problems and these experiences, when the real life, the real future of thousands of millions is modelled on this revolutionary life, when humanity is taking its destiny in its hands in this way it is pure charlatanism to talk of such things as a cybernetic revolution.(20)

نو آبادکار کی زندگی مقامی باشندوں کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ وہ مقامی باشندوں کو یہ باور کراتا ہے کہ وہ علوم و فنون اور فکر میں بہت ہی پسماندہ، پرانے اور روایتی ہیں۔ وہ اس حد تک فرسودہ خیالات کے حامل ہیں کہ موجودہ دور میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، ان کو غیر مہذب ہی گردانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نو آبادکار مقامی آبادی پر اپنے اصول و ضوابط، اپنا علم اپنی تہذیب و ثقافت کو مسلط کرتا ہے اور ان کو احساس محرومی میں مبتلا کرنے کو کوئی بھی حربہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ بقول روش ندیم:

"تمام تحریکیں دنیا بھر کے ادب و فن میں اس وقت ظہور پزیر ہوئیں جب دنیا میں سامراجیت کے غلبے کی جنگوں نے یورپ کے نام نہاد و مہذب فرد ،اس کی تہذیب و شائستگی اس کے اخلاق، رعب و وقار کی دھجیاں اڑا کر رکھ

> دیں۔ یہ وہی انسان تھا جو ہمیشہ نو آبادیاتی نظام میں پسنے والی مظلوم اقوام کے دکھوں، غموں اور غلامی پر خاموش رہا، بلکہ ڈھٹائی سے صدیوں سے مسلط نو آبادیاتی نظام کا ترجمان و نمائندہ بننے میں قومی افتخار محسوس کرتا رہا جب انہی کے آئیڈیل بھیڑیئے منڈیوں پر اپنا حق جمانے کے لیے ایک دوسرے پر پل پڑے تو یورپ کا "حساس انسان" عالمی جنگوں کے دوران اپنی برباد ہو جانے والی تہذیب پر برہم ہوا۔"(۲۱)

نو آبادیات کے چلے جانے کے بعد بھی مابعد نو آبادیاتی دور میں اس کے اثرات اس حد تک قائم ہیں کہ ہم ان سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ ہندوستان میں کمزور اور زیر دست طبقہ اپنے مدِ مقابل کے سامنے کھڑے ہو کر انتشار کی صورت پیدا کر رہا ہے۔ اس طرح پاکستان میں بھی طرح طرح کے جھگڑے جن میں طبقاتی جھگڑے، نسلی جھگڑے، مقامی لوگوں کے مہاجر اور غیر مہاجر ہونے کے جھگڑے، ہر روز کی بدلتی فوجیں، بدلتی اور دم توڑتی حکومتیں، جمہوریت کے نت نئے تجربات سب کے سب مل کر اختراع کی صورتیں پیدا کر رہے ہیں۔ نو آبادکاروں کی سابق کالونیاں بنانے کے بعد برصغیر میں نئی کالونیاں (Colonization) بنانے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

ایسی عالمی صورتحال کے پیش نظر نہ صرف ادبی صورتیں تبدیل ہوئی ہیں بلکہ فکری طور پر بھی سوچ تبدیل ہوئی ہے۔ سابق کالونیوں کے سربراہ اور تیسری دنیا کے ادیب اور دانشور ایک عجیب طرح کی کشمکش اور تناو سے گزر رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا فیصلہ کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے کہ وہ مشرق کا پاس رکھیں یا مغرب کو ساتھ لے کر چلیں۔ ہندوستان کا فکری نظام ایک طرح سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔

> After Demonstrating that Europe is a dying Civilization ,one on the verge of elg detruction (in which the chickens of colonial violence and Tyranny have come to roost while the white working clas looks on in silent complicity) he proposes proletaria revolution as the final solution, yet throughout the book he anticipates Fanon,imploying that there is nothing worth saving

in Europe,that the European working class has too often joined forces with the european bourgeoisie in their support of racism ,imperialism and colonialism and that the uprising of colonized might point the way forward. (۲۲)

نئے عالمی تقاضوں میں نو آبادیات کی بات کی جائے تو امریکہ نو آبادیات کا جدید نظام رائج کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے محکوم ملکوں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر نو آبادیات کا نظام ممکن نہیں۔ جہاں تک برصغیر کے نو آبادیاتی دور کی بات ہے تو اس میں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی ایک دوسرے کے جان کے دشمن ہو گئے۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں یہ سب کے سب اپنے وسائل کو دوسرے مذہب اور دوسرے فرقے کے لوگوں کو ختم کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ نو آبادیاتی دور کی طرح مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی "لڑو اور حکومت کرو" کی پالیسی ابھی تک قائم ہے۔ نو آبادیاتی دور میں آزادی کے لیے لگائے جانے والے نعرے، آزادی کے لیے دیکھے جانے والے خواب، ملکی اور علاقائی ترقی کا دیکھا گیا خواب یہ سب کے سب مابعد نو آبادیاتی دور میں پاش پاش ہو گئے۔ سب کچھ ختم ہو گیا، سب کچھ راکھ میں مل گیا اور سب خواب چکنا چور ہو گئے۔ عامر سہیل کے نزدیک:

"مصلحت کے نام پر منافقت، اقتدار کے نام پر عوام کو غلام بنانا، سہولیات کے نام پر وسائل پر قبضہ جمانا، ملکی معیشت کے نام پر قوم کو دیوالیہ کر کے اپنی جیبیں بھر لینا۔ ٹھوس اور خوبصورت نظریات کو اندر سے کھوکھلا کر دینا، تہذیب و ثقافت، معیشت و معاشرت اور سماج کی کرپشن کو آلودگی سے گدلا کر دینا۔ یہ سب کچھ مابعد نو آبادیاتی دور کا طرہ امتیاز ٹھہرا۔"(۲۳)

مابعد نو آبادیات (Post Colonialism) میں انسانوں کے لیے ایسا نظریہ پیش کیا جو بظاہر تو دیکھنے میں آئیڈیل لگتا ہے مگر اس کے پس پردہ صرف ان حکمرانوں کا ہی مفاد چھپا ہوا ہے جو صنعت، سائنس، ٹیکنالوجی اور طاقت کے زور پر دنیا کے وسائل کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں وہ جو سوچتے ہیں اسی کو درست اور حرف آخر مانتے ہیں۔ اور ایسے تمام ناقدین جو ان کی سوچ کی نفی کرتے ہیں یہ ان کے خلاف ہو جاتے ہیں، ان کا جینا دوبھر کر

دیتے ہیں۔ گزشتہ کچھ عشروں سے گلوبلائزیشن اور عالمگیریت کی جو بات ہو رہی ہے وہ صرف اور صرف سہانا خواب ہے یا اسے دیوانے کا خواب کہا جا سکتا ہے۔

"عالمگیریت۔ ملٹی نیشنلز کا وہ اقتصادی ایجنڈا ہے جس کی I.M.F اور ورلڈ بینک کے ذریعے سے نکیل ڈال کر اقوام عالم کو اقتصادی لحاظ سے محکوم بنایا جاتا ہے۔ ماضی کی مانند قوموں کو سیاسی طور پر محکوم بنانے کا قدیم طریقہ متروک قرار پایا تو: نیا دام لائے پرانے شکاری، اب اصل قوت اسلحہ کی نہیں بلکہ زر کی ہے جس سے وہ اسلحہ خریدا جاتا ہے" (۲۴)

در حقیقت گلوبلائزیشن ایسا نظام ہے جس میں مقامی طبقات ان لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں جو ملکی نظام کے ساتھ ساتھ ملکی معیشت کو بھی کنٹرول کر رہے ہوتے ہیں۔ نو آبادکار کی تشکیل دی گئی دنیا میں مقامی آبادی کے لیے البرٹ میمی کے مطابق دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو وہ اس نظام کو جو آبادکار نے متعارف کرایا اسے اپنا لے یا مکمل طور پر اس سے بغاوت کر لے۔ نو آبادیاتی باشندہ اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے کسی ایک کا انتخاب کرنے کی کوشش کر بھی لے مگر معاشرہ میں رہتے ہوئے اس کے انجذاب اور اس کی روایات سے بغاوت اس کا اپنا فیصلہ نہیں ہوتا۔ نو آبادیاتی صورتحال میں وہ عجیب کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے ان حالات میں ایک تیسری صورتحال بھی ہوتی ہے کہ نو آبادکار کی ثقافت کو جذب کر لیا جائے گا اور اپنی ثقافتی شناخت کو بھی قائم رکھا جائے۔ البرٹ میمی کے مطابق:

The First ambition of the colonized is to become equal to that splendid model and to assemble him to the point of disappearing in him.(۲۵)

(استعمار زدہ کی اولین اولعزمی یہ ہے کہ وہ اس شاندار نمونے کے مطابق خود کو ڈھالے اور اس ضمن میں وہ اس حد تک آگے چلا جاتا ہے کہ خود اپنی نفی کر ڈالتا ہے۔)

نو آبادکار کے انجذاب کی صورت میں نو آبادیاتی باشندہ، اس کی زبان سیکھتا ہے اس کا لباس اختیار کرتا ہے اور جتنا وہ نو آبادکار کی نقل کرتا ہے اتنا ہی وہ اپنی ثقافت سے، اپنی اصل پہچان سے دور ہوتا جاتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ عمل ہے مگر معاشرے کا ساتھ دینے کے لیے یہ سب لازم ہو جاتا ہے، کیونکہ معاشرے میں رہ کر ہی انسان اپنی بقا کر سکتا ہے اور اس کے بغیر انسان کا وجود ممکن نہیں۔ نو آبادکار مقامی باشندے کو بار بار یہ باور

کراتا ہے کہ اس کی ثقافت حقیر اور اس کا علم کم تر ہے۔ وہ غیر مہذب ہے اور اسے علم اور تہذیب کی ضرورت ہے۔ ناصر عباس نیر کے مطابق:

> "انسانی ذات ایک سماجی تشکیل ہے، ہم جو کچھ ہیں اپنے سماج کی پیداوار ہیں۔ اس لحاظ سے کوئی شخص مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتا۔ اس کی فردیت کا مفہوم بھی سماجی ہوتا ہے۔ تاہم ہر شخص کی موضوعیت کی تشکیل کا عمل یکساں نہیں ہوتا۔ ہماری ذات یا سیلف کی تشکیل سماجی معروض (Object) کے ساتھ ہمارے رشتے کی مرہون منت ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ کوئی شے معروض اس وقت بنتی ہے جب وہ ہمیں داخلی سطح پر متاثر کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔" (۲۶)

مابعد نو آبادیاتی دور میں استعمار کار کو کسی بھی ملک میں جا کر اپنی نئی آبادیاں قائم کرنے یا کالونیاں بنانے کی قطعا ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے ملک میں بیٹھ کر ہی گلوبلائزیشن کے ذریعے اس ملک پر حکمرانی کرتا ہے۔ صنعت، تجارت، زراعت، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں نو آبادکار اپنی اصلاحات نافذ کراتا ہے۔ وہ بظاہر تو پس پردہ رہ کر یہ سب کام کرتا ہے مگر اس کے باوجود کمزور طبقہ یہ جان جاتا ہے کہ اس پر حکمرانی کون کر رہا ہے، کون اپنے احکامات ان پر مسلط کر رہا ہے، اور ان پر لاگو ہونے والی پالیسیاں کون مرتب کر رہا ہے۔ نو آبادکار صنعت کو تباہ کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ اور اس ملک کی اکانومی کو اپنے کنٹرول میں لے کر مقامی باشندوں کو مکمل طور پر مغلوب کر لیتا ہے۔ بادشاہت، جبر و استبداد، سامراجیت، گھٹن، ظلم، حکومت اور طاقت کے نشے میں انسانی اور اخلاقی اقدار سے بغاوت کسی بھی سماج اور اس میں پیدا ہونے والے ادب پر براہ راست اپنا اثر ڈالتی ہے۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں مختلف قوموں نے نو آبادیاتی نظام شروع کرنے کی جدوجہد کی، جس کے رد عمل کے طور پر مابعد نو آبادیاتی تنقید پروان چڑھی۔ ایف فینن کا کہنا ہے:

> The colonized person, who in this respect is like the men in underdeveloped countries or the disinherited in all parts of the world, perceives life not as a flowering or a development of an essential productiveness, but as a permanent struggle against

an omnipresent death.This ever-menacing death is experienced as endemis famine,unemployment a high mortality rate,and inferiority complex and the absence of any hope for the future.(۲۷)

نو آبادیاتی صورتحال کے رد عمل کے طور پر مابعد نو آبادیاتی مطالعے سامنے آتے ہیں۔جو ادب نو آبادیاتی دور میں پروان چڑھا اس پر تنقید مابعد نو آبادیات کے دور میں کی جاتی ہے۔ملکی حالات،ذہنی آسودگی اور معاشی بہتری ہر طرح سے ادب کو متاثر کرتی ہے۔پر سکون ماحول میں لکھا جانے والا ادب اور حاکم کے ڈر سے تحریر کی جانے والی ادبیات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔نو آبادیاتی دور میں آزدی اور حقوق کی جنگ کا اثر اس دور کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی حالات زیادہ تو نہیں بدلے مگر قلم کو ایک حد تک آزادی حاصل ہو گئی تھی۔اب ادیب جو محسوس کرتا اسے تحریر کر سکتا تھا۔اس سلسلے میں وہ کسی حاکم کے شر سے نہیں ڈرتا۔یہ الگ بات ہے کہ مابعد نو آبادیاتی صورت حال میں آزادی اور حقوق کی نوعیت عام آدمی کے لیے زیادہ تبدیل نہیں ہوئی۔صرف مہابیانیہ تبدیل ہوا ہے۔سامراجیت کا نظام جوں کا توں ہی رہا۔عوام کی حیثیت تب بھی تماشائی کی سی تھی اور مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی وہ تماشائی ہی رہے۔احتشام علی کے مطابق:

"استعمار کار اور استعمار زدہ کے درمیان مخامصمت اور مفاہمت کی بیشتر صورتیں ان مخصوص مفادات کی نو زائیدہ ہوتی ہیں جن کی خاطر استعمار کار نے مقامی آبادی پر اپنا تسلط قائم کیا ہوتا ہے استعمار کار اپنے مفادات کے مکمل حصول تک ایسے کلامیے اور بیانیے وضع کرتا رہتا ہے جو نو آبادیوں میں اس کے قیام کا منطقی جواز فراہم کرتے ہیں۔یہی بیانیے اور کلامیے بعد ازاں ایک پر اسرار موت کی طرح مقامی آبادی کی روح میں سرایت کر جاتے ہیں۔" (۲۸)

مابعد نو آبادیاتی نظام کی بات کرتے ہوئے مغربی اقوام کا ذکر کیا جائے تو اس بات کی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے قدم جماتے ہی خود کو حکومت بنانے اور قبضہ کرنے کا اہل بنالیا۔یہ ان کی خوبی ہے کہ وہ باہر سے آکر مقامی لوگوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔وہ خطہ زمین جو آج مشرق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کی تاریخ میں اس کے اپنے باسیوں کی حکومت کے نشان نہیں ملتے۔مشرق میں جو بڑی بڑی تہذیبیں گزری ہیں انہوں

نے بھی کسی کے ماتحت رہ کر پرورش پائی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا فاتح ان کی قسمت کا حال لکھتا رہا۔ ناصر عباس نیر کا کہنا ہے:

> "اگر مابعد نو آبادیاتی مطالعہ، نو آبادیاتی عہد کی ثقافتی صورت حال کی مختلف سطحوں کو لحاظ میں نہیں رکھتا، نو آبادیاتی عہد کے ہر تاریخی رجحان اور ثقافتی سرگرمی کو کھینچ تان کے استعماری مفہوم و مقصد سے جوڑتا ہے۔ اس ثقافتی منطقے پر مرکوز نہیں ہوتا جہاں آبادکار طاقت کی مختلف شکلوں سے بگاڑ، استحصال کو مظاہرہ کرتا ہے اور نتیجتاً ردعمل جنم دیتا ہے تو یہ بجائے خود استعماری مطالعے کی ایک شکل ہے۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ، ثقافت اور فکر کو استعمار کی مخفی اور عیاں زنجیروں سے رہائی دلاتا ہے۔"(۲۹)

نو آبادیاتی ثقافتی حالت شاہی فرمان کی مانند ہوتی ہے جس کو ماننا لازم اور نا ماننا موت کے پروانے کو آواز دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ نو آبادیاتی ثقافتی حالت کی مثال اس ادبی متن جیسی ہوتی ہے جس میں قلم تو مصنف کا ہوتا ہے مگر اس کی تحریر معانی سے عاری ہوتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی تنقید دراصل ان ثقافتی اور لسانی کوڈز کو منظر عام پر لانے میں معاون ثابت ہوتی ہے جن کی مدد سے مقامی باشندوں کی ثقافت اور زبان کو استعمال میں لا کر ان پر قبضہ کر کے نو آبادکار اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم کی تعمیر و ترقی میں ثقافت اور زبان بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور اگر کسی بھی ملک کی زبان یا ثقافت کو نو آبادکار اپنے ملک کی زبان یا ثقافت سے کم تر ظاہر کریں تو ایسی صورت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، ذہنی تناو جنم لیتا ہے اور نو آبادیات میں مغلوب ہو کر آبادکار قوموں کا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ممکن نہیں رہتا۔ اور نہ ہی ان کی زبان اور ثقافت اپنا الگ تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ نو آبادیاتی دور میں یہی کچھ کیا گیا اور مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی یہی کچھ دیکھنے میں ملتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی ثقافت کو، ان کی زبان کو افضل مانا جاتا ہے اور اس کو ترقی کا پیش خیمہ سمجھتا جاتا ہے۔ زبان اور ثقافت کا یہ تصور اس دور کی ہی دین ہے جو ابھی مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی کسی نہ کسی صورت اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔

۲۔ مابعد نو آبادیاتی نظام کا پس منظر: مابعد نو آبادیاتی نظام سے قبل نو آبادیاتی نظام اور اس کے پسِ منظر کا مطالعہ مفید معلوم ہوتا ہے اس سے جہاں مابعد نو آبادیاتی پس منظر کی وضاحت ہو گی وہاں نو آبادیاتی

اسرار ورموز کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کے آغاز کی بات کی جائے تو اس کا آغاز ۲۷ مئی ۱۴۹۸ء کو ہوا جب پہلا یورپی پرتگالی جہاز ران واسکوڈ گاما جنوبی ہندوستان کی بندر گاہ پر پہنچا۔ اس وقت ۱۵۱۰ء میں پرتگال کی حکومت نے گوا کی بندر گاہ پر اپنا قبضہ قائم کر لیا جو تقریباً ۱۹۶۵ تک رہا۔ جب کہ بعض مورخین کا کہنا ہے ۱۶۰۲ء اور کچھ مورخین کے مطابق ۱۶۰۵ء میں جب ولندیزی ہندوستان آئے تو انہوں نے ایک کمپنی کا آغاز کیا اس کمپنی کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا۔ یہ تجارتی کمپنی تھی۔ ولندیزیوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی اور پھر آہستہ آہستہ قابض ہوتے گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نو آبادیاتی تمدن مسلط کرنے لگی یہی وجہ ہے کہ نو آبادیاتی نظام (Colonialism) وجود پا گیا۔ اسی نو آبادیاتی نظام کی وجہ سے ہندوستانیوں کو کمپنی کی طرف مزاحمت، مفاہمت، معاونت اور دو جزبیت جیسے رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ کمپنی نے واضح اور سرِ عام لوٹ شروع کر دی جس سے غریب طبقہ مذید غربت کی چکی میں پسنے لگا۔ کالونیل ہی جاگیر دار اور کالونیل ہی سرمایہ دار بن کر منظر عام پر آنے لگے۔ بقول عامر سہیل:

> "استعماری حکمت عملیوں کا جال پھیلایا جانے لگا۔ ظلم، جبر تشدد اور استحصال شروع ہو گیا۔ صنعت دن بدن تباہی کی طرف جانے لگی۔ اب واضح انداز میں ہندوستان "نو آبادیاتی نظام" کے نرغے میں آگیا۔ کمپنی کے افسران نے مقامی علم و ثقافت، زبان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی ثقافت، علم اور زبان سے آشنا ہونا ضروری قرار دیا گیا۔" (۳۰)

کمپنی نے جو نو آبادیاتی نظام متعارف کرایا اس کا مقصد صرف لوٹ مار کر کے وہاں قابض ہونا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس نو آبادیاتی نظام کے پیچھے بہت سے مقاصد کار فرما تھے۔ نو آبادکاروں نے مختلف حکمت عملیاں ترتیب دے کر وہاں قدم مضبوط کیے۔ انہوں نے دولت کا لالچ دے کر وہاں کے فوجی گروہوں کا اعتماد حاصل کیا۔ انہوں نے ایسا نو آبادیاتی کلامیہ پیدا کیا جس سے مشرق مغرب کو خود سے افضل گردانے لگا۔ ان کا ماننا تھا مغرب ہر لحاظ سے ہم سے آگے ہے، اس لیے مغرب کا یہ حق ہے کہ وہ ہم پر حکمرانی کرے۔ اسی بات کا ذکر اسٹوارٹ ہال بھی کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے:

> "مغرب سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جو کہ ترقی یافتہ، صنعتی شہری، سرمایہ دارانہ، سیکولر اور جدید ہو۔۔۔۔ مغرب کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ یہ شہری اور ترقی یافتہ ہے۔ غیر مغربی کے بارے میں ہمارا یہ

> تصور ہوتا ہے کہ یہ غیر صنعتی، دیہاتی، زراعتی اور پس ماندہ ہے۔۔۔ مغرب چونکہ ترقی یافتہ ہے اس لیے اچھا ہے اس جیسا بننے کی خواہش کرنی چاہیے۔ غیر مغربی معاشرے چونکہ پس ماندہ ہیں اس لیے خراب ہیں، اور ان جیسا بننے کی خواہش نہیں ہونی چاہیے۔" (۳۱)

نو آبادکاروں نے نو آبادیاتی ممالک کا علم حاصل کیا۔ ان کی ثقافت، ان کے علم سے رسائی حاصل کر کے وہ مناسب طور پر نو آبادیاتی ممالک پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے ان کا علم حاصل کر کے ان کو ذہنی طور پر غلام بنا لیا۔ ان سے جسمانی مشقت لی گئی مگر اس کا جائز اور مناسب معاوضہ نہ دیا گیا۔ اعلیٰ عہدے نو آبادکاروں کے لیے مخصوص کر دیئے گئے۔ اور مقامی باشندہ معمولی ملازمت کا اہل قرار پاتا۔ ملازمت کے حصول کے لیے ایسی تعلیم کی شرط عائد کی جاتی جس پر مقامی باشندہ پورا ہی نا اترتا تھا، اسی وجہ سے اعلی ملازمت استعمار کاروں کے حصے میں آجاتی اور وہ انگلی کے اشارے پر مقامی باشندوں کو بندروں کی طرح نچاتے تھے۔

نو آبادکار استعمار کار کی ثقافت، ان کے نظریات، ان کی تاریخ و ادب کا مطالعہ کر کے انہیں ہر مقام پر باور کراتا کہ وہ کبھی بھی مغرب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مغرب ہر لحاظ سے ان سے آگے ہے اور مشرق ہر لحاظ سے ان سے کم تر ہے۔

> "نو آبادکار نے نو آبادیاتی نظام مسلط کرنے کے لیے جو حکمت عملی اپنائی وہ "شرق شناسی" کی تھی۔ جس کے مطابق انہوں نے مشرق کے علوم، ان کی ثقافت، ان کی زبانیں اور ان کے ادب کا علم حاصل کیا۔ "نو آبادکاروں نے "شرق شناسی" کے ذریعے مقامی باشندے کو بتایا کہ ان کی اپنی کوئی تاریخ نہیں ہے، ان کا ادب ادبیت سے خالی ہے، ان کی ثقافت مغرب کی ثقافت سے ہزار درجے کم تر ہے، وہ غیر متمدن ہیں، غیر مہذب ہیں، جاہل ہیں، سست اور کاہل ہیں، نتیجتا نو آبادکاروں نے مقامی باشندوں کے ادب کا جائزہ نو آبادیاتی ذہنیت سے لیا، انکی ثقافت کو رد کیا، ان کی تاریخ لکھی کہ وہ ایسی قوم ہیں جن کو آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان کی سرپرستی ضروری ہے۔ لہذا سرپرستی مغرب / انگریزوں کے ذمے ہے۔" (۳۲)

اب نو آبادیاتی نظام تو ختم ہو چکا ہے۔ مگر اس کے اثرات مقامی باشندوں پر ابھی تک قائم ہیں۔ وہ بظاہر تو آزاد ہیں مگر ان کو نام کی آزادی حاصل ہے۔ وہ ذہنی اور ثقافتی طور پر ابھی تک غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ابھی

تک نو آبادیاتی ڈھانچہ اپنے اثرات قائم رکھے ہوئے ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں استعمار کار غریب عوام کا استحصال کرتا تھا مگر اب یہی کام جاگیر دار اور سرمایہ دار اپنے اپنے انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔ آج بھی وہ ممالک جو نو آبادیاتی نظام کا شکار ہوئے تھے غربت اور پستی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ چاہ کر بھی ان نظام سے چھٹکارہ نہیں پا رہے۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات پختہ ہو چکی ہے کہ مغرب ہم سے ہر لحاظ سے بہتر ہے اور ہم کم تر اور ادنیٰ ہیں، ہم جاہل اور اجڈ ہیں، ہماری کوئی تہذیب نہیں، ہماری کوئی ثقافت نہیں، سب کچھ مغرب کا مستعار لیا ہوا ہے۔ اسی سوچ کے باعث مغرب کی نقالی جاری ہے اور اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی ماضی میں نو آبادیاتی رویہ اپنایا۔ انہوں نے بھی فتوحات کیں تو مفتوح قوم کو اپنا غلام بنایا۔ ناصر عباس نیر کا کہنا ہے:

> "کچھ باتیں یورپی اور مسلمان حملہ آوروں میں مشترک ہیں۔ دونوں باہر سے آئے، جس طرح مسلمان ہندوستان کے مختلف علاقوں پر قبضے کے لیے باہم دست و گریباں ہوئے اسی طرح پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز بھی ہوئے۔ انگریزوں نے بالآخر باقیوں پر فتح پائی۔ دونوں نے مقامی حکمرانوں سے جنگیں کیں، قتل و غارت گری کی، شہروں قصبوں کو برباد کیا اور زمانہ امن میں اصلاحات کیں، اسی طرح دونوں نے مقامی لوگوں سے ان کا حق چھینا۔ تاہم کچھ باتوں میں دونوں مختلف بھی تھے۔" (۳۳)

نو آبادکاروں نے مقامی لوگوں کو اس حد تک کچلا کہ وہ سر اٹھا کر جینے کے قابل نہ رہے۔ جب انہوں نے کالونیل حکومتوں کے پیداواری نظام کا حصہ بننے سے انکار کر دیا تو ان کو سست اور کاہل کہا گیا۔ ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق:

> "کالونیل حکومتوں نے مقامی لوگوں کو اس وقت سست اور کاہل کہنا شروع کیا جب انہوں نے ان کے پیداواری نظام کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ مقامی لوگوں کے لیے کام کی خواہش اس وقت ختم ہو گئی جب تمام عہدے کالونیل سے متعلق اشرافیہ کو دے دیے گئے اور ان کے لیے آگے بڑھنے اور ترقی کے امکانات ختم ہو گئے۔ اس صورتحال میں وہ سماجی طور پر پیچھے رہ گئے اور کام سے ان کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ ان کی سستی اور کاہلی کو بطور مزاحمتی ہتھیار کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔" (۳۴)

ہمارے ہاں نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ جسمانی طور پر ہوا ہے ذہنی طور پر آج بھی ہم مفلوج ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں کام کرنا چھوڑ چکی ہیں۔ مغرب کی تقلید میں ہم اپنی کامیابی کا راز ڈھونڈتے ہیں۔ گو کہ کالونیل حکومتیں جا چکی ہیں مگر اپنے اثرات چھوڑ گئی ہیں جن سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ بقول ناصر عباس نیر:

> "نو آبادیاتی باشندوں کی دنیا ان کی اپنی دنیا نہیں ہوتی، انہیں اپنی دنیا پر کوئی تصرف اور اختیار نہیں ہوتا، نہ اس دنیا کے حقیقی، عملی معاملات پر اور نہ اس دنیا کے تصور اور اس کے نظام اقدار پر۔ وہ اپنی ہی دنیا میں اجنبی ہوتے ہیں ۔غضب یہ ہے کہ نو آبادیاتی باشندے کو نو آبادکار جو تصورِ ذات دیتا ہے وہ اسے بالعموم قبول کرتا اور اس کے مطابق جینا شروع کر دیتا ہے اور نو آبادیاتی دنیا میں جو کردار اسے ادا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے وہ اسے عموما تسلیم کرتا ہے۔" (۳۵)

۳۔مابعد نو آبادیات کے ابتدائی مفکرین:

نو آبادیاتی نظام کے خاتمے سے ہی مابعد نو آبادیات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس اصطلاح کا اغاز کس نے کیا اور کس کے سر اس کا سہرا جاتا ہے اس حوالے سے معروف مفکرین کا ذکر مختصرا کیا جاتا ہے۔

1۔فرانز فینن: (۱۹۲۵-۱۹۶۱ء) Frantz Fanon: معروف سیاسی مفکر، ماہر نفسیات، ماہر لسانیات اور انقلابی شخصیت فرانز فینن کو مابعد نو آبادیاتی مطالعات کا ابتدائی مفکر مانا جاتا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے فرانسیسی استعماریت کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے استعمار کار اور استعمار زدہ دونوں کی نفسیات کو جانا پرکھا اور پھر لکھا۔ فینن کی تحریروں سے قبل ادب میں مابعد نو آبادیاتی نظام کے اثرات نظر نہیں آتے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۲۵ء کو کیریبین جزیرے میں پیدا ہوا۔ یہ جزیرہ اس وقت ایک فرانسیسی کالونی کی حیثیت رکھتا تھا۔ فینن کے والد افریقی غلام نسل سے جبکہ والدہ سفید فام نسل سے تعلق رکھتی تھیں، فینن کا تعلق چونکہ ایسے ملک سے تھا جو نو آبادیاتی تھا تو اسی لیے فینن نے فرانس کی طرف سے جرمنی کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لیا، کچھ عرصے بعد وہ کیریبین سے بھاگ کر فرانسیسی فوج میں شامل ہو گیا۔ فینن چونکہ اشتراکی نظریات کا حامی تھا انہی نظریات کی بنا پر ۱۹۴۵ء میں اسے پارلیمنٹ میں نمائندگی دے دی گئی۔

۱۹۵۲ء میں فینن کی پہلی کتاب منظر عام پر آئی جس کا نام Pean Noire,Masques Blancs تھا۔ بعد میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ Black Skin White Mask کے نام سے کیا گیا۔ اس کتاب میں فینن نے ان تمام مظالم کا ذکر کیا ہے جو فرانسیسی استعماریت نے الجیرین اور کریبین باشندوں پر کیے۔ فینن نے اپنی تحریروں میں قومیتوں کی شناخت کے مسئلے پر زور دیا۔ اس نے چونکہ اس دکھ کو محسوس کیا ہوا تھا اسی لیے اس نے اپنی تحریروں میں اس کا ذکر نہایت عمدگی سے کیا۔ فینن کا شمار دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیوں میں Decolonization (آبادیوں کے ٹوٹنے کا عمل) کے عمل کو تقویت دینے والے اہم مفکرین میں ہوتا ہے۔ اس نے مختصر زندگی گزاری مگر اس کی زندگی فرانسیسی استعماریت کے خلاف الجیریا کے لوگوں کے حق آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد میں گزری۔ عامر سہیل کے نزدیک:

> "فینن کے مطابق نو آبادیاتی اقوام میں تشدد کا فروغ اسی تناسب سے ہو گا جس سے وہ خطرہ محسوس کریں گے، فینن نے جو انتہائی اہم بات کی وہ یہ ہے کہ جن طور طریقوں سے استعمار کار مقامی باشندے کی اساطیری تصویر بناتا ہے اور اس کو سراپا برائی کے طور پر پیش کرتا ہے، بالکل اسی طرح مقامی باشندہ اور مقامی دانشور ردِ نو آبادیاتی مفکر کو چاہیے کہ وہ بھی استعمار کار کی اساطیری تصویر بنائے جس میں اس کی "سراپا برائی" ظاہر ہو۔ نتیجتا نو آبادیاتی باشندہ تشدد میں تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"(۳۶)

فینن کی تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اس نے معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کے لیے، سماجی انصاف کے حصول کے لیے جدوجہد کی۔ اس کی کتاب Black Skin White Mask غیر نسلی انسان دوستی پر مبنی رویے کی تشکیل کرتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں نہ تو سفید فام اقوام کی حاکمیت کی بات کرتا ہے اور نہ ہی سیاہ فام کو مظلوم ظاہر کرتا ہے۔ وہ دونوں میں سے کسی کو افضل، کم تر یا برتر ثابت نہیں کرتا۔ اس کی پہلی کتاب میں سیاہ فام کو معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی شناخت کے حصول کے لیے درپیش مسائل کا ذکر ملتا ہے۔

فینن کی تحریروں میں Colonizer اور Colonized کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ Colonizer اپنی ثقافت، علم اور اپنے کلچر کو افضل گردانتا ہے اور اسی وجہ سے وہ Colonized کی ثقافت، علم اور تہذیب کو کم تر جانتا

ہے۔Colonizer کا یہ ماننا ہے کہ ہم افضل ہیں، ہم برتر ہیں، ہم تہذیب یافتہ ہیں اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم Colonized کو مہذب بنائیں ان کی تربیت کریں۔ اس ضمن میں احتشام علی کا کہنا ہے:

> "مقامی افراد میں کولونائزر کے رویے سے ذات کا ایسا تصور جنم لیتا ہے جو کولونائزڈ کے مقاصد کے مطابق ہوتا ہے۔ جبکہ کولونائزر میں احساس برتری جنم لیتا ہے۔ فینن اس خیال کے ذریعے پسِ نو آبادیات کا ایک نفسی تجزیاتی نظریہ پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یورپین کے لیے ذات کا تصور ایک "مقابل" سے تعلق میں تشکیل پاتا ہے۔ نفسیاتی خلا کو پر کرنے کے لیے مقامی شخص مغربی اقدار، مذہب، زبان اور سماجی سرگرمیوں کو اپنا کر اور اپنی ثقافت کو رد کر کے حتی الامکان سفید فاموں جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس رویے یا مظہر کو فینن سیاہ جلد پر سفید نقاب کا نام دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ دہری شخصیت یا شناخت کی صورت میں نکلتا ہے" (۳۷)

مابعد نو آبادیاتی مطالعے کے حوالے سے فینن کی درج ذیل کتب اہمیت کی حامل ہیں۔

1.Black Skin White Mask 1952

2.A Dying of Colonialism 1959

3. The Wretched of the earth 1961

4.Towards the African Revolution.(After death Publication)

فرانز فینن کی تحریر کردہ A Dying of Colonialism کا اردو ترجمہ "سامراج کی موت" کے نام سے کیا گیا۔ مترجم خالد محمود نے ۲۰۱۲ء میں اس کا اردو ترجمہ کیا اور اسی سال اس کا پہلا ایڈیشن منظر عام پر آیا۔ فرانز فینن نے اس کتاب میں فرانسیسیوں کی وہ حکمت عملی بیان کی ہے جس کو اپنا کر انہوں نے الجزائر کے مقامیوں کو ذہنی اور ثقافتی طور پر مغلوب کیا۔ اس کتاب میں فینن نے ان طریقوں کا ذکر بھی کیا ہے جن کو اپنا کر حاکم کی حاکمیت سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے یا ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے اپنے حقوق کی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ فینن نے ان اصولوں کو بیان کیا ہے جن کو اپنا کر الجزائر کے باشندے فرانسیسی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ انقلابی قدم تاریخ میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ فینن نے اس کتاب میں وہ تمام تدابیر اور

طریقے بیان کیے ہیں جن کو اپنا کر بالادست حکمران یا نو آبادکار کے چنگل سے جان چھڑائی جا سکتی ہے۔ عامر سہیل کے نزدیک:

> نو آبادیاتی باشندوں کو ذہن سے وہ تمام تصورات ختم کرنا چاہیے جو آبادکار نے استعماری صورت حال پیدا کرنے کے لیے ابھارے تھے۔ فینن استعمار زدہ کی ذہن سازی کرتا ہے کہ سب کچھ استعمار نہیں، بلکہ ہم، ہماری تہذیب ،ہماری زبان اور ہماری اقدار درست ہیں۔ وہ مقامی باشندے کی "اساطیری تصویر" مسخ کرتا ہے (۳۸)

نو آبادکار سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنا کھویا ہوا مقام کس طرح حاصل کرنا ہے ان سب کا ذکر فرانز فینن اپنی کتاب A Dying of Colonialism میں اس انداز میں بیان کرتا ہے:

> The essence of revolution is not the struggle for bread:it is the struggle of human dignity.Certainly this includes bread and at the base of any revolutionary situation are economic conditions. But beyond a certain point of development on this same basis, it is more important for a people to have guns in hand then to eat more than the year before.This is demonstrated by all revolutions.(۳۹)

مابعد نو آبادیات کے حوالے سے فینن کی دوسری معروف کتاب The Wretched of Earth ہے۔ اس کا اردو ترجمہ محمد پرویز اور سجاد باقر رضوی نے "افتادگان خاک" کے نام سے کیا۔ فینن کا یہ نظریہ کسی ایک قوم یا ملک کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام اقوام جو نو آبادکار کا ظلم و ستم برداشت کر رہی ہیں ان سب پر یہ نظریہ لاگو ہوتا ہے۔ اس کتاب میں فینن نے افریقی نیگرو باشندوں پر فوج کے ظلم و ستم کا ذکر بڑے واضح اور بے باک انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کس طرح فرانسیسی واپس جاتے ہوئے مقامی باشندوں کے خزانوں کو بھی اپنے ساتھ لوٹ مار کے ذریعے لے گئے۔ فینن کا کہنا ہے "دیسی باشندہ وہ مظلوم انسان ہوتا ہے جس کا مستقل خواب یہ ہوتا ہے کہ وہ ظالم بن جائے۔ معاشرتی نظم و ضبط کی تمام

علامتیں۔۔۔۔پولیس، فوجی بیرکوں میں بگل کی آواز، فوجی پریڈ اور لہراتے جھنڈے۔۔۔۔سب بیک وقت گھٹن پیدا کرنے والے محرک ثابت ہوتے ہیں۔"(۴۰)فینن کا کہنا ہے Decolonization یا استعماریت کے بعد معاشرہ پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے اگر اسے تجربہ کار اور مخلص لیڈر میسر ہوں۔ادیبوں کا ذکر کرتے ہوئے فینن نو آبادیاتی عہد میں لکھے جانے والے ادب کے حوالے سے ان ادیبوں کی تحریر کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔پہلے دور میں نو آباکاروں کے ادب سے متاثر ہو کر مقامی ادیب ان جیسا لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔دوسرے دور میں ادیب اپنی ذات کے گمشدہ حصوں کی تلاش اور ثقافتی پہچان کے حوالے سے تحریریں رقمبند کرتا ہے۔تیسرے دور میں فینن کے نزدیک ادیبوں نے حقیقی معنوں میں انقلاب اور بیداری کے حوالے سے ادب لکھا تاکہ عوام متحد ہو کر کھویا ہوا مقام و مرتبہ حاصل کر سکیں۔فرانز فینن نے صحیح معنوں میں استعماریت کے خلاف آواز بلند کی اور لوگوں کو ایسی تدابیر سے آگاہ کیا جن کو اپنا کر وہ اپنا کھویا ہوا مقام اور ثقافتی تشخص پھر سے برقرار رکھ سکیں۔ایڈورڈ سعید اپنی تحریر کردہ Culture and Imperialism میں فینن کے بارے میں لکھتا ہے:

> He was the first major theorist of anti imperialism to realise thay orthodox nationalism followed the same track hewn out by imperialism,which while it appeared to conce authority to the nationalist bourgeoisie was really extended its hegemony.(۴۱)

اپنی تحریروں اور نظریات میں فینن استعمار کار اور مقامی باشندے کے درمیان نفسیاتی رشتے کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔استعمار کار اور مقامی باشندے کی زندگیوں میں جو تضاد ہوتا ہے وہ کس طرح ذہنی اور نفسیاتی طور پر لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔فینن نے اپنی تحریروں سے نفسیاتی بیمار لوگوں کی اصلاح بھی کی اور ان کی تربیت کے طریقے بھی درج کیے ہیں۔اس کی کتابوں میں جہاں ہمیں استعمار کار کے ظلم، جبر، دہشت، خوف، وحشت اور بربریت و ناانصافی کا ذکر ملتا ہے وہیں اپنی تحریروں سے وہ ان سب مظالم سے نمٹنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں ۔مقامی باشندے کو ثابت قدم رہنے اور اپنی ہمتوں کو پھر سے یکجا کر کے انقلابی بننے کا عزم بھی فینن کی تحریروں سے ہی ملتا ہے۔

مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کا جب بھی ذکر کیا جائے گا فینن کی تحریروں کو، اس کے نظریات کو ، اولین بانیوں میں شمار کیا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی تحریروں میں الجیریائی عوام کی آزادی اور سامراج کے خلاف افریقہ کی یکجائی کا خواب ملتا ہے۔ اس کی تحریروں میں ذات کی شناخت کا ذکر، ثقافتی پہچان کا ذکر واضح انداز میں نظر آتا ہے۔ الغرض فینن نو آبادیاتی صورت حال کو اس کے معروضی سیاق میں دیکھتے ہوئے رد استعماری کلامیوں کو بھی پیش کرتا ہے۔ فرانز فینن کی تحریریں اردو میں مابعد نو آبادیاتی مطالعے اور فکر و فن کو جاننے میں اہم کردار ادا کریں گی۔

2۔ایڈورڈ سعید(۱۹۳۵- ۲۰۰۳ء) Edward Saeed: ایڈورڈ سعید کا شمار بیسویں صدی کے اہم مفکرین، ادبی نقاد، ماہر تعلیم، دانشور اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے ادب موسیقی، کلچر، مذیب، میڈیا، سیاست، ثقافت اور لسانیات پر کتابیں تحریر کیں۔ آپ کا تعلق یروشلم کے عیسائی گھرانے سے تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک کے شعبہ انگریزی سے منسلک ہوگئے اور تقابلی ادب پڑھانے لگے۔ ۱۹۹۱ء میں کینسر جیسے مرض میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں وفات پائی۔ اپنی وفات تک آپ ہاورڈ، ایسٹن فورڑ، پرسٹن اور جان ہایکنس جیسی یونیورسٹیوں میں مہمان پروفیسر کے طور پر منسلک رہے۔ آپ کو مابعد نو آبادیاتی مطالعے کے حوالے سے کافی شہرت حاصل ہے۔ آپ کی معروف کتب جو آپ کی وجہ شہرت بنی ذیل میں درج ہیں۔

1.Orientalism 1978

2.Covering Islam 1981

3.The world, the text and the critic1984

4. Culture and Imperialism 1993

5.Nationalism,Colonialism and literature

آپ کی تقریبا چوبیس سے زائد کتب ہیں جن میں مابعد نو آبادیاتی مطالعے کے حوالے سے " شرق شناسی" زیادہ اہم ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مقتدرہ قومی زبان زبان سے شائع ہوا۔ مترجم محمد عباس نے اس کا ترجمہ کیا۔ اپنی اس کتاب میں آپ نے مشرق اور مغرب کا ذکر بڑے بلیغ انداز میں کیا ہے۔ آپ کا کہنا ہے:

"شرق شناسی کے مطالعے میں جس قسم کے سوالات سر اٹھاتے ہیں وہ یہ ہیں
کہ شرق شناسی کی روایت میں شرق شناسی کے وجود کے علاوہ کس قسم کی

> علمی، جمالیاتی، عالمانہ اور تمدنی قوت بروئے کار لائی گئی؟ لسانیات لغت نویسی، تاریخ، حیوانات، سیاسی اور معاشرتی نظریات، ناول نویسی وغیرہ کی مدد سے کس طرح شرق شناسی نے دنیا کے بارے میں بادشاہت کا تصور پیدا کیا اور اس کو مروج کر دیا؟ شرق شناسی میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں؟ اس میں کس طریقے سے مواد کی جمع آوری ہوئی اور اس کو کیسے صاف شفاف بنایا گیا۔ شرق شناسی کے کام میں کب اور کیسے انقلابی نوعیت کے اقدامات کیے گئے۔" (۴۲)

شرق شناسی میں سعید نے مشرق اور مغرب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں کے الگ الگ نظریات، الگ تاریخ، جغرافیہ اور فکری روایات ہیں۔ مغرب کی طرح مشرق کا الگ وجود پہچان اور شناخت ہے۔ شرق شناسی ایک سیاسی نظریہ ہے جو مشرق پر لاگو کیا گیا ہے۔ مشرق چونکہ مغرب کی نسبت کمزور ہے اور مغرب نے اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مشرق کا استحصال شروع کیا۔ مشرق کی اپنی لسانی پہچان اور ذخیرہ الفاظ ہے مغرب کے لیے جو اپنے وجودِ حقیقی کو ثابت کرتا ہے۔ مشرق کو مغرب ہمیشہ خاص نظر سے دیکھتا ہے، اسے کم فہم اور ناخواندہ سمجھتا ہے۔ مشرق کے تہذیب و ثقافت، رسم و رواج وغیرہ کو بھی مغرب میں کم تر درجہ حاصل ہے۔ غرض ان کے نزدیک مغرب ہر لحاظ سے افضل اور مشرق کم تر ہے۔

> Now at last we approach the long developing core of essential knowledge, knowledge both academic and practical, which cromer and Balfour inherited from a centuary of modern Western orientalism. Knowledge about and knowledge of orientals, their race, character, culture, history, traditions, society and possibilities.This knowing was effective; croer believed he had put it to use in government Egypt.(۴۳)

سعید کی اس کتاب کا بنیادی تھیسس یہ ہے کہ مغربی مفکرین نے مشرق کا علم حاصل کرنے کے بعد مشرق کی جو تصویر کشی کی وہ سراسر ان کے اپنے مفاد پر مبنی تھی۔ عامر سہیل کے نزدیک:

"مغربی مفکرین نے مشرق کا علم حاصل کرنے کے بعد جو مفروضے قائم کیے یعنی مشرق، مغرب سے پسماندہ ہے، مشرقی تہذیب و ثقافت کی کوئی حیثیت نہیں، مشرق کی اپنی تاریخ نہیں ہے، مشرقی ادب مغرب کی ایک شیلف سے کم تر ہے، مشرقی انسان سست، کاہل، جاہل، پسماندہ، وحشی، جنگلی اور جانور کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشرقی آدمی اس قابل نہیں کہ وہ خود پر حکومت کر سکے۔لہذا اس پر حکومت کرنے اور اسے کنٹرول کرنے، مہذب بنانے، متمدن بنانے اور تمیز سکھانے کا کام مغربی آدمی کے سپرد ہے"
(۴۴)

ایڈورڈ سعید کی کتاب Imperialism and Culture جس کا اردو ترجمہ "ثقافت اور سامراج" کے نام سے مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہوا۔اس میں بھی نو آبادیاتی نظام کے اثرات کا ذکر کیا گیا۔مقامی باشندہ سامراجیت کے زیر اثر ثقافت کو معمولی اور کم تر سمجھنے پر مجبور ہوا۔ان سب کا ذکر ان کی اس کتاب میں کیا گیا ہے۔انگریزوں کا ماننا ہے کہ اہل مشرق کے لیے خود مختاری کی خواہش تب تک کی جائے گی جب تک وہ خود ہماری نظر میں جائز ہو۔کیونکہ ہم نے انہیں بولنا، سوچنا اور سمجھنا سکھایا۔اور اہل مغرب ہی یہ اختیار رکھتے ہیں کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ کون اچھا مقامی ہے اور کون برا۔کیونکہ مقامی باشندے ہماری تسلیم کی حقیقت کے تحت ہی خاطر خواہ وجود رکھتے ہیں۔

ایڈورڈ سعید اس کتاب میں نو آبادیات کا ذکر کرتے ہوئے ثقافت کی مسخ شدہ صورتحال کا ذمہ دار نو آبادکار کو ٹھہراتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ نو آبادکار جب بھی کسی ملک پر حکومت کرتا ہے، نئی آبادیاں یا کالونیاں بناتا ہے تو وہاں پر طاقت کے بل بوتے پر اپنی ثقافت رائج کراتا ہے۔بعض اوقات صرف کالونیاں قائم کی جاتی ہیں ۔ثقافت کے حوالے سے مقامی باشندے کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی ذہنی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ مقامی باشندہ نو آبادکار کی ثقافت کو اپنی ثقافت سے افضل سمجھتا ہے اور اس کو اپنانے میں ہی فخر محسوس کرتا ہے۔ناصر عباس نیر کے نزدیک:

"نو آبادیات وہ منھ زور طوفان تھا جس نے مقامی سماجی و ثقافتی حیات کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا نو آبادیات کو منھ زور طوفان سے تشبیہ دینے میں بھی حقیقت پسندی ہو سکتی ہے، مگر اپنی سماجی و ثقافتی حیات کے جڑ سے اکھڑ جانے کو قبول کر لینے کا مطلب تو اسے کھوکھلا، دیمک زدہ تسلیم کر لینا ہے جسے اگر

طوفان نے پٹخ دیا تو قانون فطرت کے تحت ایسا کیا۔ جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔ اکثر مابعد نو آبادیاتی مطالعات سیاسی اور سماجی اجارے کو ایک ہی سکے کے دو رخ گردانتے ہیں اور نو آبادیات کو ایک ایسی عظیم الشان طلسماتی طاقت خیال کرتے ہیں جو تمام سماجی ہیتوں کی قلب ماہیت کر ڈالتی ہے۔"(۴۵)

ایڈورڈ سعید بھی بعض اوقات نو آبادیات کو ایک طلسمی طاقت خیال کرتے ہیں جو اپنا اثر تمام جگہوں پر چھوڑتی جاتی ہے۔ وہ شرق شناسی کو کلامیہ کے ساتھ چار شکلوں کا معاملہ قرار دیتا ہے۔ جن میں سیاسی طاقت، دانش وارانہ طاقت، ثقافتی طاقت اور اخلاقی طاقت شامل ہے۔ گویا جب کسی ملک کی یہ چار طاقتیں کسی نو آبادکار کے ہاتھ میں چلی جاتی ہیں تو ایک طرح سے ملکی باگ دوڑ اس کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

ایڈورڈ سعید اپنی اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کسی بھی نو آبادکار کے پاس مکمل اجارہ داری ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی ملک کی ثقافتی شناخت کو مکمل مٹا ڈالنے پر قادر ہوتا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں "ہم" اور 'وہ" کے الفاظ کا استعمال کر کے ان کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے ناصر عباس نیر کا کہنا ہے:

" "ہم" کا کوئی بھی نمائندہ جب بھی "وہ" کا تصور کرتا ہے تو دونوں میں اس امتیاز کو کسی مرحلے پر فراموش نہیں کرتا جو شرق شناسی کی روایت میں بس ایک مرتبہ طے ہو گیا تھا۔ چناچہ "وہ" اور اس کے علم و ثقافت کا ہر رخ ہمیشہ غیر عقلی، پس ماندہ، اخلاقی و بلند اقدار سے تہی اور طفل نما ہوتا ہے۔ اور "ہم" اس کے مقابلے میں عقلیت پسند، ترقی یافتہ، روشن خیال اور بالغ نظر ہوتا ہے۔" (۴۶)

نو آبادکار کو اپنی ثقافت کو متعارف کروانے اور مقامی باشندے کی ثقافت کو مسخ کرنے کے لیے مقامیوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔ یہ مقامی بھی تین طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلا گروہ ان مقامیوں کا ہے جو آبادکار کی اس ثقافت اور علم کو سیکھتے ہیں جو وہ مقامیوں کے لیے لے کر آتے ہیں اور جو حقیقت میں ان کی اصلی ثقافت اور اصل علم نہیں ہوتا بلکہ وہ نو آبادکار تو اپنی ثقافت کے اعلی نمونے ان کے سامنے پیش ہی نہیں کرتا اور مقامی اسے ہی اعلی ثقافت سمجھ کر قبول کر بیٹھتا ہے۔ دوسرا گروہ ان مقامیوں کا ہے جو نو آبادکار کے ملک جا کر ان کے حقیقی علم اور ثقافت کو سیکھتے ہیں اور انہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اس لیے انہیں پہلے گروہ پر فوقیت حاصل ہوتی ہے جبکہ

تیسرا گروہ ان مقامیوں کا ہوتا ہے جو نہ تو زبان اور ثقافت سیکھتے ہیں اور نہ ان کے ملک جاتے ہیں مگر ہر موقع پر ان کی ثقافت، رسم ورواج اور تعلیم کی مکمل حمایت کرتے نظر آتے ہیں یہ لوگ جلد ہی سامنے آجاتے ہیں اور ان کی حقیقت جلد ہی آشکار ہو جاتی ہے۔ یہ تینوں گروہ کسی نہ کسی طرح نو آبادکار کے معاون اور ترجمان ہوتے ہیں۔ ان میں بعض کو تو نو آبادیاتی صورتحال کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے اور بعض حالات کو دیکھتے ہوئے خود ہی وجود پالیتے ہیں۔ ان کی شناخت، ثقافت اور علم نو آبادکار کے مرہون منت ہوتا ہے۔ یہ باقی مقامیوں سے خود کو افضل گردانتے ہیں اور ان کو کم تر جانتے ہیں۔ موجودہ دور میں نو آبادیات کا وجود قائم ہے یا اس کا خاتمہ ہو چکا ہے اس حوالے سے ایڈورڈ سعید کہتے ہیں:

> "ہمارے دور میں بلاواسطہ نو آبادیات تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ سامراجیت جس جگہ موجود تھی اب بھی وہیں جاری ہے اور سیاسی، آئیڈیالوجیکل، اقتصادی اور سماجی دساتیر کے ساتھ ساتھ عمومی ثقافتی حلقے میں بھی موجود ہے۔" (۴۷)

ایڈورڈ سعید کا کہنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل جس طرح برطانیہ اور فرانس نے یورپ کو طاقت بخشی اور اس کے ساتھ ہی مشرق کا غلط تصور قائم کیا اسی طرح اب دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ بھی مشرق کے حوالے سے اپنا تصور قائم کر رہا ہے۔ اپنی اس کتاب میں سعید نے استعمار کار اور استعمار زدہ کی تحریروں کا مطالعہ کر کے مابعد نو آبادیاتی تنقید کو بنیاد بنا کر پیش کیا ہے۔ عامر سہیل ادب میں نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> " آج برصغیر پاک وہند کا شعر و ادب تاریخ، ثقافت، سماجی سیاسی صورتحال نو آبادیاتی اور پس نو آبادیاتی منظر نامے کی اس تقسیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے اردو دنیا میں اس حوالے سے تحقیق کے نئے رجحانات ابھرتے ہوئے جدید شعور کا حصہ بن رہے ہیں۔"(۴۸)

3۔ ہومی کے بھابھا(Homi K Bhabha(1949: نظریاتی و عملی سطح پر مابعد نو آبادیاتی تنقید کو پیش کرنے والے نامور مفکر ہومی کے بھابھا ہیں۔ آپ نے 1949ء میں بمبئی کے ایک پارسی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ تھیوری آف آئیڈیاز اور لٹریچر، پوسٹ کلونیل ازم اور پوسٹ اسٹرکچرل ازم کے حوالے سے اہم نام انہی کا ہے۔ آپ امریکی زبان وادب اور انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر رہے۔ مابعد نو

آبادیات کے حوالے سے آپ کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ آپ کی نو آبادیات کے حوالے سے اہم کتاب The location of Culture ہے۔ جس میں ہومی کے بھابھا نے مابعد نو آبادیاتی اصطلاحات بیان کی ہیں ۔ادب میں ثقافتی مطالعے کا ذکر کیا جائے تو اس کتاب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ آپ نے اپنی تحریر کردہ کتاب میں استعمار کار اور استعمار زدہ کے ثقافتی رشتے کا تجزیہ کیا ہے اور پھر جن جن نفسیاتی معاملات سے آپ کو آگاہی حاصل ہوئی ان کے لیے باقاعدہ اصطلاحات وضع کر کے نام کمایا۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> Although the 'unhmoely' is a paradigmatic colonial and post- colonial condition, it has a resonance that can be heard distincly, if erratically, in fictions that negotiate the powers of cultural difference in a range of transhistorical sites.(۴۹)

ہومی کے بھابھا نے مابعد نو آبادیاتی اصطلاحات بھی وضع کیں جن میں سب سے پہلے Hybridity(ثقافتی ادغام) شامل ہے۔

Hybridity (ثقافتی ادغام) :اصولی طور پر بائیولوجی کی اصطلاح ہے مگر ثقافتی مطالعے کے حوالے سے اس اصطلاح کو مابعد نو آبادیاتی مطالعے میں بھی اہمیت حاصل ہے۔ اس اصطلاح کا ذکر بھابھا کی کتاب The Location of Culture میں ملتا ہے۔ ان کے نزدیک استعمار کار یا بالا دست جب بھی کسی جگہ اپنی نو آبادی قائم کرتا ہے تو اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ وہاں اپنا کلچر بھی مسلط کرے تاکہ مقامی باشندے کا اپنا کلچر اور اس کی اپنی شناخت ختم ہو جائے بعض اوقات استعمار کار اپنا کلچر زبردستی مسلط کرواتا ہے اور بعض صورتوں میں استعمار کار کے کلچر کو مقامی باشندہ خود خوشی خوشی قبول کرتا ہے۔ کیونکہ مقامی باشندہ اس کلچر اور ثقافت کو اپنے کلچر اور ثقافت سے اعلیٰ سمجھتا ہے۔ اسے برتر مانتا ہے۔ بعض اوقات وہ کچھ چیزیں اپنے کلچر کی اور کچھ استعمار کار کے کلچر کی اپناتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ دوغلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ نہ ادھر کا رہتا ہے اور نہ ہی ادھر کا۔ اس کی اپنی ثقافتی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ عامر سہیل کے نزدیک:

> "مقامی باشندہ کچھ اپنا اور کچھ استعماری کلچر کو اپنا کر دوغلیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ نہ تو مکمل طور پر اپنا کلچر اپناتا ہے اور نہ ہی استعماری کلچر اپناتا ہے اس صورتحال میں اس کی ثقافتی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔" (۵۰)

Ambivilance (ثقافتی تذبذب): مابعد نو آبادیاتی مطالعے میں ثقافتی تذبذب کی اصطلاح بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اس اصطلاح کا ترجمہ فرخ ندیم نے دو گونیت اور ڈاکٹر کمال اشرف نے "ابہام" لکھا ہے۔نو آبادیاتی نظام میں مقامی آبادی کو استعمار کار کی جو ثقافتی اقدار اچھی لگتی تھیں انہیں اپنا لیتے اور جو اچھی نہیں لگتی تھیں انہیں ترک کر دیتے تھے۔ان کا یہ رویہ اصطلاح میں " ثقافتی تذبذب " کہلاتا ہے۔

> In this in- between space, the present is marked with discontinuity and ever- shifting domain. Bhabha,s idea of in-between space is the hybird interaction between different cultures and histories that makes bothy negotiation and revision of culture possible. Thus ,the in-between space becomes the space of productivity and Bhabha calls it "Third Space." (۵۱)

استعمار کار کی ثقافت، علم، تہذیب و کلچر کے بارے میں مقامی باشندہ محبت یا نفرت جیسے جذبات رکھتا ہے۔محبت یا نفرت کا یہی جذبہ نفسیاتی کشمکش کہلاتا ہے۔جس میں انسان مکمل طور پر فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ تبدیلی کو قبول کرے یا نہ کرے۔نو آبادیاتی نظام میں ایک ہی چیز اچھی بھی لگتی ہے اور اس سے نفرت کا سا احساس بھی پیدا ہوتا ہے ایسے رویے کو ہومی کے بھابھانے Love hate Relationship کا نام دیا ہے۔اپنی کتاب The Location of Culture ہومی کے بھابھا لکھتے ہیں۔

> Private and Public, post and Present, the psyche and social develop an interstial intimacy.It is intimacy that question binary division through which such sphere of social experience are often spatially opposed.The sphere of life and linked through an 'in- between' temporality that takes the

measure of dwelling at home, while producing an image of the world of history. (۵۲)

Mimicry (نقل): نو آبادیاتی عہد میں مقامی باشندہ استعمار کار کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ استعمار کار کی ثقافت کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے، حقیقت میں وہ اس کی نقل کرتا ہے، اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ وہ بھی استعمار کار کے برابر ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا اور مقامی باشندہ اپنی ثقافت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں استعمار کار ہمیشہ مقامی باشندے سے مناسب فاصلہ رکھتا ہے تاکہ دونوں میں واضح فرق رہ سکے۔ نقل کی صورت میں مقامی باشندہ ثقافت، لباس، تہذیب، رہن سہن، زبان اور اقدار سب کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے مگر ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ بھابھا کا کہنا ہے کہ مقامی باشندہ ایک طرف تو انگریزوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور دوسری طرف انہی کی چیزوں کو کاپی کرنے کی کوشش کرتے ہیں

"مقامی باشندہ، استعماری حکمران کو رشک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ رشک کی نظر مقامی باشندے کو استعمار کی نقل تک لے جاتی ہے۔" (۵۳)

4۔ گائیتری چکرورتی اسپی وک Gayatri Chakravort Spivak

مابعد نو آبادیاتی تنقید میں گائیتری کا مقام نمایاں ہے۔ آپ کی پہچان ادبی نقاد، تانیثی نقاد، مارکسزم اور نو آبادیاتی نقاد کی ہے۔ آپ 24 فروری 1942ء کو انڈیا میں پیدا ہوئیں۔ گائیتری نے بھی ادب میں اصطلاحات متعارف کروائیں۔ اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے جب یونیورسٹی آف لووا (Lowa) سے ملازمت کا آغاز کیا تو آپ نے دریدا (ردِ تشکیلی نقاد) کی کتاب OF Grammatology کا ترجمہ کیا۔ گائیتری کے اس ترجمے کی وجہ سے ہی امریکہ میں پہلی بار ردِ تشکیلی / پس ساختیاتی تھیوری کا آغاز ہوا۔ ادب میں گائیتری کی خدمات قابل تعریف ہیں انہوں نے درج ذیل کتابیں لکھیں۔

1.Essay in Cultural Politic (1987)
2. The Post Colonial Critic (1990)
3.Thinking Academic Freedom in gendered Post Coloniality (1992)
4. Out side in the Teaching Machine (1993)
5. Acritique of Post colonial reason (1999)
6. Death of a Discipline (2003)
7.Other asias (2005)

8. And readings (2014)

مابعد نو آبادیاتی تنقیدی مطالعے کے حوالے سے گائیتری کی اہم کتاب The Post Colonial Critic (1990) ہے دوسری اہم کتاب A critique of Post colonial reason . (1999) ان کتب سے گائیتری کی اہمیت مابعد نو آبادیاتی نقاد کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔مابعد نو آبادیاتی نقاد کی حیثیت سے ان کا ایک مضمون Can the Subaltern Speak کافی معروف ہوا۔اس میں گائیتری نے Subaltern کو موضوع بحث بنایا۔سارا مضمون اسی کے گرد گھومتا ہے۔گائیتری Subaltern سے مراد نچلہ طبقہ لیتی ہے یا وہ عوام جو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند نہ کر سکتی ہو،جو زبان تو رکھتی ہے مگر اس کو بولنے کی اجازت نہیں جو بولنا تو چاہتی ہے مگر اس کی آواز دبا دی جاتی ہے۔اب اس سے مراد مزدور، مظلوم،زیر دست طبقے کے علاوہ وہ عورت بھی ہے جس کو مرد کی برابری نہیں دی جاتی۔اسے مرد سے ہر جگہ پر کم درجے پر رکھا جاتا ہے اسے اپنے کے لیے حق کے لیے آواز بلند کرنے نہیں دی جاتی۔اپنے مضمون میں وہ کہتی ہے:

> Can the Subaltern speak?What must the elite do to watch out for the continiuing construction of the Subaltern? The question of 'woman' seems most problematic in this context.Clearly if , you are poor, blacj and female you get it in three ways.If ,however,this formulation is moved from the first world context into the postcolonial context, the description 'black'or color loses persuasive, significance. (۵۴)

گائیتری چکرورتی نے Marginalization کا بھی نظریہ پیش کیا،جس کے مطابق ذاتوں میں اونچ نیچ کا فرق، گورے کالے کا فرق،امیری غریبی کا فرق،مرد اور عورت کے فرق کے ساتھ ساتھ عورت کا عورت سے فرق کا تصور بھی پیش کیا،یعنی کمزور ہر جگہ پستا ہی رہتا ہے۔طاقتور اور با اختیار اپنی حیثیت ،رتبے اور عہدے کے لحاظ سے اس کو ہمیشہ دباتا ہی رہتا ہے۔

گائیتری کا کہنا ہے کہ اگر مغربی دانشور بھی نچلے طبقے کے لیے آواز بلند نہیں کرے گا تو کیسے ان کے لیے بہتری کی امید پیدا ہو گی۔ کیونکہ وہ خود تو اس قابل نہیں کہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کر سکیں تو اس لیے مغربی دانشور اور صاحب اختیار لوگوں کو میدان میں آنا چاہیے وہ ان کے لیے آواز بلند کر سکیں۔

۴۔ ادب اور مابعد نو آبادیات مختصر جائزہ:

ادب اور مابعد نو آبادیاتی نظام کی بحث میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مشرق کا ہر طرح اور ہر لحاظ سے استحصال ہوتا رہا ہے۔ اسے کم تر، نیچ اور گھٹیا ثابت کیا جاتا رہا حتیٰ کہ ان کو جاہل اور گنوار گردانا گیا۔ اگر مابعد نو آبادیاتی نظام میں مشرق کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا گیا تھا تو مابعد نو آبادیاتی نظام میں مشرق کے ادب کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا ہو گا؟ مشرق کی تعلیم کا مسئلہ جب نو آبادیاتی آقاؤں کے زیر غور آیا تو انہوں نے اس بات کو لازم قرار دیا کہ انگریزی ذریعہ تعلیم کی زبان ہو اور مشرق کے رہنے والے چونکہ جاہل اور وحشی ہیں اس لیے ان کو مہذب بنانے کا اس سے اچھا اور بہتر طریقہ کوئی نہیں ہے۔ نو آبادیاتی آقاؤں کے اس بیان پر لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا جس میں کہا گیا کہ کمپنی کو اپنا تعلیمی بجٹ صرف اور صرف انگریزی تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے اور کمپنی کو روایتی اور مقامی کی مالی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے۔ اس بات میں کسی قسم کے شک کی گنجایش ہی نہیں کہ انگریزی نظام تعلیم ایک نئی ہندوستانی اشرافیہ پیدا کرنے کی غرض سے رائج کیا گیا، جو باہر سے ہندوستانی مگر اندر سے انگریز ہو۔ نئی ہندوستانی اشرافیہ کی دوغلی شخصیت ہی نو آبادیاتی ضرورت تھی۔ اسی طرح کا رویہ نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی دور میں ادب کے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔ ناصر عباس نیر کے مطابق:

> "مابعد نو آبادیاتی ڈسکورس میں انگریزی صرف "مرکز کی زبان نہیں" بلکہ مرکزی زبان بھی ہے۔ اس منطق کی رو سے پس نو آبادیاتی متن قائم ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ نو آبادیات کی مرکزی زبان میں لکھا گیا ہو۔" (۵۵)

مابعد نو آبادیاتی دور میں ادب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ادب کے ہر پہلو پر نو آبادیات کا اثر غالب ہے۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو افسانوی یا غیر افسانوی دونوں میں ادیب نے مابعد نو آبادیاتی نظام کا ذکر کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا ہے۔ نظم، نثر، افسانہ، ناولٹ، ناول، کہانی حتیٰ کہ داستان تک اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ شاعری میں شعراء نے موجودہ صورتحال کا ذکر، بے چینی کا ذکر، معاشرتی ناہمواریوں اور

طبقاتی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے اس کو نو آبادیاتی نظام سے جوڑا ہے۔نو آبادکاروں کے آنے سے معاشرے میں جہاں تبدیلی رونما ہوئی وہاں ثقافت، کلچر اور تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آئی۔بظاہر تو نو آبادکار چلے گئے مگر اس کے اثرات آج بھی ہمارے ذہنوں پر، ہمارے ادب پر اور ہمارے سماج پر پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ہم آزاد مملکت میں رہتے ہوئے غیروں کی سوچ اور غیروں کی منصوبہ بندی کے تحت زندگی گزار رہے ہیں انہوں نے ہمارے ذہنوں کو اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ ہمیں برائی میں بھی کوئی برا پن نظر نہیں آتا۔"عہدِ حاضر میں نو آبادیات کے خلاف انگریزی زبان میں لکھ کر اس کے خاتمے کا ذکر کیا جاتا ہے اس کا مطلب ڈی کولونائزیشن لیا جا رہا ہے۔حالانکہ ادیب یہی کام مرکزی زبان کو استعمال کیے بغیر اپنی قومی زبان میں بھی کر سکتے ہیں تاکہ اس سے ثقافت کو فروغ ملے اور صحیح معنوں میں لگے کہ ہم نو آبادکاروں کی زبان کو اپنانے کی نفی کرتے ہیں۔" (۵۶) مابعد نو آبادیات کا ذکر ادب کے تناظر میں کرتے ہوئے یہ بات ہم پر واضح ہوتی ہے کہ علم اور طاقت کا اپنا ایک رشتہ ہے اور یہ رشتہ فطری یا منطقی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ثقافت سے ہے۔جب بھی طاقت علم پر غالب آتی ہے تو وہ وہاں اپنی ثقافت اور اپنی اقدار کا پرچار کرتی ہے۔مقامی آبادی کی ثقافت کو مسخ کرتے ہوئے اپنی پہچان اور اپنی ثقافت کو طاقت کے زور پر نہ صرف متعارف کرایا جاتا ہے بلکہ اس کو وہاں لاگو بھی کروایا جاتا ہے۔اسی حوالے سے ناصر عباس نیر کا کہنا ہے کہ:

> "گویا وسیع معنوں میں یہ ثقافت ہی ہے جو علم کو طاقت میں بدلتی یا علم سے طاقت حاصل کرتی یا علم کو اجارے کا ذریعہ بناتی ہے۔اگر علم خود طاقت ہوتا یا علم حاصل کر لینے کا مطلب اقتدار و اجارہ حاصل کر لینا ہوتا تو یکساں سائنسی و سماجی علم رکھنے والے یکساں طور پر طاقت ور ہوتے اور یکساں طور پر عالمی معاملات میں طاقت کو یکساں انداز میں بروئے کار لاتے۔" (۵۷)

حوالہ جات:

1.A Dictionary of Politics: Walter Laqueurm Weiedenfeld and Nicolosm, London, pg,105,106

۲۔ فرہنگِ اصطلاحات:ج: اول(اے تاڈی) اردو سائنس بورڈ لاہور ۱۹۸۴ء

3.The New International Webster,s Comprehensive Dictionary of the English Language ,2006 (Encyclopedia Edition) vol.1, Naples, Trident Reference Publishing.

4.Oxford Advanced Learners Dictionary,2004 (7th Edition) London, Oxford University Press.

۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی ہندوستان، سانجھ پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء ص۔ ۱۰۵۔

۶۔ نیر ناصر عباس، ڈاکٹر، نو آبادیاتی صورتحال، مشمولہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاءالحسن، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، کلیہ علوم شرقیہ پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۲۴،۲۳

۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی ہندوستان، ایضاً ص۔ ۱۰۔۱۱

۸۔ عامر سہیل، محمد، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، (نظریہ، تاریخ، اطلاق) عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء ص۔ ۱۵

۹۔ عینیہ لومبا، کلانیل ازم: پوسٹ کلونیل ازم، روٹلیج، لندن ۱۹۹۸ء ص۔ ۱

10.Jmal Malik Encyclopedia of Islam and the Muslim Worlsd,Richard C. Martin Editor, Macmillan Reference, New York, Vol.1, Pg: 152,153

11.K.K.Aziz, The British in India, A Study in Imperialism, Lahore, Sang e Meal Publication, 2007, Pg.05

۱۲۔ ہمفرے، ہمفرے کے اعترافات، اکبر بک سیلرز، اردو بازار لاہور س۔ن، ص۔ ۷، ۸

۱۳۔ عامر سہیل، محمد، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، ایضاً ص۔ ۱۷

۱۴۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی، ۲۰۱۳ء، ص: ۷

15۔Oxford English Dictionary

16.AniaLoomba,Colonialism/Postcolonialism,Routledge London,1998,Pg:22

17.Edward Saeed,The world, The Text and the Critic,Vintage Books New York 1983,Pg:224

۱۸۔سید محمد عقیل،ڈاکٹر،پوسٹ کلونیل ازم:تنقید کی دنیا میں ایک نئی ہوا،مشمولہ، نو آبادیات و مابعد نو آبادیات،مرتبہ،ڈاکٹر عامر سہیل،عکس پبلی کیشنز،لاہور۲۰۱۹ء،ص: ۹۴

۱۹۔ایڈورڈڈبلیو سعید،شرق شناسی،مترجم،محمد عباس،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۲۰۱۲ءص:۰۵

20.Frantz Fanon,A dying Colonialism,Grove Press,Newyork,1959,P17,17

۲۱۔روش ندیم،صلاح الدین درویش،جدید ادبی تحریکوں کا زوال،گندھارا بکس،راولپنڈی،۲۰۰۲ءص:۶۵،۶۴

22.Aine Cesaire,Discourse on Colonialism, monthly Review Press New York, 1965,Pg:24

۲۳۔عامر سہیل،نو آبادیات ومابعد نو آبادیات،ایضاًص:۱۳۴

۲۴۔سلیم اختر،ڈاکٹر،عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات،مشمولہ،خیابان شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی،شمارہ،خزاں ،۲۰۰۶ءص:۰۱

25.Albert Memmi,The Colonizer and the Colonized,Plunkett Lake Press,2013,Pg: 184

۲۶۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،نو آبادیاتی صورتحال،مشمولہ،نو آبادیات ومابعد نو آبادیات،عامر سہیل،ص:۱۱۶

27.Frants Fanon,Adying Colonialism,Grove Press Newyork 1965,Pg:12

۲۸۔احتشام علی،فرانز فینن:مابعد نو آبادیاتی فکر کا بنیاد گزار (افتادگان خاک:خصوصی مطالعہ) مشمولہ بازیافت،شعبہ اردو،اورئینٹل کالج،پنجاب یونیورسٹی لاہور،جولائی تا دسمبر۲۰۱۷ء،ص:۲۰۵

۲۹۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،مابعد نو آبادیات:اردو کے تناظر میں،آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی،۲۰۱۳ء،ص:۲

۳۰۔عامر سہیل،محمد،نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، ایضاً ص۔۲۱

۳۱۔ اسٹورٹ ہال،مغرب اور بقیہ دنیا،مشمولہ،جدید تاریخ،مبارک علی، ڈاکٹر، فکشن ہاوس، لاہور،۲۰۰۵ءص:۲۱۹،۲۱۸

۳۲۔عامر سہیل،محمد،نو آبادیات ومابعد نو آبادیات ایضاً ص۔۲۹

۳۳۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر،اردو ادب کی تشکیل جدید،نو آبادیاتی و پس نو آبادیاتی عہد کے اردو ادب کے مطالعات،آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس،کراچی،۲۰۱۶ءص۔۰۳

۳۴۔عامر سہیل، محمد، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات ایضاً ص ۵۱

۳۵۔عامر سہیل، محمد، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات ایضاً ص۔۱۱۱

۳۶۔عامر سہیل، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، ایضاً ص:۵۳

۳۷۔ احتشام علی، فرانز فینن:مابعد نو آبادیاتی فکر کا بنیاد گزار (افتادگان خاک:خصوصی مطالعہ) مشمولہ بازیافت، شعبہ اردو، اورئینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء، ص:۲۰۸

۳۸۔عامر سہیل، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، ایضاً ص:۵۳۴

39.Frantz Fanon,A Dying Colonialism,Grove Press Newyork,1965,Pg:12

۴۰۔فرانز فینن، افتادگانِ خاک، (مترجم محمد پرویز، سجاد باقر رضوی) نگارشات لاہور، ۱۹۶۹ء ص:۵۰

41.Edward Saeed,Culture and Imperialism,Vintage London,1994,Pg:328

۴۲۔ایڈورڈ ڈبلیو سعید، شرق شناسی، (مترجم، محمد عباس) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء ص:۱۸، ۱۷

43.Edward Saeed,Orientalism,Routledge and Kegan paul,London 1978 Pg:46

۴۴۔عامر سہیل، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، ایضاً ص:۵۳۷

۴۵۔ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، مابعد نو آبادیات:اردو کے تناظر میں، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی، ۲۰۱۳ء، ص:۱۹

۴۶۔ ایضاً ص:۲۱

۴۷۔ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، (مترجم یاسر جواد) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء ص:۲۲

۴۸۔عامر سہیل، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، ایضاً ص:۲۰۳

49.Homi K Bhabha,The Location of Culture,Routledge Classic 2004,Pg:13

۵۰۔عامر سہیل، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، ایضاً ص:۵۴۳

51.Dr.Hitendra B.Dhote,Sanjeev Khobaragade,Homi K Bhabha,s thoughts of Post Colonialism and its impact on Indian Literature and Writers,Including Pune Research,Interanational Journal in English July,August 2017,Pg:05

52.Homi K Bhabha,The Location of Culture,Pg:19

۵۳۔عامر سہیل، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، ایضاً ص:۵۴۳

54.Eleanor Ross,Can The Subaltern Speak?Innervate The Uniersity of Nottingham,School of English Studies,Volume 2, 2009,10,Pg:13

۵۵۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،اردو ادب کی تشکیل جدید، ایضاً ص:۹

۵۶۔ایضا۔ص:۱۰

۵۷۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،مابعد نو آبادیات:اردو کے تناظر میں، ایضاً ص:۳۲

باب دوم:

معاصر ترقی پسند شعراء کا فکری ڈھانچہ

(الف) ادب برائے زندگی کا تصور:

عربی زبان کے لفظ "ادب" کے بہت سے معانی و مفاہیم ہیں۔ ادب کے لغوی معانی قربانی کے ہیں۔ عربی زبان میں لکھنے اور بولنے کا بہترین طریقہ بھی ادب کہلاتا ہے۔ معاشرے کے تغیر کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس کے معانی میں وقت کے ساتھ ساتھ وسعت پیدا ہوتی گئی۔ ظہورِ اسلام کے وقت ادب کو تعلیم قرار دیا گیا۔ تعلیم و تربیت کے حامل افراد کو ادب کے زمرے میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس وقت اہل عجم (گونگے) نے بھی عربوں کی تقلید کی اور علوم کو ادب کی مد میں سیکھنا شروع کیا۔ موجودہ دور میں اردوئے ادب کے حوالے سے اگر ادب کی بات کی جائے تو اس سے مراد وہ مواد ہے جس کا تعلق انسانی دلچسپی سے ہو۔ لیکن دلچسپی کے ساتھ ساتھ اس میں ایک خاص ہیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہو جو اس کی دلکشی اور فرحت کا باعث بنے۔ ادب کسی قانون اور قاعدے کا پابند نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ کسی آمر بادشاہ کے ماتحت رہتا ہے اس کا اپنا ایک حرکیاتی نظام ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ تغیر و تبدل رونما ہوتا رہتا ہے۔ ادب کو پرکھنے اور جانچنے کا واحد میزان یا معیار اس کی ادبیت ہے۔ کوئی بھی شہ پارہ اپنی ادبیت کی بنا پر اپنا معیار برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل کر پاتا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں ادیب ہی ادب کی تشکیل کرتا ہے۔ ادیب حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے وہ معاشرے کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کی خوبی، خامی، اچھائی، برائی، کمی اور کوتاہی کو صفحہ قرطاس پر اتارتا ہے۔ یہی صفحہ معاشرے کے لیے آئینہ کا کام کرتا ہے۔ جس میں معاشرہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ ادیب کے اندر ادراک کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور اظہار کی قوت بھی۔ اس کے اظہار و ادراک میں ایسی داخلی اور خارجی وسعت ہوتی ہے کہ ادب انفرادی اور ذاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہوتا ہے۔ ادیب جتنا بڑا ہو گا اس کا شعور و ادراک اور اس کے اظہار کا انداز بھی اتنا ہی آفاقی اور دیرپا ہو گا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ادب کے حوالے سے کہتے ہیں:

"ادب شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے خیالات کا نام ہے۔جو
زندگی کی چھیڑ سے جاگتے ہیں،زندگی کی آنچ میں تپتے ہیں،اور زندگی کی سانچ
میں ڈھل کر خود زندگی بن جاتے ہیں "۔(۱)

ادب کے لغوی معانی کسی چیز کا حد نگاہ میں رکھنا۔ جبکہ اصطلاح میں اس سے مراد زبان کا علم ہے جیسے کہ صرف و نحو، علم بیان، علم عروض، صنائع بدائع، شاعری، افسانوی ادب (داستان ،ڈرامہ،ناول،افسانہ)نثری تحریریں وغیرہ۔ موجودہ دور میں ادب کی شناخت دو چیزوں سے کی جاتی ہے ایک قدر اور دوسرا سماج۔ادب کے ضمن میں جب سماج کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ادب کا مقصد لیا جاتا ہے۔یعنی ادب کس مقصد کے لیے تخلیق کیا جارہا ہے؟ معاشرہ یا سماج پر اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ اور کیا یہ ادب معاشرے کو مثالی بنانے میں معاون ہو گا؟ بہت سے ادیب اس بات سے متفق ہیں کہ "کامیاب ترین ادب وہ ہے جو ماحول کا آئینہ بھی ہو مستقبل کا اشاریہ بھی"۔ جبکہ دوسری طرف ادیبوں کی بڑی تعداد اس بات کی قائل ہے کہ ادب سماج کا آئینہ نہیں ہوتا ان کے نزدیک ادب کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ قاری کسی بھی تحریر یا فن پارے کو پڑھنے کے بعد اس سے حِظ اٹھائے اور سرخوشی حاصل کرے۔اسی حوالے سے اطہر پرویز کا کہنا ہے کہ:

"ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں روز مرہ کے خیالات سے بہتر خیالات
اور روز مرہ کی زبان سے بہتر زبان کا اظہار ہوتا ہے۔ادب انسانی تجربات کا
نچوڑ پیش کرتا ہے۔انسان دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے،جو تجربے حاصل کرتا
ہے ،جو سوچتا سمجھتا ہے،اس کے رد عمل کا اظہار ادب کی شکل میں کرتا
ہے۔" (۲)

انسانیت کی تعمیر و ترقی اور پاکیزہ معاشرے کی تشکیل میں ادب اپنا کردار ادا کرتا ہے۔اس بات سے انکار کسی صورت نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کے دل و دماغ پر ادب کی گہری چھاپ ہے۔اور کسی بھی کلام کو ہم ادبی کلام اس وقت کہتے ہیں جب اس کے معانی و مطالب ایسے الفاظ کا جامہ پہن کر سامنے آئیں جن سے قلب و نظر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں،اور ایسا ادب جس سے معاشرے میں نفاق،فساد اور شر پیدا ہو وہ معاشرے کے لیے سمِ قاتل ہے۔ادب صرف واقعات اور حقائق کو پیش کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ادب کہلانے کے لیے اظہار بیان کا تنوع بھی لازم ہے۔ادب میں الفاظ کا چناو اور اس کی بندش اس طرح سے کی جاتی ہے کہ پڑھنے اور سننے والے میں مسرت کا احساس پیدا ہو۔اگر یہ کہا جائے کہ ادب صرف کتابوں میں ہی ملتا ہے تو یہ بات بھی سراسر غلط

ہے۔زبانی ادب کو تاریخ میں کافی اہمیت حاصل رہی ہے اور اگر عربی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے ہاں لکھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔قدیم عرب میں بہت سے ایسے شاعر رہے ہیں جو بڑی بڑی نظمیں مجمعوں میں سنایا کرتے تھے انہیں لکھا نہیں جاتا تھا۔ادب کو انسانی اظہار کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔لیکن ہر وہ چیز جو لکھی ہوئی صورت میں ہم تک پہنچے اس کو ہم ادب کا نام نہیں دے سکتے۔ہر وہ تحریر جو معلوماتی ہو خواہ اس کا تعلق سائنس سے ہو یا صحافت سے،اس وقت تک ادب کے زمرے میں نہیں آتی جب تک وہ فن لطیف کی حد کو نہ چھو لیں۔کسی بھی ادب کا معیار جانچنے کے لیے وہاں کے معاشرے اور اس دور کے حالات کا جائزہ لینا لازم ہے۔کیونکہ مخصوص حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر ہی ادیب نے اس ادب کو تخلیق کیا ہوتا ہے ممکن ہے کہ وہ ادب اس دور کے بعد میں آنے والوں کے لیے اس حد تک تسکین یا خوشی کا ذریعہ نہ بنے جو لکھتے وقت ادیب نے اپنے قارئین کے لیے پیدا کی تھی اور جس سے اس دور کے قارئین متاثر ہوئے تھے۔جمیل جالبی اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "ادب زندگی کے دھارے پر بہتے ہوئے سچائیوں کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔گویا ادب زندگی کا اور اس زندگی کی سچائیوں کا اظہار کرتا ہے جن کا ادیب اور شاعر کی حیثیت سے آپ نے تجربہ اور مشاہدہ کیا ہو۔" (۳)

لکھنے والے ہر دور میں معاشرے کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ادب تخلیق کرتے رہے ہیں۔وہ ادب خواہ نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی صورت میں،دونوں کے معاملے میں ہمیں شروع سے ہی دو طرح کے نظریات ملتے ہیں "ادب برائے ادب "اور "ادب برائے زندگی"۔ادب برائے ادب یہ ہے کہ لکھنے والا اپنے دل کی تسکین کے لیے لکھے۔اس کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی ہو اسے صفحہ قرطاس پر اتارے۔اسے ادبی شکل دے کر دنیا والوں کے سامنے پیش کرنا ہی "ادب برائے ادب" کا اصل مقصد تھا۔ہر دور میں لکھنے والوں نے لکھنے کے لیے یہی طرز اختیار کیا۔ہر ادیب نے اپنے فن کو اپنی تسکین کے لیے استعمال کیا۔اس بات سے اسے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس کا لکھا ہوا کسی کی سمجھ میں آرہا ہے یا نہیں۔اس کا مقصد صرف علمیت کا اظہار کرنا تھا تاکہ جو بھی اس کی تحریر کی ہوئی عبارت کو پڑھے اس سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہے۔

آغاز میں جب لکھنا آسان نہ تھا اور لکھنے کے لیے مختلف طرح کی سہولتیں میسر نہ تھیں اس دور میں لکھنے کی جگہ سماعت سے کام لیا جاتا تھا۔مجمع لگتا،اہل علم جمع ہوتے اور لوگ انہیں سنتے تھے۔یہ دور ادب سے زیادہ علم کا دور تھا۔اس دور کے اہل علم اپنی بات خاص علمی انداز میں دوسروں تک پہنچاتے تھے۔اس بات کی پراہ کیے بغیر کہ

اگلے کو بات سمجھ میں آئی ہے یا نہیں۔ علمیت کی بنیاد پر سراہے جانے کی خواہش اس دور کے اہل علم میں موجود تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ جو کچھ بھی کہا جاتا یا تحریر شدہ حالت میں عام قاری تک پہنچتا وہ اس کی سمجھ سے بالا تر ہوتا اور کم ہی لوگ اسے سمجھ پاتے۔ فرمان فتح پوری کا کہنا ہے :

> "ادب کی معنویت کسی فنکار یا ادیب کی شخصی اور اس کے عہد کی اجتماعی اقدار حیات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اقدار کی اسی نمائندگی یا ترجمانی کے سبب کہا جاتا ہے کہ ادب محض زندگی کی نقالی نہیں ہے بلکہ عین زندگی ہے یا ایسی زندگی جس پر موت حرام ہے۔" (۴)

آہستہ آہستہ حالات نے رخ بدلا۔ شعراء اور ادباء نے محسوس کیا کہ ان کو ایسی تحریریں لکھنی چاہیے جو عوام کی سمجھ میں آسکیں اور ہر کوئی اس کو پڑھ اور سمجھ سکنے کے قابل ہو۔ اسی لیے سہل لکھنے کا آغاز ہوا تاکہ کہی گئی بات عوام کی سمجھ میں آسکے۔ پندرھویں صدی میں یورپ نے ایسا لکھنے کا آغاز کیا تاکہ لکھا ہوا سمجھ میں آسکے اور اس سے اچھی طرح فائدہ حاصل کیا جاسکے۔ اہل یورپ نے اس حوالے سے شعوری کوشش کو اپنایا، انقلابی نوعیت کی سوچ اپنائی اور عوام کو ذہن نشین رکھتے ہوئے لکھنے کی ابتدا کی تاکہ عوام بھی استفادہ کر سکے۔ عوام کی خاطر سادہ اور سہل لکھنے کے آغاز نے ہی "ادب برائے زندگی" کے رویے کو پروان چڑھایا جسے لوگوں نے شعوری طور پر اپنایا۔

یورپ کے بعد امریکہ میں عوام کے لیے لکھنے کی تحریک کا آغاز کیا گیا۔ یعنی یہ طے پایا گیا کہ ایسا لکھا جائے جس کے نتیجے میں لوگ سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے پر مجبور ہو جائیں، اپنی اصلاح کا خیال دل میں لائیں اور اپنی زندگیوں میں کچھ نیا کرنے کا سوچیں۔ اس کا آغاز مذہب سے ہوا۔ مذہب کا سہارا لیتے ہوئے یورپ میں " نیو تھاٹ "کی تحریک شروع ہوئی۔ جس میں مذہبی تعلیمات کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے خیالات، نظریات اور خود کو بدلنے کی طرف توجہ دی۔ "نیو تھاٹ" تحریک کے تحت جو ادب بھی لکھا گیا وہ خالصتاً اصلاح نفس کے نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے تحریر کیا گیا۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کی آمد سے علم و ادب میں بھی انقلاب برپا ہوا ۔ محض اپنا علم و بدبہ قائم رکھنے کے لیے لکھنے کا دور ختم ہوا اور ایسے اہل علم سامنے آئے جن کے لکھنے کا مقصد معیار زندگی کو بلند کرنا تھا۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ تحریروں کو پڑھتے ہوئے اپنی اصلاح کے لیے کوشاں ہوں اپنی زندگی اور معیار زندگی بلند کریں۔ یہ سب کچھ " ادب برائے ادب" کے تحت لکھی جانے والی

خالص تحریروں کی بدولت ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ دقیق ہوتیں اور عام قاری کی سمجھ سے بالا ہوتیں تھیں۔ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری کا کہنا ہے:

" ادب ،زندگی، سماج اور معاشرے کا ایک حساس ترجمان ہے جو اس کے مدوجزر طوفانوں کو احساسات ،جذبات اور حسیت کے ساتھ دلوں سے دلوں تک پہنچاتا ہے۔اسی لیے کہ ادب بھی براہ راست ہماری اقتصادی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے اعمال و افعال۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر یا ادیب جو کچھ تخلیق کرتا ہے اس میں اس کی داخلی کیفیت اور اندرونی کسک، خلش اور کشمکش کا بڑا دخل ہوتا ہے۔لیکن یہ داخلی کیفیت درحقیقت تمام خارجی اسباب وحالات کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں وہ رہتا اور بستا ہے۔" (۵)

ادب برائے زندگی کی تحریک کو پروان چڑھانے اور اس کی نشوونما میں مغربی معاشرے کے بدلتے رجحانات نے اہم کردار ادا کیا۔"حالات کے تحت یہ لازم ہو گیا تھا کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو عوام کی ضروریات اور سمجھ کے مطابق ہو۔اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے شاعر اور ادیب نے عوامی ضروریات کے تحت ادب ترتیب دینا شروع کیا۔یہیں سے ادب برائے زندگی کا دور شروع ہوا۔جس میں ادب کے ذریعے انسانی مسائل کو منظر عام پر لایا گیا، گو اس کام کے لیے شاعر اور ادیب کو اپنی ذہنی سطح سے کافی نیچے آنا پڑا اور عوام کے لیے لکھنے سے علمی سطح بہت حد تک جاتی رہی۔"(۶) ادب برائے زندگی کی بدولت معاشرے کے مسائل کو منظر عام پر لا کر ان کے حل کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔ادب انسان کے قلب و نظر کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔حساس ادیب معاشرے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کا اثر قبول کرتے ہوئے انہیں ادبی صورت میں سب کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔سفیر اختر کے مطابق:

"انسانیت کی تعمیر اور ایک پاکیزہ معاشرے کی تشکیل میں ادب جو اہم اور نمایاں حصہ ادا کرتا ہے ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا انسان کے دل و دماغ پر ادب کی قوت تاثیر ایک مسلم حقیقت ہے۔دراصل کسی کلام کو ادبی کلام کہتے ہی اس وقت ہیں جب اس کے معانی و مطالب ایسے الفاظ کا جامہ پہن کر

سامنے آئیں جن سے قلب و ذہن متاثر اور متحرک ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ
تاثیر اور قوت متحرکہ ادب کا حسن بھی ہے اور اس کا عیب بھی۔" (۷)

"ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بحث آج کے دور کی نہیں ہے۔ اس بحث کا آغاز ۱۹۱۷ء میں ہوا جب روس میں بالشویک (سوشلسٹ) انقلاب نے ایشیا کے ممالک کی سیاسی تحریکوں پر اپنا اثر مرتب کیا تو وہیں دوسری طرف نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی ادب کو کسی نہ کسی مقصد کے تحت استعمال کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ اسی طرح "ادب برائے مقصد" کے نظریے کو فروغ حاصل ہوا۔ برصغیر کے ادبی حلقے بھی "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کے اس نظریے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے اسی نظریے کے تحت اردو ئے ادب کی اب تک کی سب سے فعال اور موثر تحریک کا آغاز ہوا جسے ترقی پسند تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک نے برصغیر کی ہر زبان خواہ وہ چھوٹی ہو یا اس کا تعلق بڑے خاندان سے ہو اس پر اپنے اثرات مرتب کیے، اور "ادب برائے زندگی" کے نظریے کو فروغ دیا۔ ادب برائے زندگی میں ادب کو کسی خاص نصب العین کے تحت استعمال کیا جاتا ہے "ادب برائے زندگی" میں ادب کا رخ اندر سے باہر کی طرف یا داخل سے خارج کی طرف ہوتا ہے۔ جبکہ "ادب برائے ادب" میں ادب کا رخ باہر سے اندر کی طرف یا خارج سے داخل کی طرف ہوتا ہے۔ ادب برائے ادب کی بہترین مثال حلقہ ارباب ذوق کے تحت لکھا جانے والا ادب ہے۔ ایسا ادب جس کو پڑھ کر تسکین ملے اور لطف حاصل کیا جائے وہ بھی اسی ادب کے زمرے میں آتا ہے۔ جبکہ ادب برائے زندگی سے مراد ایسا ادب جو زندگی کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر کسی نصب العین کا حامل ہو۔ آسان لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادب برائے ادب کا مقصد محض شوق کی خاطر لکھنا جبکہ ادب برائے زندگی کا مقصد زندگی کی مشکلات، دکھ، تکلیفوں اور مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے معاشرے میں تبدیلی لانا ہے۔ ادب چونکہ معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے اور اسی لیے ادب اور زندگی دونوں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر کمال اشرف کے نزدیک:

> "ادب برائے زندگی میں ادب کو پروان چڑھانے کی بات کی جاتی ہے جو کہ زندگی کے حوالے سے امید، مقصد اور افادیت کا حامل ہو، ادب کو زندگی کا حسن سنوارنے اور نکھارنے کے لیے ذریعہ بنایا جائے۔ ادب زندگی کے حوالے سے ہماری معلومات میں اضافہ کرے اور بہتر زندگی گزارنے کا لائحہ عمل پیش کرے۔ سرسید تحریک کے زیر اثر ادیبوں نے ادب میں مقصدیت

کی بات کی اور ترقی پسند تحریک نے اردو ادب میں ادب برائے زندگی کا
نظریہ پیش کیا۔" (۸)

اردو ادب کی ابتداء میں ادب کو محض تسکین یا حِظ اٹھانے کا ذریعہ مانا جاتا تھا۔ اس دور میں ادبا اور شعراء چونکہ دربار سے وابستہ تھے اس لیے بادشاہوں اور امراء کی خوشنودی کے لیے وہی ادب تخلیق کیا جاتا تھا جس سے حاکم وقت کی رضا حاصل ہو۔ اسی سے ادب برائے ادب کا نظریہ پروان چڑھا۔ جذبات اور احساسات کی تسکین کے لیے ادب کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اردو ادب میں حلقہ اربابِ ذوق کے روحِ رواں میراجی بھی ادب برائے ادب کے نظریے کے قائل تھے اور اسی کی حمایت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب برائے ادب کے حامی ادیب کبھی بھی ادب میں کسی نوعیت کی افادیت کے قائل نہ تھے۔

اردو ادب میں ادب برائے زندگی کا نظریہ بھی اپنی جگہ اہم اور موثر ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والے حالات واقعات ہمارے ادبا کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ حساس طبع کے حامل یہ ادیب زندگی کے انہی حالات و واقعات سے ادب کشید کرتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ ادب زندگی سے ہی جنم لیتا ہے ۔ زندگی کی داخلی اور خارجی نوعیت کی تبدیلیاں ادب پر اثر انداز ہوتیں ہیں۔ ڈاکٹر محسنہ نقوی کا کہنا ہے:

"ادب محض معاشرتی زندگی کا جامد عکس پیش نہیں کرتا، بلکہ زندگی کی نا
ہمواریوں شخصی اور اجتماعی دکھوں کا عکس بھی ادب میں ملتا ہے۔ ادب میں نہ
صرف معاشرتی اور تعلیمی عوامل کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ زندگی کے تمام
تقاضوں کا اظہار، احتجاج، طنز، شکایت، دعا، خوشی اور غم کی تمام کیفیات ادب
میں جگہ پاتی ہیں۔ ادب اور زندگی آپس میں باہم مربوط ہیں، ایک کے بغیر
دوسرے کا تصور ممکن نہیں۔" (۹)

انسان معاشرتی حیوان ہے دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی گزارنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ اسے دوسروں کے سہارے کی قدم قدم پر ضرورت ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے میں رہنے والے دوسرے افراد سے میل جول قائم رکھتا ہے۔ ان سے تعلق واسطہ قائم رکھتے ہوئے ان سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی جذبات و احساسات ادب میں داخل ہوتے ہیں۔ یہی احساسات اس وقت ادبی تخلیقات کہلاتی ہیں جب ان میں زندگی کی اقدار کو شامل کیا جاتا ہے۔ زندگی کی دائمی قدروں فنی اور جمالیاتی اقدار کو اس میں شامل کر

کے ہی احساسات ادبی تخلیقات کا روپ دھارتے ہیں۔ انسانی زندگی غموں سے عبارت ہے۔ زندگی میں خوشی اور غم کا آنا اور ایک مقررہ مدت کے بعد چلے جانا ایک فطری امر ہے۔ یہی خوشی اور غم کے جذبات جب ادب میں شامل ہوتے ہیں تو اسے ادب برائے زندگی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ زندگی کا ترجمان چونکہ ادب کو گردانا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر ہر پہلو کو بیان کرنے اور بے نقاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسانی زندگی میں رونما ہونے والے اچھے، برے، تلخ اور ناقابل فراموش واقعات کو جذبات و احساسات کے سہارے ادب میں شامل کیا جاتا ہے۔ ادب انسانی زندگی، سماج اور معاشرے کی تمام تلخ اور مسحور کن کیفیات کو دل تک پہنچاتا ہے۔ ادب ہمارے دوسرے معاملات کی طرح زندگی کے معاشی و اقتصادی اور ادبی و سماجی پہلوؤں سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ ہماری زندگیاں اور معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ادب پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے کہ:

> "ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا اور ادب ترک یا تپسیا کی پیداوار نہیں ہے ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہیت ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے۔ جس طرح کہ کوئی دوسرا فرد اور ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات و سکنات۔" (۱۰)

اس میں کسی قسم کے شبے کی گنجایش نہیں ہے کہ ادیب جو کچھ بھی تحریر کرتا ہے وہ اس کے ارد گرد کے حالات و واقعات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے دل کی حالت کا بیان اور بعض اوقات اس کی اپنی داخلی کیفیات جو اس کے خارجی ماحول اور حالات سے پیدا ہوتی ہیں اس کی تحریروں میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے الفاظ کی بنت ہی اس کے جذبات کی عکاس ہوتی ہے۔ شاعر کے گردوپیش کے حالات اس کے قلم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف ماحول اور معاشرے سے متاثر ہوتا ہے بلکہ اس معاشرے اور ماحول کا عکس اس کی تحریروں میں بھی واضح طور پر جھلکتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ افراد معاشرہ اپنے گردوپیش کے حالات کے مطابق ادب تخلیق کرتے ہیں۔ اطہر پرویز کے مطابق:

> "زندگی ایک سیل رواں ہے جس میں سبک اور تند موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور ایک دوسرے سے ملتی رہتی ہیں، ایک قوس قزح ہے جس میں بے شمار کرنوں کی جلوہ گری ہے۔ کچھ ایسا ہی حال انسان

کے دل کا بھی ہے۔ محبت اور نفرت، خود پسندی اور ایثار، ہمدردی اور لاتعلقی، رحم اور بے رحمی یہ تمام متضاد کیفیتیں انسانی دل پر گزر جاتی ہیں۔ ادب انہی احساسات کا آئینہ دار ہے۔"(۱۱)

۱۹۳۵ء میں لکھے گئے اختر حسین رائے پوری کے مقالے "ادب برائے زندگی" کو نہ صرف اس دور میں بلکہ آج بھی اہمیت کا حامل مانا جاتا ہے۔ کیونکہ اسی مقالے نے برصغیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو نکتہ آغاز فراہم کیا۔ اس دور کی طرح آج بھی یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ آرٹ انسان کے لیے ہے یا انسان آرٹ کے لیے؟ اختر حسین رائے پوری ادب کو زندگی کا شعبہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب اور زندگی دونوں کا بس ایک ہی مقصد ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ادب کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ انسانیت کی ترجمانی کرنے والا ہو اور ایک ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کر کے انسانیت کو اخوت اور وحدت کا پیغام دے۔ علاقائی تعصب کے جذبات کی مخالفت کرتے ہوئے ادیب کو اخوت، مساوات اور باہمی یگانگت کو عام کرنا چاہیے۔ یہی صحیح معنوں میں ادیب اور ادب کا بنیادی فرض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"ادب زندگی کے اس سوال کا جواب ہے کہ انسان کس سے محبت اور کس سے نفرت کرے اور کس طرح زندہ رہے۔ یہ سچ ہے کہ تدریسیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں یہ روگی انسانیت کو پند و نصیحت کی کڑوی دوا نہیں پلاتا، بلکہ ہلکے اور میٹھے سروں میں اس کی عیادت کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ادب کے ماخذ ماضی و حال ہیں۔۔۔ ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے گرد و پیش کا آئینہ دار ہو تا کہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہو کر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو سکے۔"(۱۲)

ادب زندگی کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ پاتا۔ زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی ای سا کرنا ممکن ہے۔ زندگی ادب کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرتی ہے، عام انسان اور ادیب کے مقاصد تقریباً یکساں ہی ہیں۔ ایک ماحول کی ترجمانی کرتا ہے اور دوسرا اسی ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ میکسم گورکی ادب کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ ادب انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ اس کی خامیوں اور برائیوں کو ظاہر کرتا ہے، انہیں بے نقاب کرتا ہے۔ زندگی اور ادب کا ذکر کرتے ہوئے اگر شعراء اور ادباء کی بابت یہ سوال اٹھایا جائے کہ وہ کون سی راہ اختیار کریں جس سے وہ اپنی تخلیق کو زندگی سے قریب تر کر سکتے

ہیں تو ان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ "اگر ان کے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے اور اگر ایک حساس انسان کی طرح وہ زندگی کے سرد و گرم کو محسوس کر سکتے ہیں، ہر ظلم کی مخالفت کرتے ہوئے لوگوں کے مسائل، غربت اور بے روزگاری پر کڑھتے ہیں، میدان جنگ میں بکھری لاشوں کو دیکھ کر ماتم کناں ہوتے ہیں اور اپنے سامنے نیکی کے مقابلے میں بدی کو طاقتور پاتے ہیں تو ہر گز خاموشی اختیار نہ کرو بلکہ ہمت اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنا سیکھو۔" (۱۳) معاصر اردو ترقی پسند شاعری کی ذیل میں ادب برائے زندگی سے مراد ایسا ادب ہے جو انسانیت کے مقاصد، مسائل اور ضروریات کی نمائندگی اس طرح کرے کہ لوگ اس اثر کو قبول کریں۔ اس ادب کے پرچار کے لیے دل میں انسانیت کا جذبہ ہونا لازمی ہے۔ زمانے کے سرد و گرم کے مطابق ایک ادیب اثر قبول کرتا ہے اور ادیب کے لیے یہ لازم ہے کہ ماضی اور حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مستقبل کے تقاضوں کو جانچے اور اس کی روشنی میں ادب تخلیق کرے۔ تاریخ کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے زندگی کے مقصد کو جانے اور یہ اسی صورت ممکن ہو گا جب ایک ادیب زندگی کے معانی و مفہوم کو جانے، اس کے سرد و گرم سے آشنا ہو۔ زندگی کے مطالب کو سمجھے بغیر اس کے اسرار و رموز پر بحث کرنا ایسے ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا۔

جب کبھی اس طرح کی صورتحال پیدا ہوتی ہے تو اس میں ادیب اپنے تخلیق کردہ ادب پاروں میں ادب سے زندگی کو جوڑنے میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ جب کسی شخص کو دوسروں کے احساسات، جذبات کا اندازہ ہی نہیں ہو گا تو وہ کیسے ان کے درد کو سمجھ پائے گا یا ان تک کس طرح اپنا پیام پہنچانے میں کامیابی حاصل کر پائے گا۔ ڈاکٹر حسین محمد جعفری کے مطابق:

> "زندگی بسر کرتے ہوئے ہم بہت سے جذبوں سے گزرتے ہیں، بہت سے تجربوں سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ نامعلوم احساس ہمارے باطن میں جنم لیتے ہیں محبت، نفرت اور بغاوت کے جذبے ابھرتے ہیں۔ لیکن یہ سب عام طور پر گونگے اور بے نام ہوتے ہیں اور محسوس کرنے کے باوجود ہم انہیں پوری طرح محسوس نہیں کرتے۔ ان جذبوں، تجربوں اور محسوسات سے ہمارا واسطہ کسی ناول، افسانے، ڈرامے شاعری یا مضمون کے ذریعے پڑتا ہے تو ہمیں اپنے بھولے ہوئے تجربے یاد آتے ہیں۔۔۔۔ یہی ادب کا

سماجی عمل ہے اور یہی ادب اور زندگی کا رشتہ ہے۔ جس کے وسیلے سے ہم
نئے معانی تلاش کرتے ہیں اور نیا شعور حاصل کرتے ہیں۔" (۱۴)

ادب برائے زندگی کا یہ تصور ہمیں معاصر شعراء کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں سماج کو بدلنے اور معاشرے کے مسائل کو اجاگر کرنے کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ ادب برائے زندگی کے نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کو اردو ادب میں مؤثر اور متحرک تحریک جانا اور مانا جاتا ہے۔ اس کے پہلے صدارتی خطبے میں ہی پریم چند نے جس ادب کے فروغ کا ذکر کیا وہ ادب برائے زندگی ہی تھا۔ پریم چند کے الفاظ میں:

"اب ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں فکر ہو، آزادی کا جذبہ
ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم
میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں۔ کیونکہ اب اور
زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔"(۱۵)

ادب زندگی سے عبارت ہے، زندگی ادب سے نہیں۔ کوئی بھی ادیب ادب کے بغیر حیاتی کا تصور نہیں کر سکتا۔ زندگی کو ادب کا سرچشمہ کہا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ادب زندگی سے منہ موڑے تو اس کا ناطہ زندگی کی رحمتوں اور برکتوں سے کٹ جاتا ہے۔ ادب اور زندگی کے اسی رشتے کے بارے میں بات کی جائے تو" کامل ترین ادب وہ ہے جو حالات کے مطابق ہو، جس میں واقعیت، افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں ، جس میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں۔ جو ہمارے ذوق عمل اور ذوق حسن دونوں کو آسودہ کرے۔"(۱۶) زندگی میں ہم جو کچھ اپنے گردوپیش میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں ان سب کا ذکر ہم ادب میں پاتے ہیں، ادب چونکہ زندگی کا عکاس ہے اور ادیب معاشرے سے ہی ادب تخلیق کرتا ہے معاشرے کے حالات و واقعات کا اثر ہمیں ادب میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔" ایسا ادب جو انسانی دکھ سکھ کی ترجمانی نہ کر سکے کس کام کا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو ادب کے ذکر میں ادب پہلے ہے یا زندگی۔ جب سے کائنات کا وجود عمل میں آیا تب سے ادب بھی موجود ہے۔ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی ادب کی تخلیق ہو گئی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ ادب زندگی اور زندگی ہی ادب ہے۔" (۱۷)

(ب)اکیسویں صدی کی شاعری کا منظر نامہ:

شاعری سے مراد موزوں اور مناسب الفاظ میں اپنے جذبات،احساسات اور خیالات کو دوسروں تک پہنچانا۔کسی بھی واقعہ، کہانی، حادثہ، کیفیت یا نظریے کو موزوں الفاظ میں بیان کرنا شعر کہلاتا ہے۔شاعر اور ادیب معاشرے کے حساس فرد ہوتے ہیں۔اسی لیے وہ کسی بھی واقعہ کا گہرا اثر لیتے ہوئے شعر و ادب تخلیق کرتے ہیں۔جس معاشرے یا ماحول میں شاعر رہتا ہے، پروان چڑھتا ہے، شاعری اسی معاشرے یا ماحول کی ترجمان ہوتی ہے۔اس کی عکاسی کرتی ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری ان منظم جذبات، احساسات کا نام ہے جو فی البدیہہ نازل ہوتے ہیں۔اب ان نازل شدہ جذبات کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔کسی زمانے میں شاعری کو پیغام پہنچانے کا سہل ترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ شاعری تو سہل ہو گئی ہے مگر اس میں سے پیغام مفقود ہو چکا ہے۔

شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے۔اسی کے ذریعے شاعر ایسے واقعات بھی بیان کرتا ہے جو اس نے دیکھے نہیں ہوتے، محض سن کر وہ ان کا ایسا عمدہ اظہار کر دیتا ہے گویا وہ واقعہ اسی کی نظروں کے سامنے رونما ہوا ہو۔انسانی زندگی میں تخیل کی بنا پر نت نئی تخلیقات منظر عام پر آتی ہیں۔ایک عام انسان کے لیے صبح کا وقت محض طلوع آفتاب ہی ہے مگر ایک شاعر کے لیے یہ وہ وقت ہے جو بہت سی گرہوں کی گتھی سلجھاتا دکھائی دیتا ہے۔شاعر یا ادیب عام انسان کی نسبت کائنات پر غور و فکر زیادہ باریکی سے کرتا ہے۔الفاظ کا چناؤ اور اظہار بیان کا طریقہ ہی کسی بھی شخص کے اسلوب کو مؤثر اور دلکش بنا دیتا ہے۔اور پھر شاعری تو نام ہی الفاظ کو خوبصورتی سے نگوں کی مانند جوڑنے کا ہے۔بقول حیدر علی آتش

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شاعری خواہ کسی بھی دور میں ہو یا کسی بھی تحریک سے منسلک رہی ہو انسان کے احساسات کو پروان چڑھانے اور زندہ رکھنے میں ہمیشہ سے معاون رہی ہے۔یہ شاعری ہی ہے جو انسان کو فطرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔اس کا تعلق چونکہ جذبات سے ہوتا ہے۔اور یہ جذبات کو ہوا دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ شاعری سیاسی تحریک کے دوران لوگوں کے جذبات کو ابھارتی ہے۔اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ جتنی پرانی اردو ادب کی تاریخ ہے اتنی ہی قدیم شاعری بھی ہے۔شاعری نے اپنے روز اول سے لے کر عصر حاضر

تک اعتراضات و اختلافات کے باوجود اپنی مقبولیت، نزاکت، لطافت، موسیقیت، نفاست اور غنائیت کا لوہا منوایا ہے۔ امیر خسرو، کبیر، قلی قطب شاہ، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، مرزا مظہر جانِ جاناں ، سودا، مومن، غالب، آتش، داغ اور اب انیسویں صدی کے آتے آتے اقبال، جگر، فانی، اصغر، حسرت، بشیر بدر، ندا فاضلی، عرفان صدیقی، وسیم بریلوی، اور شہریار وغیرہ تک اپنا ایک طویل سفر طے کرتی ہوئی شاعری آگے بڑھ رہی ہے۔ اور اب اکیسویں صدی میں داخل ہو کر ادب کے افق پر سائنسی، تکنیکی، انٹرنیٹ اور فیس بک جیسے ذرائع اور ترسیل و ابلاغ کی زبان سے ہم آہنگی پیدا کر کے نئے معرکے سر کر رہی ہے۔ بات چاہے موضوع کے اعتبار سے ہو، یا اسلوب کے حوالے سے، سوال چاہے ڈکشن کا ہو، ہر سطح پر شاعری نے وسعت اور کشادگی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ جس طرح سماج، مزاج اور نفسیات کے بدلنے سے ذہن میں نشیب و فراز آئے اسی طرح سیاسی منظر نامے کے بدلاؤ سے بہت سے معاشی اور اقتصادی مسائل نے جنم لیا۔ لوگوں کا رہن سہن بدلا، اسی طرح شاعری کی رنگت بھی بدلی۔ اسلوب میں فرق آیا، لفظوں کے انتخاب میں تبدیلی سامنے آئی۔ ادب چونکہ سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور جس طرح سماج انقلابی دور سے گزرتا ہے بالکل اسی طرح ادب بھی تغیر آمیز ہوتا ہے۔ اس میں بھی بدلاؤ آتا ہے۔ شاعروں نے بھی اپنی تخلیقات میں نئے انداز اور نئے روپ اختیار کرتے ہوئے نئی چیزوں کو اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کیا۔ قمر رئیس شاعری میں بدلاؤ کے ذکر کے حوالے سے کہتے ہیں:

> "سیاسی رمزیت ہو یا ذات کا ارتکازی محور، معاملہ ہے عالمی روزن کا۔ حیات کے اس تصور کا جو جام شراب میں شفق کے عکس کی طرح جھلکتا ہے۔ بات منڈیر پر بیٹھی چڑیا کی ہو یا آسمان پر تیرتے بادل کے ٹکڑے کی، دونوں میں دیکھنے والے کا اندازِ نظر ہی نہیں اس کی نظر بھی ضرور نمایاں ہو گی اور اس نظر کے رشتے دور تک جائیں گے شخصیت سے ہوتے ہوئے زمانے تک اور زمانے سے ہوتے ہوئے زندگی تک۔" (۱۸)

عصر حاضر میں اردو شاعری میں نئے تیور، نئے لب و لہجے، نئی رنگت اور نئی دلکشی و جاذبیت موجود ہے اور یہی سب کچھ اکیسویں صدی کی شاعری کے حوالے سے دیکھنے میں بھی ملتا ہے ۔ قدیم طرز شاعری یعنی گل و بلبل، ہجر و وصال، شمع و پروانہ، زلف و رخسار جیسے محدود دائرے سے نکل کر شاعری نے اپنا دامن وسیع کیا، اور آج اکیسویں صدی میں اسی کشادگی اور وسعت کے باعث گلوبلائزیشن کے اس دور میں ہر طرح کے موضوع

کو اس میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا کہ شاعری میں ہر دور کے ماحول اور معاشرے کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے موضوعات کا انتخاب کیا گیا۔ ظاہری سی بات ہے کہ جب جمہور اپنا انداز اور اطوار تبدیل کرتا ہے تو شاعری اور خاص کر ادب بھی اپنے اطوار میں تبدیلی لے کر آتا ہے۔ شاعری میں جس طرح اسلوب اور ساختیات کو اہمیت حاصل ہے بالکل اسی طرح موضوعات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ ایک صدی قبل کی شاعری کے موضوعات فرسودگی اور قدامت پسندی پر مبنی تھے۔ آہستہ آہستہ فرسودگی اور قدامت پسندی سے نکل کر شاعری کے موضوعات نے آفاقی حیثیت حاصل کی۔ اور اب جبکہ ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں اور یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ جوہری طاقتیں ہر ملک کے قبضے میں ہیں۔ دہشت گردی جیسے مسائل اور موضوعات نے سر اٹھایا ہے۔ اور اسی عہد میں مادیت پرستی نے ایسا سر اٹھایا ہے کہ انسانی اقدار کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ نفسا نفسی کا سا عالم ہے ان حالات کا مشاہدہ ہمارے فنکار اور شاعر حضرات بڑی گہرائی اور گیرائی سے کر رہے ہیں۔ اور سماج کے مسائل کو شاعرانہ موضوعات کا حصہ بنا کر اپنے اپنے اسالیبِ فکر کے ساتھ ڈھال رہے ہیں اور جیسا کہ میر نے کہا تھا کہ "دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے"۔ میر کے دور سے لے کر غالب و اقبال تک کے دور میں بھی دل کی ویرانی اور بربادی کا ذکر سنتے آئے ہیں۔ اور اب اکیسویں صدی میں چونکہ غالب اور میر تو نہیں رہے مگر ویرانیاں، بربادیاں اور درد و غم آج بھی اسی طرح شاعری کا موضوع ہیں اور کیوں نہ ہوں، کہ جب معاشرے میں یہ سب موجود ہے تو اس کا ذکر براہ راست ہماری شاعری میں نظر آتا ہے۔

عصر حاضر کے مسائل کو شاعری کی زبان میں بہت ہی نفاست سے بیان کیا گیا ہے ۔ بات چاہے امریکہ کی ہو یا روس کی، فلسطین کی ہو یا ہسپانیہ کی، شام کی ہو یا عراق کی، افغانستان کی ہو یا لبنان کی، پاکستان کی ہو یا ہندوستان کی، ہر ملک میں دہشت گردی، فرقہ پرستی، ذہنی تعصب، مذہبی تفریق، علاقائی اور لسانی تفریق جیسے مسائل موجود ہیں اور انہی مسائل کا ذکر ہمیں شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ان مسائل کو شاعری میں مختلف موضوعات کا سہارا دے کر بیان کیا گیا ہے۔ جس سے نہ صرف شاعری میں نت نئے تجربے ہو رہے ہیں بلکہ شاعری میں نئے موضوعات، مسائل اور ایشوز سے ہم آہنگی بھی پیدا ہو رہی ہے۔ مغربی تہذیب جو کہ گلوبل ویلج کے باعث آج پوری دنیا پر حاوی ہوتی جا رہی ہے اس تہذیب سے مغربی سماج اور معاشرہ بھی ذہنی اعتبار سے کافی متاثر ہو رہا ہے۔ جسموں پر کم ہوتے لباس اور لوگوں کو فیشن کے نام پر، جدیدیت کے نام پر، تہذیب و تمدن کے نام پر، لیونگ اسٹینڈرڈ کے نام پر اور ہائی سوسائٹی کے نام پر مغربی تہذیب مغلوب کر رہی ہے، بری

طرح اپنا اثر چھوڑ رہی ہے۔ ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو ہمارے شاعر نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے اعلیٰ اسلوب اور ڈکشن کے ذریعے ان کا اظہار بھی کیا۔

ایک زمانہ تھا جب شاعری پر ترقی پسندی کے اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔ اس کو نعرہ، انقلاب یا پروپیگنڈہ کا نام دیا گیا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس دور کے شعراء خود کو ترقی پسند کہتے تھے۔ عصر حاضر میں کچھ شعراء خود کو ترقی پسندی، جدیدیت اور پسِ جدیدیت سے بھی بلند سطح پر سمجھتے ہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کی شاعری نہ جدیدیت سے تخلیق پائی اور نہ ہی ترقی پسندی سے اس کا کوئی سروکار ہے۔ شعراء کی یہ پود کسی نظریے کی پابند نہیں وہ اپنے احساسات میں آزاد ہیں اور شعراء کی بیشتر تعداد یہی آزادی اپنے صوتی آہنگ کو بھی سونپ رہی ہے۔ کسی بھی فنکار کے لیے لازم ہے کہ وہ تخلیق کے حوالے سے اپنے ذہن کے تمام دروازے کھلے رکھے تاکہ تازہ افکار و خیالات سے وہ واقف رہے۔ لیکن اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو کسی خاص نظریے کا تابع نہ بنائے کیونکہ کوئی بھی نظریہ ایک مخصوص وقت گزرنے کے بعد یا اپنی معینہ مدت پوری ہونے کے بعد معتوب و مردود قرار دیا جاتا ہے۔ کائنات کی بقا تغیر و تبدل میں ہے اور یہ فطرت کا نظام بھی ہے اسی لیے کسی مخصوص نظریے کے تحت تخلیق کیا گیا ادب جلد ہی اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے اور اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

اکیسویں صدی کی شاعری کی بات کی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا سماج بگاڑ کی آخری منزل پر ہے۔ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ سائنس کی ترقی نے فاصلے ختم کر دیئے ہیں ۔تہذیبیں ،قدریں ،عقیدے، اصول، رسمیں، پوشاک، ترجیحات سب نے اچانک مفہوم کھو دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح اور غلط کی، اچھے اور برے کی، کھرے اور کھوٹے کی تمیز ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے چاروں طرف جو بھی ہو رہا ہے سماج میں ہونے والا ہر فعل، ہر عمل ہماری مرضی کے خلاف ہے۔ اکیسویں صدی کی شاعری میں انہی مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ عوامی ناپسندیدگی اور احتجاج کا ذکر ہمیں اکیسویں صدی کی شاعری میں بجا طور پر نظر آتا ہے۔ عصر حاضر کا شاعر اپنے عہد کے حوالے سے سنجیدہ ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ انسانی ارتقاء کی تاریخ کے اس موڑ پر جہاں بیسویں صدی اپنا سفر ختم کر رہی ہے وہیں پر سوشل میڈیا کے تحت بہت سی تبدیلیاں منظر عام پر آئی ہیں۔ وہ پر سکون زندگی جو ہمارے پرکھوں کو ورثے میں ملی تھی ہمارے لیے قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔ عہد حاضر کا شاعر نہ صرف حساس ہے بلکہ اپنے عہد سے آگاہ بھی ہے۔ وہ شاعری کا سہارا لے کر اپنے اندر کی گھٹن سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اسے یہ کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ وہ اپنے پیش رو شعراء کی طرح

اپنی ذات کے حصار میں قید رہنا پسند نہیں کرتا۔یہی وجہ ہے کہ اس بات کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار ہے کہ شاعری کا نقاد ہو سکتا ہے اس کی شاعری کو تسلیم ہی نہ کرے ،جیسا کہ اکثر ترقی پسند شاعروں کے ساتھ ہوا تھا۔کیونکہ شعری تنقید ابھی بھی مروجہ اصولوں میں جکڑی ہوئی ہے۔اور زیادہ تر نقاد مغرب کی اندھی تقلید میں لگے ہونے کے باعث طے شدہ فارمولوں سے بڑھ کر شاعری کو پرکھنے پر یقین نہیں رکھتے۔کلیم الدین احمد کے نزدیک بھی نئی اور پرانی باتوں پر غور کرنا لازم ہے:

> "پہلے مضامین کی دنیا عاشقانہ ،جذبات،احساسات اور حالات تک محدود تھی۔اب یہ دنیا وسیع ہو گئی ہے اور کائنات اور حیاتِ انسانی سے متعلق سارے حقائق اور مسائل اس میں کھینچ آئے ہیں۔پہلی شرط بس اس قدر تھی کہ جو جذبات، احساسات اور حالات ہوں وہ عامتہ الورد ہوں اب شرط یہ ہے کہ جو تاثر یا ذہنی نقش یا خیال ہو اس میں اصلیت اور سچائی ہو۔پہلے خیال تھا کہ الفاظ شیریں،خوشگوار اور واضح ہونے چاہیں اور اب خیال یہ ہے کہ زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہو۔" (۱۹)

ادبی منظر نامے کو عالمی رویوں سے ہم آہنگ کرنے کی بے چینی نے شاعر کو گلوبل ویلج یا نئے سائبر سماج کا چہرہ دکھایا ہے۔اب شاعر کو مابعد جدید ہونے پر بھی اعتراض نہیں ہے مگر وہ آج بھی ہجوم میں گم نہیں ہونا چاہتا ۔بلکہ کسی بھی تحریک، فلسفے یا پابندیوں میں آج بھی اس کا دم گھٹتا ہے۔عالمی منظر نامے میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے کہ شاعر اپنی فکر اور خیال کو کسی قسم کی پابندی میں رہ کر پروان نہیں چڑھانا چاہتا۔نئی صدی کے شاعر کو آج بھی اپنی آزادی پیاری ہے۔عہد حاضر کا شاعر فرد کی تنہائی کی باتیں نہیں کرتا۔بلکہ حالات کا ساتھ دینے کے لیے وہ فلسفہ وجودیت سے بہت دور نکل آیا ہے۔کیونکہ انٹرنیٹ کے دور میں اسے اپنی شناخت کی بھی پروا نہیں ہے۔

دراصل ایک حساس تخلیق کار سائبر سماج میں پیش آنے والی ہر تبدیلی کا محاسبہ ایمانداری سے کرتا ہے اسے اپنی وضع کی گئی شعری فضا کے لیے یہ کہنے میں ذرا بھی شرم یا ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ گزشتہ سے پندرہ سالوں میں ہماری زندگی میں سماجی،سیاسی، معاشی اور فکری شعور پر نمایاں طور پر تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ہماری سوچ کے ساتھ ساتھ ہمارے جینے کا انداز بھی بدلا ہے،ہمارے مسائل کی شکلیں بھی بدلی ہیں۔اکیسویں صدی کی شاعری میں ذات پات،علاقائی عصبیت،اصول اور آدرش کا فقدان،دہشت گردی کا زور، ملٹی نیشنل

کمپنیوں کی آمد اور صارفیت کے غلبے کے باعث زندگیاں متاثر ہوئی ہیں ۔شاعری کی صورت بدلی ہے، موضوعات بدلے، شاعر کی سوچ اور فکر کا انداز بدلا۔اس کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی کے بعد آج کا فنکار قصباتی، شہری اور ملکی حدود سے باہر نکل کر ساری دنیا سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔اکیسویں صدی میں واضح طور پر شعری سفر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔غزل گوئی کی روایت کو گل وبلبل سے جوڑنے کا لامتناہی سلسلہ نہ صرف ختم ہوا بلکہ شاعروں نے شعری حدود سے نکل کر نثری تنقید میں بھی طبع آزمائی کی۔"اس میں شک نہیں کہ جب غزل کا آغاز ہوا تو حسن وعشق کی باتوں تک ہی محدود تھی لیکن یہ صورتحال زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہی۔اس کا دامن برابر وسیع ہوتا گیا۔آج یہ صورت حال ہے کہ حیات و کائنات کا کوئی ایسا موضوع نہیں جو کامیابی کے ساتھ غزل میں پیش نہ کیا جاسکتا ہو۔"(۲۰)معاصر ترقی پسند شاعری کے حوالے سے ذکر کیا جائے تو معاصر شعراء نے اکیسویں صدی کے بدلتے رجحانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی شاعری میں ان عنوانات کو موضوع بنایا جو آجکل ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں۔بات خواہ نظم کی ہو یا غزل کی، شعراء نے ہر صنف میں اکیسویں صدی کے منظرنامے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے خیالات کو شاعری میں پیش کیا ہے۔دہشت گردی جو کہ عام سی بات بن گئی ہے کہ اب شعراء اس کا ذکر کیے بغیر اپنی شاعری کو نامکمل تصور کرتے ہیں۔اکیسویں صدی میں اس کا ذکر ناگزیر ہو گیا ہے۔روش ندیم اپنی کتاب "دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں" میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خدا کی قسم! میں دہشت گرد نہیں ہوں
شہر کے مورچوں، نائیوں، کلچہ فروشوں
اور تانگہ بانوں سے پوچھ لو
مگر تمہیں ان کی گواہی سے کیا؟
تم بٹھاؤ عدالتیں، لگاؤ الزام اور چڑھادو مجھے سولی پر (۲۱)

اکیسویں صدی میں مزور کو اس کا جائز اور مناسب معاوضہ دینے پر بھی کافی بحثیں ہوئی ہیں ۔غریبوں، مزدوروں، محکوموں اور پرولتاریوں کو ان کے اپنے ہی حق کے لیے آواز نہیں اٹھانے دی جاتی۔وہ کم اجرت پر محنت کر کے سرمایہ دار کا نفع بڑھانے میں مصروف عمل ہیں۔کائنات کی خوبصورتی اور اس میں ہونے والی تبدیلیاں، گو ان سب میں ایک ذات کی کاری گری جھلکتی ہے مگر اس کی کانٹ چھانٹ کرنے، بنانے اور سنوارنے میں مزدور اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے تب کہیں جا کر کوئی بھی منظر خوشنما اور دلکش نظر آتا

ہے۔ "لمحہ موجود" کے شاعر فضل احمد خسرو اپنی شاعری میں مزدور کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اس کی محنت کے معترف ہیں وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

میرے ہاتھوں میں تارے مشقت کے ہیں
میری محنت نے دنیا کی تشکیل کی
آج دنیا میں جو کچھ ہے زیبِ نظر
آج کا یہ نگر
میری محنت مشقت کا ہے یہ معجزہ
سارا سرمایہ
سارے ہی لعل و گوہر
لہلہاتے ہوئے رزق کے سلسلے
بزم امکاں کی
میرے دل و جاں کی
یعنی۔۔۔ انساں کی
ساری آسائشیں
میری محنت سے ہیں (۲۲)

ان کے نزدیک مزدور کی کاریگری سے ہی جہاں کی سب رعنائی قائم و دائم ہے۔ لہلہاتے سبز کھیت بھی مزدور کی محنت اور مشقت کے باعث دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے ہنر سے اپنی کہنہ گری سے اور اپنے کام سے لگاؤ کے ذریعے کائنات کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتا ہے۔ معاصر ترقی پسند شعراء میں ایک ابھرتا نام ارشد معراج کا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں مابعد نو آبادیاتی عناصر کی جھلک ملتی ہے۔ گو کہ ہم نو آبادیاتی دور سے نکل چکے ہیں مگر ہماری سوچ اور ہمارے کاروباری نظام آج بھی ان نو آبادکاروں کی جکڑ میں ہیں۔ وہ بظاہر تو ہم میں موجود نہیں ہیں مگر ہمارا سارا نظام اپنے ملک میں بیٹھے کنٹرول کر رہے ہیں۔ ارشد معراج انہی باتوں کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی کتاب "کتھا نیلے پانی کی" کی نظموں میں واضح انداز میں مابعد نو آبادیاتی اثرات دکھائی دیتے ہیں؛

وہی ابتداء
وہی فاصلے

مرے روبرو مرے راستے
میں جہاں رہا، میں وہاں نہ تھا
وہی کھینچ کر مجھے لے گئے تھے
فرات و دجلہ کے نام پر
جو سوار آئے تھے دور سے
(مری ساری فصل وہ کھا گئے)
میں ہوں دم بخود کروں کیا مگر
مرا سر نگوں کھلے آسماں
میں غلام تھا، میں غلام ہوں (۲۳)

پوسٹ کلونیل ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم کے حوالے سے ادبی حلقوں میں ایک معتبر نام سعادت سعید کا ہے۔ اپنی تخلیقات سے انہوں سے کلونیل ازم جیسے نظریے کو فروغ دیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان پر بھی مہارت حاصل ہے۔ ان کی شاعری اکیسویں صدی میں رہنے کے باوجود عام فرد کے مسائل، اس کی گھٹن اور اس کی بے حسی کے گرد گھومتی ہے۔ عصر حاضر میں ظلم و ستم کو شاعری کی بدولت اجاگر کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

وقت کی سوئیاں
اپنی انتہا کو چھو چکی ہیں
نیم خوابی نے
ہمارا شعور ہم سے چھین لیا ہے
ظلم کی شعاعیں
ہمیں تاراج کر چکی ہیں
ناداری کے سیہ پانیوں سے
ویرانیاں جھانک رہی ہیں
مردے اٹھائے جانے کا وقت
قریب ہے (۲۴)

معاصر ترقی پسند شاعری کا حوالہ غزل کے ذکر کے بغیر ممکن نہیں۔ قاری تک اپنے خیالات پہنچانے کا ایک ذریعہ غزل بھی ہے۔اس کے ذریعے بھی مسائل کو اجاگر کیا گیا۔شعراء نے اپنے اپنے انداز میں اس میں طبع آزمائی کی۔اور عصر حاضر میں پیدا شدہ مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور بدلتی شاعری کے منظر نامے کو سمجھا،چاہے وہ منظر نامہ سیاسی و سماجی ہو یا اقتصادی و معاشی ہو، صنعتی و حرفتی اور تکنیکی و سائنسی ہو، مادیت پرستی کی بات ہو یا مٹتی ہوئی انسانی قدروں کی، شکست وریخت ہوتی تہذیب و ثقافت یا اخلاص و اخلاق کا فقدان موجود ہو؛ آج کے غزل گو اپنے اپنے تجربات ومشاہدات کی بنا پر اپنے اردگرد کے حالات وکیفیات کو غزل کے پیرائے میں بیان کر رہے ہیں۔ مظہر حسین سید معاصر ترقی پسند غزل کا ابھرتا نام ہے۔ان کی تخلیق کردہ کتاب "سکوت" میں ہمیں عصر حاضر کے مسائل جابجا دکھائی دیتے ہیں۔

تاریکیوں کا دور تھا سو جو بھی مل گیا
اس کو دیا بنا کے جلانا پڑا ہمیں
پھر یوں ہوا کہ ہم نے اسے جان کہہ دیا
پھر یوں ہوا کہ جان سے جانا پڑا ہمیں (۲۵)

اپنی غزلوں میں انہوں نے معاشرے میں ہونے والی دہشت، وحشت اور بربریت کا ذکر کمال مہارت سے کیا ہے۔ مسجد میں ہونے والی قتل وغارت، جنگ وجدل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مسجدیں ہو رہی ہیں خون میں تر
جانے کیا بھید ہے اذانوں میں
جنگ رکتی نہیں قبیلے کی
اتنی غیرت ہے نوجوانوں میں (۲۶)

عصر حاضر کے ممتاز شاعر ضیاء الحسن کی غزلوں کا مجموعہ "بارِ مسلسل" میں ضیاء الحسن بھی جینے کے اضطراب ،دکھ اور وجود کے بے وقعت ہونے کے احساس سے غمگین ہیں۔ مگر اس کے باوجود اپنی شاعری میں اپنی غزلوں میں وہ کبھی کبھی چہکنے بھی لگتے ہیں۔ان کی غزل نظم کے قریب لگتی ہے۔انہوں نے غزل اور نظم دونوں کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ضیاء الحسن کے حوالے سے امجد طفیل کا کہنا ہے:

" وہ معاشرے کے انتشار کو دلوں کے ملاپ سے کم کرنے کا آرزومند ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب تک انسان کے باطن میں ربط موجود

نہیں، جب تک دو انسان دل سے ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے، خارجی
سہارے انہیں زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے نہیں جوڑ سکتے۔"(۲۷)

وہ خواہش کرتے ہیں کہ ایسا شہر ہو جہاں انسانیت کو کچلا نہ جاتا ہو، اور نہ ہی انسانوں کو حیوانی سطح پر اترنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہو۔ اپنی غزل میں وہ خواہش کرتے ہیں کہ:

اک شہر محبت جیسا ہو
اک خوابوں جیسی دنیا ہو
اک حسن جمال کی وادی ہو
اک پیار کا بہتا دریا ہو
اک دل ہو نرم گلابوں سا
اک حوروں جیسا چہرہ ہو (۲۸)

نواز شاہد کا ذکر کریں تو وہ شاعر تو ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ترقی پسند دانشور اور کارکن کے طور پر بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اپنی تحریریوں میں وہ لبرل گلوبل معیشت اور مابعد جدید کا ذکر کرتے ہیں۔ نواز شاہد بنیادی طور پر غزل کے شاعر کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ اکیسویں صدی کی شاعری کے حوالے سے ان کے تخلیقی رویے جس جمالیاتی قوت کے ساتھ غزل میں نظر آتے ہیں وہ یک لخت قاری کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں رنج اور مایوسی کے علاوہ حوصلہ اور امید کا رویہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

میرا حاصل تو خار ہے لیکن
پھوک ہی پھول بو رہا ہوں میں (۲۹)
ایک ہی بھاؤ میں اٹھنے لگے ہیرے کنکر
اے میرے شہر کے عادل یہ مساوات نہ کر (۳۰)

اکیسویں صدی کی شاعری میں ہمیں نظم اور غزل دونوں میں معاشرتی رویے، رجحانات کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ ہر صنف نے اپنی سی کوشش کرتے ہوئے ان رویوں کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے۔ غزل کو چونکہ شروع سے ہی مقبولیت حاصل رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کا ہر شعر الگ اکائی ہوتا ہے اور اسی شعر میں بعض اوقات پوری کہانی کا بیان موجود ہوتا ہے۔ "یہ وہ صنف سخن ہے جو اپنے آغاز سے ہی ہر دل عزیز رہی ہے اور اب اکیسویں صدی کی شاعری میں جہاں نظم، نثری نظم، پابند نظم اور معرٰی نظموں کا رواج فروغ پا چکا

ہے وہیں غزل اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اسے اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔"(۳۱) معاصر ترقی پسند شعراء نے اپنے اپنے انداز سے اکیسویں صدی اور گلوبلائزیشن کے پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ خیالات کے اظہار کے لیے عمدہ طریقے چونکہ شاعری ہی ہے اس لیے شمیم حنفی کا کہنا ہے کہ:"شاعری میں بنیادی صداقت زبان ہے۔ زبان کے مسائل محض تاریخ یا واقعات کی بنیاد پر حل نہیں کیے جاسکتے کیونکہ زبان کا عمل الفاظ و اصوات تک محدود نہیں ہوتا اس کی گرفت انسان کی پوری شخصیت پر ہوتی ہے۔"(۳۲) عہد حاضر کے ترقی پسند فکر کے حامل شاعر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات اور احساسات میں ایسی عمدگی لے آئے ہیں کہ قاری ان کے اسلوب کے سحر میں کھو جاتا ہے اور ان کا اسلوب ہی انہیں دیگر شعراء اور ادباء سے ممیز کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

(ج) گلوبلائزیشن اور ترقی پسند شاعری:

گلوبلائزیشن لفظ دراصل گلوب (Globe) سے اخذ ہے۔ جس کے مطلب میں گیند، کرہ، کرہ ارض، کروی جسم یا گول شے ہے۔ لفظ گلوب ہی گلوبل کی بنیاد بنا۔ گلوب کو مختلف نصاب میں الگ الگ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی مرتب کردہ لغت میں اس کا مفہوم ان معنوں میں بیان کیا گیا ہے۔

"گلوبل، عالمگیر، مجموعی طور پر، عالمی، کروی" (۳۳)

لفظ گلوبل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ لفظ ۴۰۰ سال پرانا ہے۔ لیکن اگر لفظ گلوبلائزیشن کا ذکر کریں تو اس کا استعمال ۱۹۴۰ء سے قبل نہیں ملتا۔ اس لفظ کو سب سے پہلے webster لغت نے متعادف کرایا اور ۱۹۶۱ء میں اس لفظ کی باقاعدہ تعریف لغت میں شامل کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ گلوبلائزیشن کا لفظ بہت سی لغات میں شامل نہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو لفظ گلوبلائزیشن نیا ضرور ہے۔ مگر اس کا تصور کافی قدیم ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق:

> The process by which business or other organizations develop international influences or start operating on an international scale.(۳۴)

اس سے پتا چلتا ہے کہ گلوبلائزیشن سے مراد "عالمگیر بنانے کا عمل" یا عالمگیریت کی حالت" گلوبلائزیشن چونکہ عالمگیریت کا ہی انگریزی روپ ہے اور عالمگیریت سے مراد پورے عالم پر محیط۔ عالمگیریت ایک تحریک ہے جس نے دنیا بھر سے سیاست، معیشت، معاشرت اور ادب کو متاثر کیا۔ گلوبلائزیشن نے چونکہ پوری دنیا کو

متاثر کیا یہی وجہ ہے کہ ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں نے اس کو اپنے معانی و مفہوم پہنائے۔ سیاست سے تعلق رکھنے والے اسے معیشت کا عالمی پھیلاؤ قرار دیتے ہیں، عمرانیات یا سوشیالوجی کے مفکرین اسے ثقافت پر اثرات کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ الغرض یہ کہ گلوبلائزیشن (عالمگیر) ایک ایسی تحریک ہے جس نے گزشتہ تین چار دہائیوں سے نہ صرف دنیا کو متاثر کیا بلکہ علم و ادب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ علم و ادب بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔

دنیا میں جب بھی کوئی نئی یا ہنگامی صورتحال پیدا ہوتی ہے تو اس کے لیے خاص قسم کی اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ یہ اصطلاحات خاص وقت اور زمانے کے لیے وضع کی جاتی ہیں اور اس دور کا میڈیا اس اصطلاح کو اتنا پھیلاتا ہے کہ وہ اصطلاح ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔ لفظ گلوبلائزیشن بھی اسی طرح منظر عام پر آیا۔ دی نیو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق:

> "Globlization is a process by which the experience of every day life, marked by the diffusion of Commodities and ideas is becoming standardize around the world.(۳۵)

(عالمگیریت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے دنیا بھر میں روز مرہ زندگی کے تجربات اشیائے صرف اور نظریات کے پھیلاؤ کے نظام ساری دنیا میں یکساں ہو رہے ہیں)

ماہر عمرانیات میلکم واٹر گلوبلائزیشن کے حوالے سے کہتے ہیں۔

> "A Social Process in which the Constraint of geography on economics, political, social and Cultural arrangement recede and in which people become increasingly aware that they are receding.(۳۶)

(ایسا سماجی عمل جس میں جغرافیے کی بندش معاشی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی بندوبست کی بدولت کم ہو جاتی ہے ۔ جس سے لوگ بخوبی آگاہی رکھتے ہیں کہ یہ بندھن ٹوٹ رہے ہیں)

لہذا کہا جا سکتا ہے کہ عالمگیریت ایک سماجی عمل ہے جس میں ساری دنیا کے لوگ ایک معاشرت میں یکجا ہو کر عمل پزیر ہوتے ہیں یہ سماجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی قوتوں کا مجموعہ ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے خاتمے اور مابعد نو آبادیاتی نظام کے حوالے سے گلوبلائزیشن کے بارے میں سید مسعود جاوید کا کہنا ہے:

> In the developing countries, there is fear that globalization will wad to a form of recolonization where their economics become dominated by western MNC,s serving western financial interest.(۳۷)
>
> (ترقی پزیر ممالک میں یہ خوف پایا جاتا ہے کہ عالمگیریت ایک قسم کی نو آبادیات کی طرف لے جائے گی جہاں ان کی معیشت پہ مغربی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا غلبہ ہو گا جو مغرب کے معاشی مفادات کے لیے کام کریں گی۔)

ان تعریفات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ گلوبلائزیشن کے پیش کردہ تصورات بہت خوش کن ہیں۔ یعنی اس وسیع و عریض کائنات کو ایک دھاگے میں پرو کر متحد کر دیا جائے، فاصلوں کو کم کرتے ہوئے پوری دنیا کو عالمی گاؤں کی صورت دے دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی پزیر ممالک بھی گلوبلائزیشن سے متاثر ہیں۔ کیونکہ یہ عدم مساوات کے خاتمے، حقوق کے تحفظ، محکوموں کے حق، اور تانیثیت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔ مگر یہ گلوبلائزیشن کا ایک رخ ہے۔ آج کا معاشرہ ساٹھ سال قبل کے معاشرے سے یکسر مختلف ہے۔ آج کی بین الاقوامی دنیا بھی ماضی کی دنیا سے مختلف نظر آتی ہے۔ گلوبلائزیشن اور ترقی پسندی کا ذکر کیا جائے تو ہم مانتے ہیں کہ ترقی پسندی ایک رویے، ایک زاویہ نگاہ، ایک منفرد اسلوبِ فکر اور ایک مخصوص طرزِ عمل کا نام ہے۔ یہ کسی خاص دور یا خاص عہد سے منسوب نہیں ہے۔ انسانی تاریخ کے ارتقائی سفر میں جمود کے بجائے تبدیلی سے ہم آہنگ ہونا، اپنے ماضی اور حال کی نسبت مستقبل کو بہتر بنانا روز اول سے ہی انسان کی کاوش کا محور رہا ہے۔ انسان کے آغاز کے ساتھ ہی ترقی پسندی کا بھی وجود عمل میں آ گیا تھا۔ ترقی پسندی واہموں اور غیر حقیقی چیزوں پر عقل کی بالادستی کا نام ہے۔ جبر کے خلاف انصاف کی آواز ہے۔ انسان دوستی کی پیامبر ہے۔ یہ طبقاتی نظام کی بجائے غیر طبقاتی نظام کی حمایت

کرتی ہے۔رجعت پسندی کی جگہ یہ خرد افروزی کی قائل ہے،استعماریت کی نفی کرتے ہوئے قومی آزادی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ان تمام صفات کے باوجود ترقی پسندوں کو ہر دور میں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔اپنے کہے ہوئے کو منوانے کے لیے ان کو خاصی تگ و دو کرنی پڑی پھر کہیں جا کر وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور سمجھانے کے قابل ہوئے۔ڈاکٹر سید جعفر احمد گلوبلائزیشن اور ترقی پسند ادب کے حوالے سے کہتے ہیں:

> "آج ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ گلوبلائزیشن کی دنیا ہے۔بین الاقوامی سطح پر بات کی جائے یا ریاستوں کے حوالے سے گفتگو ہو یا پھر ایک فرد کی نسبت سے گفتگو کی جائے۔آج کی سب سے بڑی حقیقت یہی گلوبلائزڈ دنیا ہے۔اس گلوبلائزیشن کے نتیجے میں ریاستوں کا کردار از سر نو متشکل ہو رہا ہے۔فرد کے انفرادی میلانات اور رجحانات پر بھی اس گلوبلائزیشن کا براہ راست اثر پڑ رہا ہے۔گلوبلائزیشن بنیادی طور پر سرمائے کی وسعت اور ریاستی حدود و قیود کو توڑتے ہوئے اس کے پھیلاؤ کا نام ہے۔(۳۸)

اگر گلوبلائزیشن یا عالمگیریت کی بات کی جائے تو عصر حاضر میں یہ لفظ نیا ضرور ہے مگر اس کے معانی و مفہوم کافی پرانے ہیں،اسکندر اعظم نے پوری دنیا پر اپنی حکومت کرنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ اسی گلوبلائزیشن کے عکس کو ظاہر کرتا ہے۔عصر حاضر میں ہمارے سامنے گلوبلائزیشن کی دو طرح کی تعریفیں ہیں ایک مثبت اور دوسری منفی۔مولانا یاسر ندیم مثبت تعریف کے حوالے سے کہتے ہیں:

> "یہ دنیا کے مختلف ممالک کے درمیان اقتصادی تعاون کی خوشگوار شکل ہے۔یہ اقتصادی،سیاست،ثقافت اور آئیڈیالوجی کی تبدیلی کے لیے مثبت قدم ہے۔عالمگیریت اس بات کی متقاضی ہے کہ ملکوں اور قوموں کے درمیان جو خلیج حائل ہیں،ناپید ہو جائیں،رنگ و نسل کے امتیازات اٹھ جائیں ،پوری دنیا ہم مشرب و ہم خیال ہو جائیں۔"(۳۹)

گلوبلائزیشن آزادانہ تجارت کی حامل ہے وہ دنیا کے ممالک کو آپس میں مل کر تجارت کی طرف راغب کرتی ہے۔دیکھا جائے تو ثقافتی سطح پر گلوبلائزیشن کے دو بڑے نتائج سامنے آ رہے ہیں ایک تو وہ ترقی یافتہ ملک جو صنعتی میدان میں سب سے آگے ہوں یا انہوں نے اسلحہ سازی میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہو۔ترقی یافتہ ملکوں کی یہ ثقافتی بالادستی انہیں تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بھی بالادست بناتی ہیں۔اس بالادستی کے مقابلے میں چھوٹے

ممالک کی ثقافتیں اپنا وجود قائم نہیں رکھ پاتی تو آہستہ آہستہ دم توڑتی جا رہی ہیں ۔بالادست ثقافتیں گلوبلائزیشن کے نام پر نہ صرف چھوٹی ثقافتوں کو ختم کر رہی ہیں بلکہ چھوٹی زبانیں بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں کم زور ثقافتوں کے ترقی پزیر ممالک اور حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ثقافتوں کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروائیں۔اپنی زبان کی بقاء کے لیے دوسری زبانوں میں اپنی زبان کے تراجم کرا کے اپنا ادب لوگوں کے سامنے پیش کرے تا کہ بین الاقوامی سطح پر ان کی زبان اور ثقافت کو فروغ ملے۔ گلوبلائزیشن کی تعریف کا منفی پہلو بھی ایسے ہی ہمارے سامنے آتا ہے۔

> "یہ مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کو غصب کر کے ان پر مغربی تہذیب کو مسلط کرنے سے عبارت ہے۔عالمگیریت مغربی روشن خیالی کی دعوت و تحریک کا نام ہے جس کا مقصد تہذیبی اور انسانی خصوصیات کا خاتمہ کرنا ہے۔" (۴۰)

ترقی پسندی کو گلوبلائزیشن کے ذریعے غلط رنگ دیا جارہا ہے۔ تہذیب و ثقافت بھی اس سے اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہی۔یہی وجہ ہے کہ مشرقی تہذیب کی بدولت مغربی تہذیب کو ہر جگہ اجارہ حاصل ہے۔ میڈیا اور انٹرنیٹ نے اس کو اور آسان بنا دیا ہے۔ پیرس سے نکلنے والا ہر فیشن صبح کی کرن کے ساتھ ہی دنیا کے چپے چپے پر پہنچ جاتا ہے۔ گلوبلائزیشن اور ترقی پسندی کے زعم میں عوام اپنی تہذیب و ثقافت سے نابلد ہوتی جا رہی ہے۔ جس فحاشی اور عریانی کو مغربی تہذیب میں معیوب نہیں مانا جاتا اہل مشرق بھی اسی کو اپنا کر اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کرنے میں لگے ہیں۔ اسی لیے اہل علم و دانش اور خاص کر ادیب طبقے کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا ہوں گی۔ وہ اپنی تحریروں سے اپنے پڑھنے والوں کے اندر ایسے احساسات اور جذبات پیدا کر سکیں جو تنگ نظری کی بجائے وسعت نظری کو فروغ دیں ،انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کے نظریے کو پروان چڑھائے۔ یہ کام اسی صورت میں ممکن ہو گا جب ادیب یا شاعر اپنے فرض سے آگاہ ہوں۔

گلوبلائزیشن نے نظریوں اور چیزوں کے درمیان ایسا اشتراک پیدا کر دیا ہے جس سے وہ کسی فردِ واحد یا کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں سمجھے جاتے بلکہ ہر شے کو عالمی ضروریات کے حساب سے سب کے لیے عام سمجھا جاتا ہے۔عالمگیریت کے اسباب کا اگر جائزہ لیا جائے تو اردو ادب میں عالمگیریت کے اسباب سر سید دور میں پروان چڑھنے والے ادب میں سامنے آئے۔ اسی دور میں مغربی اور سائنسی خیالات کو اپنانے کا رواج عام ہوا۔ گلوبلائزیشن نے جہاں ثقافتی اور سماجی حوالوں سے اثرات مرتب کیے وہیں زبان و ادب پر بھی اپنا اثر چھوڑا۔ سر سید نے مغربی تعلیم کو مسلم امہ کی بقا کے لیے لازمی قرار دیا۔ وہ قوم کو جدیدیت کی طرف لانا چاہتے

تھے تا کہ سائنسی، عملی اور ادبی لحاظ سے ترقی کر سکیں۔ سر سید دور کی ہی اگر اصلاحی شاعری کا ذکر کریں تو حالی نے اپنی شاعری میں اصلاح اور مقصدیت کا پہلو سامنے رکھا۔ گلوبلائزیشن کے اثرات اس دور میں نمایاں تھے۔ ہندی تہذیب و ثقافت پر مغربی معاشرت اثر انداز ہو رہی تھی۔ جس سے معاشی، معاشرتی اور سیاسی سطح پر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انگریزوں کا استبداد چونکہ ہر جگہ قائم تھا انہوں نے نصاب تعلیم کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اردو ادب میں، اردو تنقید میں، تدریس و تحقیق میں عالمگیریت کے اثرات کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ عالمگیریت یا گلوبلائزیشن کی ذیل میں ہی مغربی تھیوریوں نے اپنی چکاچوند سے لکھنے والوں کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کو اس طرف راغب بھی کیا کہ وہ ان تنقیدی مباحث کے حوالے سے تحریر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ حالی نے ورڑزورتھ اور ملٹن کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے "مقدمہ شعر و شاعری" جیسی تنقیدی دستاویز پیش کی۔

گلوبلائزیشن اور شاعری کا ذکر کریں تو شاعری پر گلوبلائزیشن کے اثرات انجمن پنجاب کے مشاعروں میں یورپ کے اثرات کے تحت ہوا۔ عالمگیریت کی وجہ سے شاعری کے میدان میں آزاد نظم، معریٰ نظم، نثری نظم اور پابند نظم جیسے تجربات پیش کیے گئے۔ گلوبلائزیشن کے اثرات کے تحت ہی غیر مردف غزلوں کو فروغ ملا۔ سانیٹ، ہائیکو اور ریپور تاژ کو ادب میں متعارف کرایا گیا۔ عالمگیریت نے معاشروں کے ساتھ ساتھ ثقافت کو بھی اپنے کنٹرول میں کر لیا ہے۔ پوری دنیا کے ادب اب ایک دوسری زبانوں کے ادب سے اثرات قبول کرنے لگے ہیں اور دیگر زبانوں کے ادب سے متاثر ہو رہے ہیں۔

اردو ادب اور شاعری میں گلوبلائزیشن کے اثرات کے تحت جمالیاتی، نفسیاتی اور مارکسی اثرات منظر عام پر آئے۔ تحریک خواہ کوئی بھی ہو وہ گلوبلائزیشن کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ گلوبلائزیشن کے اثرات کے تحت ہی ادیب عالمی تناظر میں اردو ادب کی تشکیل و ارتقاء میں مصروف ہیں۔ فرانس کی رئیلزم کی تحریک، فطرت نگاری کی تحریک یا حقیقت نگاری کی تحریک جس نے بیسویں صدی کے ادب کو متاثر کیا۔ سر سید کے بعد علامہ اقبال نے بھی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے اردو ادب کو زندگی کی سچائی اور مسائل کو پیش کرنے کا ذریعہ بنایا۔ گلوبلائزیشن کے اثرات ہمارے ناولوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ پریم چند اور عزیز احمد کے ناولوں میں حقیقت پسندی موجود ہے۔ ادب میں سرئیلزم کا آغاز ہی گلوبلائزیشن کے اثرات کے طور پر ہوا۔ اس کے تحت پابند نظموں کی بندشوں سے آزادی کی طرف قدم بڑھایا گیا ایک نئی شعری دنیا وجود میں لانے کی کوشش کی گئی۔ اردو شاعری پر ٹی۔ اے ہیوم کے اثرات بھی گلوبلائزیشن کے تحت منظر عام

پر آئے۔ انیسویں صدی کے آخر میں علامت نگاری کی تحریک کا اثر شروع ہوا۔ جس نے یورپ میں مقبولیت حاصل کی۔ اردو شاعری میں اگرچہ پہلے سے ہی علامت نگاری کے اثرات موجود تھے۔ اقبال، فیض اور دیگر شعراء نے اپنی شاعری میں علامت نگاری کا استعمال کیا۔ اسی علامت نگاری سے مغرب میں تجریدیت کا آغاز ہوا۔ گلوبلائزیشن کا اصل مقصد ثقافتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا تا کہ ثقافتوں کا ادغام کیا جاسکے۔ اسی حوالے سے محمد عمر عباس کا کہنا ہے:

> "ہم پیچیدہ عالمی تبدیلیوں کے وقت میں رہتے ہیں۔ نئی سوچ کے رجحان نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ ان رجحانات اور تبدیلیوں کا سامنا ہمیں کئی شعبوں میں مختلف چیلنجوں کی صورت میں کرنا پڑ رہا ہے۔ ان جدید ثقافتی رجحانات میں عالمگیریت کا رجحان اور عمل بھی ہے۔ جو جدیدیت اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی کا نتیجہ ہے۔" (۴۱)

گلوبلائزیشن نے اپنا اثر شاعری پر بھی چھوڑا۔ شاعری خواہ کسی بھی دور سے تعلق رکھتی ہو یا کسی بھی تحریک سے وابستہ ہو، اس پر گلوبلائزیشن کے اثرات واضح محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ شاعرانہ موضوعات میں تنوع اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ آج دنیا بڑے پیمانے پر مواصلات کے آلات اور معلوماتی ابلاغی ٹیکنالوجی کی تیز رفتاری نے فاصلے سمیٹ دیے ہیں۔ دوریاں کم کر دی ہیں۔ اسی ٹیکنالوجی کے باعث دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے کے معاشرے اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ وہاں کے ادب اور اقدار کو جان سکتے ہیں یہ سب گلوبلائزیشن کے باعث ممکن ہوا ہے۔ زندگی کے بڑے نظریات سے لے کر معمولی معاملات تک اس کے اثرات سے نہ بچ سکے۔

گلوبلائزیشن کو اپنے عہد کے اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے مطابق اس کا آغاز قبل مسیح میں ہو گیا تھا۔ جب مشرقی ایشیا میں چین کی مختلف سلطنتیں اور ہندوستان میں موریہ اور گپتا کی حکومتوں کو فروغ ملا۔ یہ گلوبلائزیشن کا ابتدائی دور کہلاتا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب اسکندر اعظم نے پوری دنیا پر حکومت کرنے اور دنیا کو اپنے تابع کرنے کا خواب دیکھا۔ چونکہ یہ ابتدائی دور تھا اس لیے اس میں سیاسی اور عسکری غلبے کی شدید خواہش تھی اس کے بعد ثقافتی غلبے کی خواہش نے سر اٹھایا اور تب ہی گلوبلائزیشن کا دوسرا عہد شروع ہوا۔ جب یورپ نے سائنسی اور مخصوص فلسفیانہ تصورات کی بدولت نو آبادیاتی نظام کو تشکیل دیا۔ اس نظام کو صنعتی انقلاب سے مضبوطی ملی جس سے یورپ نے ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک پر قبضہ کر

لیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس کا تیسرا دور شروع ہوا۔ یہ دور باقی دو ادوار سے مختلف تھا۔ کیونکہ اس دور میں بظاہر تو نو آبادیات کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر گلوبلائزیشن کے مقاصد کا حصول جاری رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں گلوبلائزیشن میں شدت پیدا ہوئی۔ مختلف معائدے اس کی آڑ میں منظر عام پر آئے جو بظاہر تو یکساں معاشی قوانین کی حمایت کرنے والے تھے۔ مگر ان کا اصل مقصد صرف ترقی یافتہ ممالک کو فائدہ پہنچانا تھا۔ اسی لیے بعض لوگ گلوبلائزیشن کو امریکائزیشن بھی کہتے ہیں۔

گلوبلائزیشن اور معاصر شاعری کا کرتے ہوئے اگر غزل کا ذکر کیا جائے تو اس میں بھی نہ صرف معاصر شاعری بلکہ اردوئے ادب کے آغاز کی شاعری میں بھی ہمیں گلوبلائزیشن کے اثرات نظر آتے ہیں۔ غزل اگرچہ انفرادی ہے اس کا ہر شعر الگ اکائی رکھتا ہے۔ مگر یہ اجتماعیت کی بات بھی کرتی ہے۔ عہد حاضر میں غزل کی صنف پر بہار چھائی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا اس حوالے سے کہنا ہے:

> "غزل جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار رنگ و آہنگ، وزن و قار ایک دوسرے سے ملا۔" (۴۲)

غزل کے حوالے سے بہت سے سوالات ذہن میں آتے ہیں کہ غزل میں موضوعاتی لحاظ سے تنوع پایا جاتا ہے۔ اس میں ہمیں حیات کے مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ کائنات کے اسرار کا فسوں اس میں پوشیدہ ہے۔ یہ نئے زمانے اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کا رشتہ گلوبلائزیشن سے ہے؟ گلوبلائزیشن کی تعریفات سے اگر اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ گلوبلائزیشن عالمگیریت اور آفاقی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں موجود احساسات، نظریات اور جذبات ایسے ہیں جو عالمگیر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ قدیم شعراء کی شاعری میں بھی ہمیں گلوبلائزیشن یا عالمگیریت کا عکس ملتا ہے۔ میر درد کے نزدیک

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
آیا تو ہی نظر جدھر دیکھا

غالب کی شاعری میں عالمگیریت کا ذکر اس انداز میں ملتا ہے۔

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا جہاں پر خدا نہ ہو

اقبال اپنی شاعری میں عالمگیریت کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

شاد عظیم آبادی گلوبلائزیشن کی ذیل میں خود کو ابتر خیال کرتے ہیں۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفس وہ خواب ہیں ہم

ان اشعار کے حوالے سے بات کریں تو غزل کا رشتہ ہمیں گلوبلائزیشن سے جڑا نظر آتا ہے۔ حالانکہ اکثر شعراء اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب گلوبلائزیشن کا تصور بھی نہ تھا۔

ایک شاعر کی تخلیق میں خیالات منتشر صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ خیالات کسی بھی نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ معاشی، معاشرتی، ثقافتی، مقامی، ملکی و وطنی وغیرہ۔ یہی خیالات لفظوں کے فسوں میں ڈھل کر عالمگیریت کا اثر قبول کرتے ہوئے غزل کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اور پھر بعد میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آیا اس غزل میں یا اس شاعر کے خیالات میں عالمگیریت ہے یا نہیں۔ عالمگیریت چونکہ مختلف معاشروں کے آپس مربوط ہونے کا تیز رفتار عمل ہے۔ دنیا اب الگ تھلگ حصوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ عالمگیریت کی لپیٹ میں آئی دنیا میں سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی واقعات آپس میں جڑتے چلے جاتے ہیں۔ اس مسلسل ارتباط سے محسوس ہوتا ہے کہ دنیا سمٹتی جا رہی ہے اور اس سمٹاؤ کا لوگوں کو شعور بھی ہے۔ ادب کے دائرے سے نکل کر اگر گلوبلائزیشن کے اثرات کا جائزہ لیں تو اس کے منفی پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ اس سے آلودگی بڑھ رہی ہے۔ ایڈز کا مرض عام ہو رہا ہے۔ پوری دنیا میں ہر جگہ تیزی سے پہنچنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس لیے وبائی امراض بھی چند روز میں پوری دنیا میں پھیل سکتی ہیں۔ عالمگیریت نے عالمی سیاست کا مزاج بدل ڈالا ہے۔ اور ایک نئے سیاسی نظام کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ اس پر اعتراضات بھی کیے گئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ عالمگیریت سرمایہ دارانہ نظام کا تازہ ترین روپ ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس کے فیوض ناہموار ہیں۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اس سے طاقت ور کمپنیاں بین الاقوامی طور پر مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ اور اپنی من مانی کرتی ہیں۔" ادب پر عالمگیریت کے اثرات دو طرح سے ہیں: جدید شاعری اور جدید فکشن میں چاہے ان کا تعلق کسی بھی

جگہ سے ہو، ایسی مناسبت پائی جاتی ہے جو یکسانیت کے قریب ہے۔ ادب سب سے زیادہ ادب سے متاثر ہوتا ہے ۔ جدید ذرائع ابلاغ نے قربت کے نئے مواقع فراہم کیے ہیں۔"(۴۳)

(د) جدید فکری مباحث:

عہد حاضر میں جدید فکر کی اصطلاحات اور تکنیکوں کا سہارا لے کر جس طرح تخلیقی ادب کی تشریحات ،توضیحات اور تعبیرات کی جارہی ہیں اسے دیکھ کر عام قاری سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس فکری اصطلاحی مطالعہ میں ادب بذات خود کدھر غائب ہے؟ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں جتنے بھی تنقید کے نمائندگان گزرے ہیں ان میں سے کسی کا بھی تعلق براہ راست ادب سے نہیں رہا۔ عہدِ حاضر کے جدید فکری مباحث کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ سب کے سب مباحث مغرب کی دین ہیں۔ مغربی تنقید نگار ثقافتی مطالعات کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان میں ہمیں ادب کی حیثیت ثانوی نظر آتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مغرب میں تمام مباحث فکری اور سماجی ارتقاء کا حصہ بن کر سامنے آئے ہیں۔ جب کہ ہمارے ہاں یہی جدید مباحث راتوں رات آن دھمکے ہیں۔ ہمارے ہاں وہ احباب جو مغربی تنقید سے متاثر ہو کر اردو تنقید میں اضافہ کر رہے ہیں ان کی کوششوں نے اردو ادب میں تو کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ پہلے سے موجود تنقیدی ڈسپلن پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں جدید مغرب زدہ تنقید نے قاری کے ادبی ذوق کو بری طرح متاثر کیا۔ جدید مباحث سے مراد عہد حاضر کی وہ تمام مغربی اصطلاحات ہیں جو آجکل اردو ادب میں رائج ہو رہی ہیں ۔جن میں ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، تاریخیت، نو تاریخیت، مارکسیت و نومارکسیت، ردِ تشکیل کے ساتھ ساتھ تانیثیت جیسی اصطلاحات شامل ہیں۔

ساختیات : (Structuralism) سٹرکچرل ازم نے ادبی تنقید کے طور پر ۱۹۶۰ء میں اہمیت حاصل کی ۔ درحقیقت اس سے مراد کسی بھی شے کی ساخت کی بابت معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے۔

> "چیزوں کی ساخت کے بارے علم کو ساختیات کہتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے سے یہ اصطلاح لسانیات سے متعلق ہو کر رہ گئی ہے اس کے مطابق قاری اور مصنف کے خیالات و نظریات اور مہارت و اسلوب سے زیادہ "زبان کی ساخت" کو اولیت حاصل ہے۔"(۴۴)

ساختیات کے حوالے سے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ ادب پر جدید سٹرکچرل لنگوسٹکس ساختیاتی لسانیات کے اصولوں کو منطبق کرنے کی کوشش تھی۔ جدید لسانیات کا ذکر کریں تو فرڈی ننڈ سوسئیر کو اس کا

بانی مانا جاتا ہے۔ سوسئیر کے نزدیک زبان لسانیات کا ایک نظام ہے اور ہر نظام ایک الگ سگنی فائر سے تشکیل پاتا ہے۔ ناصر عباس نیر اپنی تحریر کردہ کتاب میں کہتے ہیں:

> "ساختیات کا بانی سوس ماہر لسانیات فردی نا سوسئیر ہے مگر ساختیات کی اصطلاح روسی، امریکی، ماہر لسانیات اور نقاد رومن جیک سن نے ۱۹۹۲ء میں سوئیر کے طریق مطالعہ کے لیے استعمال کیا۔"(۴۵)

سوسئیر نے لسانی ماڈل کے تین اہم مفروضات بیان کیے ہیں جو بعد میں ان کی پہچان بنے۔ اور انہیں ہی بعد میں لسانیات کے رہنما اصولوں کا درجہ دیا گیا۔ ان مفروضوں کے مطابق ہر ثقافتی مظہر ایک ساخت ہے۔ یہ ساخت اجزاء سے مل کر وجود میں آتی ہے مگر ساخت کبھی بھی اپنے اجزاء کا حسیاتی مجموعہ نہیں ہوتی۔ ساخت کے اجزاء عموماً سطح پر ہوتے ہیں مگر ساخت تہ نشین ہوتی ہے۔ مثلاً کسی بھی جملے کا ظاہری مفہوم اس کی ساخت کے اجزاء اور اس جملے کے اندر کی گہرائی ساخت کہلائے گی۔

کسی بھی ساخت میں تمام نشانات اور کوڈز ثقافت کی تشکیل میں نشانات جن اشیاء کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں نشانات کا رشتہ نہ منطقی ہے اور نہ ہی فطری نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس سے مراد زبان یا کوڈز کا نظام خارجی دنیا کی مادی حقیقت کو بیان نہیں کرتا بلکہ ساختیات کی حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم زبان کے ذریعے دنیا کا نہیں بلکہ لسانی ساخت میں لکھی گئی دنیا کا علم حاصل کرتے ہیں۔ زبان اور دنیا کے بیچ ایک پورا ثقافتی سسٹم (Institutionalized Strategies) حائل ہوتا ہے۔ زبان کی ساخت اور اس کے علم کے حوالے سے اردو ادب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ساختیات، پس ساختیات کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ یہ قدیم بحث گزشتہ چند دہائیوں سے ادب کا محور و مرکز رہی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے بھی اس پر قلم اٹھایا۔ ان کی معروف تصنیف "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" زبان کی ساخت اور علم پر بحث کرتی ہے۔ احمد سہیل نے بھی اس حوالے سے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ ان کی کتاب " ساختیات، تاریخ، نظریہ، تنقید " میں بھی ساختیات کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے۔

ساختیات میں لفظوں کے درمیان باہمی تعامل اور ہر لفظ کی مکمل ساخت کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے ۔یعنی صوتیے کو کسی بھی لفظ کی صوتی حقیقت معلوم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہی سب کچھ ہم لسانیات میں بیان کریں تو اس سے مراد لفظ کے اندر موجود ساخت کو معلوم کیا جاتا ہے۔ اور اس کی ساختی تبدیلی پر توجہ دی جاتی ہے۔

پس ساختیات:(Post Structuralism) پس ساختیات میں ہم لفظوں یا متن کے آخری معنی کو تلاش کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں پیش کیے گئے متن میں کثیر معنویت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اور پھر متن کے آخری معانی پر توجہ دی جاتی ہے۔ پس ساختیات میں کسی بھی متن کو آزادانہ پڑھا جاتا ہے اور ادب کو لا محدود سطح پر پیش کیا جاتا ہے، یعنی متن اپنے لکھے ہوئے معانی سے آگے کے معانی بھی بیان کرتا ہے اور پس ساختیات کا اصل مقصد بھی ان آگے کے معانی کی تلاش کا عمل ہے۔ یعنی متن میں پرت در پرت معنی تلاش کرنا۔ لہذا ہم کسی بھی متن کو بند متن نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ زبان متغیر ہے، ہر لمحہ بدلتی ہے۔ اس میں نت نئے الفاظ شامل ہوتے رہتے ہیں، ساختی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ساختیات انہی ساختیاتی تبدیلیوں کا جائزہ لیتی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ الفاظ یعنی زبان میں مرتب ہوتی ہیں۔

ساختیات کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ اگر کوئی زبان اپنا وجود قائم نہ رکھ سکی تو اس کی جگہ کوی دوسری زبان لے لے گی اور اس پر ساختی تبدیلیوں کا جائزہ لینے کا عمل شروع کر دے گی۔ ساختی تبدیلیوں کا یہ عمل ایسے ہی جاری و ساری رہے گا۔ ساختیات ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم تاریخی اور بین الثقافتی تناظر میں ایک منظم طریقے سے متون کو پرکھ سکیں۔ جب بھی ہم زیادہ سے زیادہ معروضی انداز نظر اپنانے کے خواہاں ہوں ، یا جب بھی ہم زمانی رکاوٹوں کو عبور کرنے یا روایتی آراء کی حد بندیوں سے نکلنے اور ثقافتی و مفاداتی تعصبات سے گریز اختیار کرنے کی جانب اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں تو ایسی صورت میں ساختیاتی طریقہ کار (ایک خاص ترتیب، باہمی ربط و تسلسل اور معنویت کے اصولوں کی تلاش کا عمل) خود بخود اہم اور غالب حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ احمد سہیل کا کہنا ہے: "یہ مظاہر کا تجزیاتی طریقہ عمل کا علم یا سائنس ہے۔ اس کا بنیادی مکالمہ "انسانی مظاہر " سے ہی ہوتا ہے۔ ساختیات کے مظہر میں ثنوئی اختلافات کا نظام موجود ہوتا ہے جس میں افتراقات کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اور ساخت سے معنویت / معنیات اخذ کی جاتی ہیں۔"(۴۶)

جدیدیت:(Modernism) معاشرے کی طرح ادب میں بھی تغیر کا عمل ہمیشہ سے جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تغیر زندگی کی علامت اور جمود موت کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔ جدیدیت عصر حاضر کی تنقیدی اصطلاح ہے۔ عصری شعور کے تحت تخلیق کیا گیا فن جدیدیت کے زمرے میں آتا ہے۔ کوئی بھی فن پارہ اپنی تخلیق کے بعد زمانے کے حساب سے اپنی قدر کا تعین کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے عہد میں اپنی تخلیق کی شناخت میں کامیاب ہو جائے، اور اس کا تخلیق کیا گیا ادب معاشرے کی ضرورتوں اور معیارات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرتب

کیا گیا ہو تو یہ جدیدیت کی ذیل میں آئے گا۔ ورنہ اس فن پارے میں جھنجھلاہٹ کے آثار پیدا ہوں گے، طبیعت پر بوجھل پن پیدا ہو گا اور اسے پڑھ کر قاری کو اس میں کوئی نادر یا اچھوتا خیال محسوس نہیں کرے گا۔

جدیدیت نے پرانے سست رو معاشرے کی نفی کرتے ہوئے شہری برق رفتاری کو اپنے مزاج کا حصہ بنایا۔ ایسا مزاج جس کو اپنا کر ترقی کی طرف گامزن ہوا جا سکے۔ اور تنزلی سے پیچھا چھڑایا جا سکے۔ جدیدیت زندگی سے گریز کا نام نہیں در حقیقت یہ حقیقت پسندی اور عقیدت پسندی کے خلاف ایک تحریک تھی، جس نے فن کو اس کی روایتی بندشوں سے آزاد کرایا۔ سہیل احمد خان کے نزدیک:

> "جدیدیت نے ماضی کو اس طرح رد کیا جس طرح رومانویت نے روایتی نقطہ ہائے نظر کو نشانہ بنایا تھا۔ فرق یہ ہے کہ رومانویت کے برعکس جدیدیت کو دنیا کہیں زیادہ یاس آمیز اور المناک نظر آئی۔ عہد حاضر کے معروف نقاد بھی جدید دنیا سے مایوس دکھائی دیتے ہیں۔"(۴۷)

ہر اس عمل کو جدید کہا جا سکتا ہے جس نے انسانوں کو، ان کی سوچ کو، ان کے طرزِ عمل کو، رہن سہن کے انداز کو بدل کر رکھ دیا ہو۔ اور یہ بدلاو ایسا ہو جو کہ روایت سے ہٹ کر ہو۔ "انسان کی بقا اور فلاح کے لیے اپنائے گئے تغیرات کا نام جدیدیت ہے۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی شے نہیں ہے بلکہ اس کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسانیت کا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اظہار کے انداز میں بدلاو آتا گیا مگر حقیقت میں ان سب کا مقصود و منشا ایک ہی تھا۔" (۴۸) جدیدیت دراصل حرکت کا ہی دوسرا نام ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنے کا نام جدیدیت ہے۔ یہ سکوت، ٹھہراو اور روایت سے نبرد آزما ہو کر آگے بڑھنے کا درس دیتی ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں جدیدیت کی اصطلاح ان سب تحریکوں پر محیط تھی۔ جو ثقافت، فنون لطیفہ، اور ادب کے میدان میں مدتوں سے استوار معیاروں اور روشوں کو پایہ استناد سے گرانا چاہتی تھی۔ انیسویں صدی کے ادب میں سب سے اہم کردار حقیقت نگاری کا تھا۔ جدیدیت پسند ادیب نے ادب کا اصل مقصد تغیر کو قرار دیا۔ جدیدیت در حقیقت تصور انسان پر قائم ہے۔ ایسی تحریک جس کی ابتداء نشاط ثانیہ کے انتقادی روح سے ہوتی ہے۔ انسان پرستی ہی اس تحریک کی فکری اور نظریاتی روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں جمالیات کے باعث انسان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کے نئے اور انوکھے پن کو ترجیح دی جاتی ہے، محمد علی صدیقی کا کہنا ہے:

> "جدیدیت کم از کم ادب، مصوری، اور موسیقی میں روایت کے "ہم" کے بجائے انا پرستانہ "میں" کے رجحان سے متصف ہوتی ہے۔ انیسویں صدی

کے نصف آخر اور جنگ عظیم اول سے ذرا پہلے یا اس کے دوران جدیدیت
بطور ایک رجحان کے ہمارے سامنے آئی۔اس امر پر اتفاق رائے ہے کہ
جدیدیت اتھارٹی کے خلاف ہے۔اور بسا اوقات وہ تعقل پسندی اور حقیقت
پسندی کی اتھارٹی کے خلاف بھی صف آرا ہو جاتی ہے۔"(۴۹)

اردوئے ادب میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں جدیدیت اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ناول ،افسانہ۔نثر،غزل، نظم غرض ہر صنف میں ہمیں اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔انسان کے باطنی خیالات سے ہٹ کر اس کا تعلق فکر و فلسفہ کے مختلف شعبوں سے بھی ہے۔جس سے انسان کی شخصیت کے انفرادی خدوخال کا تعین بھی کیا جاتا ہے۔اس سے قبل انسانی شخصیت میں تمام تر خوبیوں کو تلاشا جاتا تھا۔اس کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اس کو مکمل انسان کے روپ میں پیش کیا جاتا تھا۔جدیدیت اس کے خلاف انسانی شخصیت کی خامیوں کو اجاگر کرتی ہے۔انہیں بے نقاب کرتی ہے۔

بیسویں صدی کی اردو شاعری میں بھی جو موضوعات اختیار کیے گئے وہ جدیدیت کے قریب ترین تھے۔ان میں بھی فرد کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اس کی خامیوں کو اجاگر کیا گیا تھا۔شمیم حنفی کا کہنا ہے:

"بیسویں صدی کو اگر اردو شاعری کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقبال کی
شاعری جدیدیت کے قریب ہے۔اس نے فرد کے مسائل ،اس کی
صلاحیتوں اور اس کے باطن میں چھپی مخفی قوتوں کے ادراک کی بات ہے
۔اقبال کے یہاں مگر روایت بھی نظر آتی ہے اور جدیدیت بھی۔ان کے ہاں
دونوں رویے ملتے ہیں۔مگر جدیدیت روایت سے منہ موڑ کر چلتی ہے"(۵۰)

جدیدیت کی اصطلاح کے آغاز کا ذکر کریں تو مختلف ممالک میں اس کا آغاز مختلف سالوں میں ہوا۔امریکہ اور جرمنی جیسے شہروں کے سر اس کا سہرا جاتا ہے۔ٹیکنالوجی کے دور سے ہی اس کا آغاز ہوتا ہے۔"مشین دراصل ٹیکنالوجی کے عہد کا آغاز تھا۔بڑے شہروں کے مختلف مسائل کے درمیان جدید آرٹ پیدا ہوا۔ویانا،لندن جیسے شہروں میں یہ اصطلاح پروان چڑھی اور پھلی پھولی۔1980ء میں جرمنی میں جبکہ 1912ء میں امریکہ میں اس کا آغاز منظر عام پر آیا۔(۵۱)یہ ممالک چونکہ ترقی یافتہ تھے ان سے ہی ٹیکنالوجی منسوب کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جدیدیت بھی انہی سے شروع ہوئی۔

مابعد جدیدیت:(Post Modernism) جدیدیت کے بعد کی منزل یا بعد کے رویے مابعد جدیدیت کی ذیل میں آتے ہیں۔ مابعد جدیدیت ایسے رویے کا نام ہے جس میں سیاسی و سماجی کے ساتھ ساتھ تاریخی و ثقافتی صورت حال کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس میں ادب یا آرٹ پر پابندیوں کی نفی کی جاتی ہے۔ مابعد جدیدیت فرد کے زندگی اور سماج سے جڑنے کا عمل ہے۔ یہ ایک نئی صورت حال ہے اور بعض ناقدین کے نزدیک یہ جدیدیت سے انحراف بھی ہے۔ بعض ناقدین پس ساختیات اور ما بعد جدیدیت میں فرق نہیں کرتے۔ اور یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ مابعد جدید رویے کا تعلق معاشرہ اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے ہوتا ہے۔ معاشرتی مسائل، ثقافتی شکست وریخت، انسانوں کے آپس کے رویے سب مابعد جدیدیت کی ذیل میں آتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے:

> "دوسری جنگ عظیم کے بعد جو نئی ذہنی فضا بننا شروع ہوئی تھی اس کا بھرپور اظہار مختلف مفکرین کے ہاں ملتا ہے۔ گلبرٹ ادیر کا کہنا ہے کہ پس ساختیاتی مفکرین اس تبدیلی کے پہلے نقیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پس ساختیات اور ما بعد جدید میں حد فاضل قائم نہیں کی جاسکتی۔"(۵۲)

۱۹۶۰ء میں جدیدیت کے آغاز سے عوام میں خوشی کی نئی لہر پیدا ہوئی تھی۔ کہ اب خوشحالی کا دور دورہ ہو گا ۔سائنس کی ترقی نے بھی انسان کو سہانے خواب دکھائے تھے۔ مگر اس کے برعکس حالات خراب ہوئے ۔مسائل حل ہونے کی بجائے زیادہ گھمبیر ہوتے گئے۔ جنگ عظیم میں ہونے والی تباہی نے سب کے خواب توڑ کر رکھ دیے۔ عقلیت اور عقیدہ بے معنی ہو کر رہ گئے۔ ہر طرف بربادی کا سامان نظر آنے لگا۔ جدیدیت کی زد میں آکر نظریہ، مذہب، عقیدہ، رنگ، نسل اور قومیت غرض ہر شے الٹ پلٹ ہو گئی۔ انسانی وحدت کا وہ نعرہ جو جدیدیت نے لگایا تھا وہ پارہ پارہ ہو گیا۔ اشرف کمال کے نزدیک:

> "مابعد جدیدیت ساختیات کے بعد پس ساختیات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور پس ساختیات اور ردِ تشکیل سے ہوتی ہوئی سامنے آئی۔ نو تاریخیت اور تانیثیت کی تحریک بھی اسی ذہنی اور فکری فضا کے ساتھ سانس لیتی نظر آتی ہے۔"(۵۳)

مابعد جدید تنقید کی ایسی کسوٹی ہے جو مغرب میں ادبی تنقید کے علاوہ آرٹ اور فنون لطیفہ میں انقلاب رونما کر چکی ہے۔ مابعد جدیدیت دراصل جدیدیت کے خلاف رد عمل کا نام ہے۔ یہ بنیادی طور پر ثقافت کی تشریحات، فنون

لطیفہ،یعنی ادب،مصوری،موسیقی، فکشن، آرٹ، فن تعمیر،فلسفہ اور ادب میں نقل و حرکت کی پیائش اور معیار ناپنے کی کلید ہے۔ اسی کے باعث یہ تاریخی عناصر اور تراکیب کی تشکیل نو کی نشاندہی کرتی ہے۔اسی کی روشنی میں تنقید اور نظریاتی مسائل کی جانچ ایک طے کردہ پیمانے پر کی جاتی ہے۔اور معروضی عقلیت و منطق کی کسوٹی پر پرکھ کر ادبی مواد کے اہم اور غیر اہم ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔اس کا استعمال سب سے پہلے فرانسیسی مصور نے کیا۔مابعد جدیدیت فرانسیسی مصوری کے تاثرات سے اخذ کی گئی۔ ضمیر علی کا کہنا ہے کہ:

> "مابعد جدید انداز فکر ادبی متن کی معنی آفرینی اور اس کے تسلسل کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔یعنی متن کو معنی کی وحدت کے جبر سے نجات دیتا ہے۔بلکہ متن کو آزاد کرا دیتا ہے۔خاص طور پر اس معنویت سے جو مصنف سے منسوب کی جاتی ہے۔متن کے دروازے پر ہر لحہ نئے معانی دستک دیتے رہتے ہیں۔"(۵۴)

ما بعد جدید کثیر معنیات کا مفہوم رکھتی ہے۔اور یہ تخلیقیت سے پُر ہے۔اس میں ہمیں قاری اور متن کے درمیان تخلیقی تعلق نظر آتا ہے۔اور یہ تعلق صرف یک طرفہ نہیں ہوتا بلکہ فن کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتا ہے ۔مابعد جدیدیت نئے دور، نئی فکر، نئی سوچ، نئے عہد اور نئے ماحول کے تناظر میں انسان کو تلاش کرتی ہے ۔اس میں مصلحت اور سمجھوتے کے بجائے چیزوں کو شعوری طور پر سمجھنے کی بات جاتی ہے۔یعنی اگر یہ کہا جائے تو درست ہو گا کہ ما بعد جدیدیت نئے دور کے حوالے سے نئی تخلیقی صلاحیت اور تخلیقی فکر سے معمور ہے۔جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے حوالے سے دیوندر اسر کا کہنا ہے:"جدیدیت نے مذہب کے بجائے عقلیت ،برادری کے بجائے انفرادیت،روحانیت کے بجائے مادیت،مابعد الطبیعات کے بجائے سائنس و ترقی کو ترجیح دی۔جبکہ مابعد جدیدیت نے تاریخ اور سماجیات کے بجائے ثقافتی مطالعات کو زیادہ اہم قرار دیا۔اب ثقافت ڈسکورس کے متعلق ہے،اور اس سے وابستہ سوالات، جڑوں کی تلاش،ماضی کی بازیافت اور نسلی اور قبائلی تہذیبیں اکثر بحث کے مرکز میں آگئے ہیں۔"(۵۵)

تاریخیت:(Historicism) کسی بھی دور کے ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے اس دور کی تاریخ کا مطالعہ نا گزیر ہے۔کسی دور کے ادب کو سمجھنا اس وقت ہی ممکن ہو گا جب اس عہد کی تاریخ، تہذیب، ثقافتی اقدار اور رسم و رواج کا علم ہو اور انہی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے ادب کا مطالعہ کیا جائے۔کیونکہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔لہذا تاریخیت کے تناظر میں ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے ان مسائل کو حل کیا جاتا ہے

۔ تاریخ کیا ہے ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا سامنا ہر صاحب علم کو کرنا پڑتا ہے۔ ہر فرد کے ملک و قوم کی ایک تاریخ ہے جو انسان یاد رکھتا ہے اور نہ صرف یاد رکھتا ہے بلکہ اس سے سبق بھی لیتا ہے۔ جس طرح انسان اور تاریخ کا آپس میں گہرا تعلق ہے ٹھیک اسی طرح ادب اور تاریخ کا بھی تعلق ہے۔ ان کا بھی آپس میں گہرا رشتہ ہے ۔یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشرت کے ساتھ ساتھ ادب کا بھی تاریخی حیثیت سے جائزہ لیا جاتا ہے ۔ڈاکٹر سہیل احمد کے نزدیک:

> "تاریخیت ایک ادبی اصطلاح ہے ۔ جس سے مراد یہ ہے کہ ادب خواہ کسی بھی دور کا ہو اس کا جائزہ لیتے وقت اس دور کے تصورات ،رسمیات اور نقطہ ہائے نظر کا سیاق وسباق سامنے رہنا چاہیے۔ اعلیٰ درجے کے ادب کو کسی خاص عہد تک محدود نہیں رکھا جا سکتا ۔ تاہم ہر ادیب اور شاعر اپنے دور کی مخصوص معاشرتی فضا اور مخصوص عقلی رویوں کے تحت ادب تخلیق کرتا ہے۔" (۵۶)

تاریخیت کی اصطلاح کو سب سے پہلے جرمن فلسفی شلیگل نے استعمال کیا تھا اس نے اسے فلسفہ قرار دیا اس سے اس کی مراد وہ فلسفہ ہے جو تاریخ کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیتا ہو۔ وقت نے کروٹ لی اور یہ لفظ اپنے، معانی و مفہوم میں وسعت اختیار کر گیا۔ اب تاریخیت کو تاریخ کے مضبوطی سے بنے ہوئے فلسفے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر تاریخیت کی بابت یہ کہا جائے کہ تاریخیت ان عمومی رجحانات اور عالمگیر قوانین کی مظہر ہے جو تاریخ کے ارتقاء میں زیر سطح اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اور نہ صرف کردار ادا کرتے ہیں بلکہ تاریخ کو اس کی جزوی اور کلی صورت میں سامنے لانے کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں ۔"تاریخیت کے مقصد کی بات کی جائے تو اس کا اہم مقصد مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے ادب کو عہد حاضر کے پڑھنے والوں کے لیے زیادہ بامعنی بنانا ہے ۔ تاریخیت کا اہم فریضہ یہ ہے کہ ان تصورات اور اقدار کو سمجھا جائے جن کے ذریعے کوئی بھی ثقافت اپنا تسلسل برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔"(۵۷)ادب عہد حاضر سے تازہ سانسیں وصول کرتا ہے ۔ ہر ادیب اپنے ماحول اور معاشرے کے اثر کو قبول کرتا ہے ۔ ادیب اپنے زمانے کے مسائل اور رجحانات کو خوبصورت لفظوں اور لطیف پیرائے میں اپنے فن میں پیش کرتا ہے۔ لہذا کسی بھی ادیب کے ادب کو یا اس کے فن پارے کو ماننے کے لیے اس دور کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہے۔ پروفیسر اشرف کمال کا کہنا ہے:

"تاریخیت سوچنے کا ایک ایسا انداز ہے جس میں مخصوص عہد کا مطالعہ کیا جاتا ہے ،یعنی تاریخی دور کا، جغرافیائی جگہ کا یا مقامی کلچر کا۔ ساٹھ کی دہائی میں سامنے آنے والی ساختیاتی تنقید اور اس کے بعد پس ساختیات کے نظریے نے نئی تنقید کو اپنا ہدف بنایا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ساختیات ،پس ساختیات کے بعد ردِ تشکیل نے بھی زیادہ متن پر ہی زور دیا ہے۔ اس طرح لسانیات اور متن پر انحصار کرنے والی تنقید کے خلاف جس نے علم بغاوت بلند کیا وہ نئی تاریخیت کا نظریہ تھا۔"(۵۸)

اردو تنقید میں جب لوگوں نے اسے متعارف کرایا ان میں گوپی چند نارنگ، ناصر عباس نیر، ریاض صدیقی، وہاب اشرفی، الطاف انجم اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام زیادہ اہم ہیں۔

نو تاریخیت:(New Historicism) نو تاریخیت کی اصطلاح کا آغاز اسٹیفن گرین بلاک نے کیا۔ اسے اس کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں اس نے نو تاریخیت کی اصطلاح روشناس کرائی۔ اس حوالے سے اس نے بے شمار کتابیں اور مقالات تحریر کیے۔ گرین پلاٹ نے سب سے پہلے اس اصطلاح کا استعمال ۱۹۸۲ء میں A Power of Forms in the English Renaissanc کے تعارف میں استعمال کی۔ نو تاریخیت کے ماننے والے ادب کے خود مختاری کے تصور کو رد کرتے ہیں۔ نو تاریخیت ادب میں سیاسی اور سماجی حوالے سے کیے جانے والے احتجاج کو تلاش کرتی ہے اور اصل عناصر کو منظر عام پر لاتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے:

"نیو کرٹسزم اور رد تشکیل سمیت ان تمام رویوں کے خلاف جو فقط زبان یا فقط لسانیات یا فقط حیثیت پر زور دیتے ہیں رفتہ رفتہ ایک بغاوت رونما ہوئی اور نتیجتاً ادبی مطالعہ کا جو نیا طور سامنے آیا اسی کو نئی تاریخیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔(۵۹)

نو تاریخیت کی اصطلاح اگرچہ اردو میں نئی معلوم ہوتی ہے مگر عالمی ادب میں اس اصطلاح کا آغاز اسی کی دہائی میں ہو گیا تھا۔ اس کے لیے نو تاریخیت کے ساتھ ساتھ "ثقافتی مطالعات " کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ منتخب ادبی مقالات پر مشتمل کتاب "نو تاریخیت" جس کی ترتیب ڈاکٹر نسیم عباس احمر نے کی اس میں بھی نو تاریخیت کے حوالے سے کافی بحث موجود ہے۔ نو تاریخیت ان تمام سوالات کا جواب دیتی ہے اور تاریخ کے آئینے میں ادب کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ نو تاریخیت نے تاریخ کو بنیادی اور اساسی اہمیت دی۔ "ادب

اپنے زمانے کے ضابطوں اور طریقوں کے ساتھ ساتھ خاصا پیچیدہ اور تہ دار ہوتا ہے اور یہی پیچیدگیاں باہم مل کر کسی عہد کو منظر عام پر لاتی ہیں اس کی تصویر کشی کرتی ہیں۔یوں ہمیں نو تاریخیت کے پس منظر میں ساختیاتی فکر کی جھلکیاں نمایاں طور پر دیکھنے میں ملتی ہیں۔"(۶۰)

مارکسیت: (Marxism) کارل مارکس کے نظریات کو مارکسزم یا مارکسیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔یہ وہ نظریات ہیں جنہیں کارل مارکس نے اپنے مشہور ساتھی فریڈرک اینگلز کے ساتھ مل کر ترتیب دیا تھا اور پھر دنیا کے سامنے ان نظریات کو پیش کیا۔اصل میں یہ نظریہ دنیا بھر کے محنت کشوں کے حوالے سے تھا جس میں مزدوروں ، محکوموں اور زیر دستوں کو ان کے جائز اور مناسب معاوضے کے حوالے سے بحث کی گئی تھی۔در حقیقت مارکسیت کوئی سائنسی مفروضہ نہیں ہے بلکہ دیگر باقی علوم کی طرح انسانی ارتقاء کا علم ہے۔جس میں سرمایہ داری نظام کی مخالفت کا نظریہ پیش کرتے ہوئے اشتراکیت پر زور دیا گیا۔

> "مارکس نے ایک عمرانی نظریہ پیش کیا اس نے بتایا کہ ہر سماجی نظام اقتصادی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس میں واقع ہونے والے تغیرات، طریق پیداوار اور پیداواری رشتوں میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کے باعث رونما ہوتے ہیں۔مارکس کے خیال میں سماجی تبدیلیوں کے پیچھے کارفرما قوت محرکہ وہ جدوجہد ہے جو زبوں حال طبقے بہتر سماجی اور معاشی مستقبل کے لیے کرتے ہیں۔"(۶۱)

کارل مارکس کا ماننا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر خامی موجود ہے کہ یہ مسلسل اتار چڑھاؤ کے عمل سے گزرتا ہے اور بالآخر اپنے آپ کو ختم کر لیتا ہے۔اس کا ماننا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام مکمل طور پر غیر مستحکم نظام ہے یہ اصل میں جاگیر دارانہ نظام ہے، غلامی کا نظام ہے جو کئی صدیاں قائم رہتا ہے۔اس کے نزدیک طبقاتی سماج میں ہمیشہ حاکم اور محکوم کی جنگ جاری رہتی ہے۔ایک کشمکش کا عنصر قائم رہتا ہے۔پرولتاریہ طبقہ اس وقت تک اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے قابل نہیں ہو پاتا جب تک کہ وہ خود میں بورژوا کے خلاف ذہنی طور پر مضبوط نہ ہو جائے۔مارکسیت کے نظریات دنیا بھر کے ممالک میں محنت کشوں کے نظریات کے طور پر معروف ہیں۔کسی بھی معاشرے میں انقلاب لانے میں یہ نظریات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔"کارل مارکس کے یہی نظریات جب عام ہوئے تو ادبی دنیا میں ان نظریات کا بول بالا ہونے لگا۔ان کی بازگشت سنائی دینے لگی جس سے تنقید کا نیا دبستان وجود میں آیا یہ وہی دبستاں تھا جس کی بنیاد کارل مارکس اور اس کے پیروکاروں نے

رکھی تھی۔ یہ دبستان اشتراکی تنقید یا مارکسی تنقید کے نام سے معروف ہوا۔"(۶۲)انسانی تاریخ میں مارکسیت کی اہمیت اتنی مسلمہ ہے کہ اس کے بغیر انقلاب کا ذکر نا ممکن لگتا ہے۔ مارکسزم کے ماننے والوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ محض معاشی ماحول کو خوشگوار بنا کر انسان کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔ انسان کے خیالات، نظریات اور اعتقادات میں تبدیلی اسی طور ممکن ہے جب وہ معاش کی الجھنوں سے آزاد ہو یا اسے معاشی سکون میسر ہو۔ معیشت میں بہتری ہی دراصل مارکسیت کا اہم نصب العین تھا۔

> "روسی انقلاب کے قائد لینن نے مارکسی ادبی تنقید کا وہ تصور دیا جو انقلاب کے بعد روس میں تو سرکاری یا ریاستی نظریہ ادب بن گیا، لیکن پوری دنیا میں مارکسی نظریات کے فروغ نے ایک عرصے تک مارکسی تنقید کے اسی تصور کو عام کیا۔ اس تصور کے مطابق ادب نہ صرف زندگی کا عکاس ہے بلکہ مارکسی انقلاب کے لیے ہتھیار ہے۔" (۶۳)

نومارکسیت: (New Marxist) بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں مارکسیت ادبی بحث و مباحثہ کا حصہ بنی۔ اس کا بنیادی سروکار اگرچہ مارکسیت ہی ہے لیکن اب اس کے دائرہ کار میں غیر معمولی وسعت اور تنوع آگیا ہے۔ طبقاتی کشمکش ہر دور میں موجود رہی ہے اور مزدور طبقہ ہر عہد میں مارکس کے نظریات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ عہد حاضر میں جبکہ دنیا گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ایسے میں کارل مارکس کے نظریات روایتی تعبیر و تشریح کے بجائے عصر حاضر کے ثقافتی صورت حال کی متقاضی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک چونکہ ترقی پزیر ممالک سے ہر لحاظ سے آگے ہیں۔ ان کا علم، ان کی سائنس انہیں ترقی پزیر ممالک سے ممیز کرتی ہے۔ ترقی پزید ممالک کا پیداواری نظام آج بھی مارکسی فلسفے کو اپنانے اور مزدوروں کو جائز اور مناسب معاوضے کے حصول کے درپہ ہے۔ ایسے میں ضروری ہو گیا تھا کہ مارکسی فلسفہ کی تعمیر و تشریح کو عہد حاضر کی ثقافتی صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ممکن بنایا جائے۔ نتیجتاً کارل مارکس کے افکار و نظریات کی دانشوارانہ بصیرت افروز تشریح و توضیح شروع ہوئی جو ادب میں "نومارکسیت" کہلائی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے پس منظر میں مارکسی فلسفہ موجود ہے۔ دیکھا جائے تو نومارکسیت مارکسیت سے الگ کوئی نئی تنقیدی تھیوری نہیں ہے بلکہ اس کا اصل اصول مارکسیت ہے اور نومارکسیت اسی کی جدید ترین شکل ہے۔

تھیوڈور نومارکسی مفکرین میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ادب سماجی زندگی کا ایک خود مختار شعبہ ہے۔جو ادبی اصولوں کے تحت جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔وہ اس بات کے قائل ہیں کہ الفاظ متن میں اس طرح اپنے معانی کی وضاحت نہیں دے پاتے جس طرح وہ ادبی متن سے باہر دیتے ہیں۔

"چوں کہ ادب کا تخلیقی عمل مواد اور لفظ کے سماجی تناظر کی کایا کلپ کر دیتا ہے اس لیے سماجی حقیقت کو اس کی حقیقی شکل میں ادب میں تلاش کرنا عبث ہے۔اور اصولی طور پر غلط بھی ہے۔اسی خیال کی وضاحت میں ااڈور نو نے یہ موقف اختیار کیا کہ ادب اور حقیقت میں براہ راست رشتہ نہیں ہے۔"(۶۴)

نومارکسی مفکرین میں دوسرا نام "والٹر بنجامن" کا ہے۔انہوں نے تخلیق، تخلیق کار اور تخلیقی عمل کی وضاحت بڑھتے ہوئے ذرائع ابلاغ کے حوالے سے کی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ ذرائع ابلاغ نے ہمیں نئی دنیا کی سیر کرائی ہے ۔اس کی بدولت ادبی تخلیق مخصوص کی پہنچ سے نکل کر وسیع تر حلقے تک پہنچ گئی ہے۔جو کہ سیاسی آزادی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔"بنجامن کا کہنا ہے کہ میڈیا حقیقت کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر کے بورژوازی طبقے کا خاتمہ چاہتا ہے اسے جڑ سے اکھاڑنا چاہتا ہے اور اسی وجہ سے اسے سیاسی آزادی بھی مرحمت کرتا ہے۔"(۶۵)اردو ادب میں نومارکست کو نظریاتی طور پر متعارف کرانے والوں میں گوپی چند نارنگ، پروفیسر عتیق اللہ، ناصر عباس نیر اور ابوالکلام قاسمی شامل ہیں۔اس کے علاوہ آزاد جموں کشمیر سے ڈاکٹر الطاف انجم نے کرشن چند کی مارکسیت سے نومارکسی مطالعہ اور مارکسیت و نومارکسیت اور علی سردار جعفری کی تنقید نگاری کے عنوان سے دو مضامین اردو ادب میں شامل کیے ہیں جو نومارکسیت کی سمجھ میں معاون ثابت ہوں گے۔

ردِ تشکیل: (Deconstruction) ردِ تشکیل کی ابتداء ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔اس تھیوری کے نزدیک کوئی بھی متن اپنے اندر لامحدود معانی کا سلسلہ سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔جس طرح پسِ ساختیات میں ہم معانی کی تہہ تک جاتے ہیں اسی طرح ردِ تشکیل میں اس سے آگے کا نظریہ ہے اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک متن ایک ہی وقت میں کتنے مفاہیم سے لبریز ہے۔اور قاری کس طرح اپنی سمجھ اور دلچسپی کے حوالے سے اس متن کو کس رنگ میں بیان کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ردِ تشکیل نوعیت کے لحاظ سے کثیر الجہتی بیانیہ شمار ہوتا ہے اور اب تک اس حوالے سے سب سے زیادہ کام اس پر امریکہ میں کیا گیا ردِ تشکیل کے اولین بانیوں میں اہم نام جیکوئس دریدا کا ہے۔جو اپنے علم اور فلسفہ کے باعث کافی معروف ہے۔نوعیت کے اعتبار سے ردِ تشکیل کو ایسے فلسفے سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کو اپنا کر تقلید کی روش سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔اس تھیوری نے ۱۹۶۰ء میں اپنی حیثیت

منوائی۔ بیسویں صدی کی فکری، نظری اور فلسفیانہ تحریکوں پر ایک سنجیدہ رد عمل کے طور پر ردِ تشکیل نے اپنی اہمیت منوائی۔

ردِ تشکیل کو ایک ایسی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے متن کا مطالعہ ایک خاص زاویے سے، خاص نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اس سے متن کے نئے اسالیب دریافت ہوتے ہیں اس فلسفیانہ بحث کا آغاز فرانس سے ہوا۔ ڈاکٹر سہیل کا کہنا ہے:

> "ڈی کنسٹرکشن میں معانی کو لا محدود قرار دیا جاتا ہے ۔ متن کے اپنے تناظر (context) کے حوالے سے بے شمار معانی ہو سکتے ہیں کسی خاص تشریح کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ متن (signifiers) کا ایک کھیل ہے ۔ معانی کی کثرت کی وجہ سے یہ آزادانہ کھیل جاری رہتا ہے کہ معانی کی ایک تہہ کے نیچے اور کیا معانی ہیں۔"(٦٦)

اس اصطلاح کا استعمال اس کے بنیاد گزار دریدا نے ۱۹۶۷ء میں اپنی شہرہ آفاق تصنیف Of Grammatalogy میں کیا۔ جب دریدا نے زبان کی تفہیم اور متن کی تحریر کے بارے میں وضاحت کا آغاز کیا۔

> ''In a traditional philosophical opposition we have not a peaceful coexistence of facing terms but a violent hierarchy . One of the terms dominates the others, occupies the, commanding position. To deconstruct the opposition is above all, at a particular moment, to reverse the heirachy….Though a double gesture, a double science, a double writing , put into practice a reversal of the classical opposition and general displacement of the system.'' (٦٧)

ہمارے ہاں تقریباً دو دہائیوں سے جدید فکری مباحث پر لکھنے کا عمل رواج پا چکا ہے اردو میں اس کے اولین لکھاریوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر فہیم اعظمی، قمر جمیل، ناصر عباس نیر اور ڈاکٹر احمد سہیل کا ذکر آتا ہے۔ ان کے بعد نئی نسل کے نقادوں نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے ساتھ اس سلسلے کو جاری رکھا ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، بستانِ ادب لاہور ۱۹۸۸ء ص:۳۰

۲۔ ایضاص:۳۰

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء ص:۱۱

۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، نیا اور پرانا ادب، کتاب گھر، کراچی ۱۹۷۴ء ص:۲۳۴

۵۔ حسین محمد جعفری، ڈاکٹر، احمد سلیم (مرتبین) پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی ۱۹۸۷ء ص:۹

۶۔ ثوبیہ سلیم، ادب میں زندگی کا تصور، مشمولہ، روزنامہ دنیا، لاہور ۲۴ مئی ۲۰۱۳ء ص:۷

۷۔ سفیر اختر، ادب اور ادیب، دار لمعارف، واہ کینٹ ۱۹۹۸ء ص: ۱۰۵

۸۔ اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی نظریات اور اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن ۲۰۱۹ء ص:۱۶۷

۹۔ محسنہ نقوی، ڈاکٹر، ادب اور ادبی نظریات، مشمولہ جنگ، اسلام آباد ۳۰ مئی ۲۰۱۸ء

۱۰۔ مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی، ایوان اشاعت گورکھ پور، س ن، ص:۰۲

۱۱۔ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، ایضاً ص:۱۳

۱۲۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ادارہ اشاعتِ اردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۳ء
ص:۲۷

۱۳۔ ایضا۔ ص:۳۶،۳۵

۱۴۔ حسین محمد جعفری، ڈاکٹر، احمد سلیم (مرتبین) پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی، ۱۹۸۷ء
ص:۱۹،۲۰

۱۵۔ جمال نقوی، ترقی پسند تحریک، ادب اور سجاد ظہیر، ادارہ تزئین دانش کراچی، ۲۰۰۶ء ص:۱۱،۱۲

۱۶۔ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، ایضاً ص:۴۳

۱۷۔ راجا شکیل انجم، ادب زندگی ہے، پورب اکادمی، ۲۰۰۴ء ص:۲۰

۱۸۔ قمر رئیس، معاصر اردو غزل مسائل و میلانات، اردو اکادمی دہلی ۲۰۰۶ء ص: ۱۴،۱۵

۱۹۔ کلیم الدین احمد، عملی تنقید، کتاب منزل، پٹنہ ۱۹۶۳ء ص:۹

۲۰۔ سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۵ء ص:۱۵،۱۶

۲۱۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، القا پبلیکیشنز، لاہور ۲۰۱۴ء ص: 90

۲۲۔ فضل احمد خسرو، لمحہ موجود، سانجھ پبلی کیشنز ۲۰۱۲ء ص:۸۷،۸۶

۲۳۔ ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، بہزاد پبلشرز، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء ص:۳۴،۳۵

۲۴۔ سعادت سعید، شناخت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۷ء ص:۱۹

۲۵۔ مظہر حسین سید، سکوت، مثال پبلیشرز، فیصل آباد ۲۰۱۹ء ص:۹۱

۲۶۔ مظہر حسین سید، سکوت، ایضاً ص: ۱۳۴

۲۷۔ ضیاء الحسن، بار مسلسل، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۱۴ء ص: ۱۴

۲۸۔ ایضاً ص: ۹۵

۲۹۔ نواز شاہد، سایہ تاک، الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۶ء ص:۴۶

۳۰۔ ایضاً ص:۹۷

۳۱۔ راحت بدر، ڈاکٹر، جدید اردو غزل ۱۹۷۱ء سے ۲۰۱۰ء تک، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۱۱ء ص: ۱۰

۳۲۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء ص:۲۰

۳۳.Kalim uddin Ahmad,jami English Urdu Dictionary National Council for Promotion of Urdu new delhi,1996,pg.961

۳۴.Pearsall Judy,Oxford Dictionary of English 2nd Oxford University Press 2006 Pg.736

۳۵.The New Encyclopedia Britannica,vol,20 Chicago 2005,pg133

۳۶.Malcom waters,Globlization,Routeldge,New York 2001pg.05

۳۷.Javed masood,Sayed,Internationl Political Economy and Globlization,World Wide Scientific Publishing 2008,Singapore pg.204

۳۸۔ سید جعفر احمد، ڈاکٹر، گلوبلائزیشن، ثقافت اور ترقی پسند ادب، مشمولہ جنگ، ۲۷ فروری ۲۰۲۰ء

۳۹۔ یاسر ندیم، گلوبلائزیشن اور اسلام، دارالکتاب دیوبند، ۲۰۰۴ء ص: ۲۲

۴۰۔ ایضاً ص: ۲۷

۴۱۔ محمد عمر عباسی، گلوبلائزیشن اور اسلامی رجحانات اسلامی تناظر میں، مشمولہ، نوائے وقت لاہور ۳ مارچ ۲۰۲۱ء

۴۲۔ رشید احمد صدیقی، جدید غزل، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ ۱۹۶۷ء ص:۹

۴۳۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمن (مولف) منتخب ادبی اصطلاحات، آرٹ پریس، لاہور، ۲۰۰۵ء ص:۱۰۰

۴۴۔ انور جمال۔ پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۲ء ص:۱۱۶

۴۵۔ناصر عباس نیر۔ساختیات ایک تعارف، منتخب اردو مقالات، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء ص:۱۵
۴۶۔احمد سہیل۔ہیت پسندی، ساختیات اور نئی تنقید کے قطبی افتراقات اور انسکلات، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ۱۹۸۳ء ص:۱۰۷
۴۷۔سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۵ء ص:۱۳۶
۴۸۔افتخار حسین ڈاکٹر، جدیدیت، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، ۱۹۸۶ء ص:۷
۴۹۔محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، توازن کی جہات، ارتقاء مطبوعات کراچی، ۲۰۰۴ء ص:۳۶
۵۰۔شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء ص:۳۰۹
۵۱۔قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، جلد دوم، مکتبہ دریات کراچی، ۲۰۰۰ء ص: ۶۷
۵۲۔گوپی چند نارنگ، جدیدیت کے بعد، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۶ء ص:۱۲
۵۳۔ اشرف کمال۔ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۶ء ص:۹۴
۵۴۔ضمیر علی بدایونی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، اختر مطبوعات، کراچی، ۱۹۹۹ء ص:۳۶۵
۵۵۔دیوندر اسر، مابعد جدیدیت مشرق اور مغرب میں مکالمہ، مشمولہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، مرتبہ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء ص: ۱۱۳
۵۶۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، ص: ۱۰۸
۵۷۔ایضاً ص: ۱۱۰
۵۸۔ اشرف کمال۔ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، ایضاً ص:۱۳۵
۵۹۔ گوپی چند نارنگ، جدیدیت کے بعد، ایضاً ص:۱۲۲
۶۰۔نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، نوتاریخیت، مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱۸ء ص:۱۲۸
۶۱۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، (مرتبہ) کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۸ء ص:۲۲۱
۶۲۔ایضاً ص: ۲۲۱
۶۳۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، ایضاً ص:۱۳۱۔۱۳۰
۶۴۔ناصر عباس نیر، جدید اور مابعد جدید تنقید مغربی اردو تناظر میں، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۴ء ص:۱۴۲
۶۵۔عتیق اللہ، تنقید کی جمالیات، مارکسیت و نومارکسیت، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۱۱ء ص:۱۹۹
۶۶۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، ایضاً ص:۶۳

٦٧.Jonathan Culer:On Deconstruction,Routledge,London,1994 Pg:85

باب سوم:

معاصر ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے سیاسی و سماجی اثرات

(الف) معاصر ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے سیاسی اثرات:

انسانی زندگی جہاں حرکت سے عبارت ہے وہیں ادب بھی زندگی کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کو بعض اوقات زندگی سے عبارت مانا جاتا ہے۔ زندگی یا ادب اپنے آپ میں تلخ بھی ہے اور شیریں بھی۔ میٹھے لطیف جذبات کا عمدہ پیرائے میں اظہارِ خیال کرنا ادب کے شیریں اور لطیف ہونے کی دلیل ہے۔ وہیں دوسری طرف انسانی زندگی کے تلخ حقائق کا ذکر شاعری کی صورت میں کرنا زندگی کی تلخیوں کو اجاگر کرنے کے مترادف ہے۔ ادب ایسا فن ہے جس کے ذریعے کوئی بھی ادیب اپنے جذبات و افکار کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب زندگی کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور اس پر گہری تنقید بھی کرتا ہے۔ عہد حاضر میں جدید سے جدید تر ہوتی اس دنیا میں اصل اہمیت انسان کے سماجی ماحول اور اس کی سماجی زندگی کو حاصل ہے۔ اور کوئی بھی فنکار اپنے سماج سے رشتہ ناطہ ختم کر کے اپنی پہچان نہیں بنا سکتا۔ اپنی پہچان بنانے اور اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچا کر ان کی رائے حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ سماج سے رشتہ مضبوط رکھا جائے، کیونکہ سماج سے ہی نت نئے موضوعات جنم لیتے ہیں۔ اسی دھرتی میں رونما ہونے والے واقعات کو شاعری کی صورت میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ علی عباس جلالپوری "عام فکری مغالطے" میں کہتے ہیں:

> " ترقی پذیر معاشرے میں فن کار اور ادیب کے لیے اپنے اصل مقام وصف کا شعور ہونا لازم ہے۔ یہ شعور جتنا گہرا ہو گا اتنا ہی اس کا ادب اور فن معاشرے کے صحت مند تقاضوں کی تقویت کا باعث ہو گا۔ یہ شعور اپنے ہی گرد و پیش کے مسائل پر غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ غیر ملکی تحریکیں اس کے فروغ کا باعث نہیں بن سکتیں۔" (۱)

سیاست کسی بھی گروہ کی بنائی گئی اس پالیسی یا حکمت عملی کو کہا جاتا ہے۔ جس سے ان کی بالا دستی کو یقینی بنایا جا سکے اور انہیں اپنے گرد و پیش سے افضل گردانا جائے۔ لغوی اعتبار سے اس کی وضاحت کی جائے تو اس سے

مراد حکومت چلانا اور لوگوں کی اصلاح کرنا ہے۔ جبکہ اصطلاح میں اس سے مراد حکومت اور لوگوں کو اصلاح کے ذریعے ایک دوسرے سے جوڑنے اور انہیں شر اور فساد سے دور رکھنے کو سیاست کہا جاتا ہے۔ سیاست کی بہت سی اقسام ہیں۔ بادشاہت بھی سیاست کا سا نظام ہے اور مغربی جمہوریت بھی عہد حاضر کی سیاسی صورتحال کا نام ہے۔ زیر بحث موضوع میں ہم چونکہ معاصر شاعری پر مابعد نو آبادیات کے سیاسی اثرات کا جائزہ لیں گے تو اس ضمن میں عہد حاضر کے ترقی پسند شاعر کی شاعرانہ تخلیقات میں وہ نکتے اجاگر کیے جائیں گے جو عہد حاضر کی سیاسی صورتحال کی ترجمانی کرتے ہیں اور نہ صرف ترجمانی کرتے ہیں بلکہ مابعد نو آبادیات کے حوالے سے بھی ملکی سیاسی صورتحال کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی اثرات سے مراد نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد پیش آنے والی وہ تبدیلیاں اور باقیات ہیں جو عوام کے ذہنوں کو بدل کر ان کو نو آبادکاروں کو درست تسلیم کرنے پر آمادہ کرتے ہوں۔ نو آبادکاروں نے اپنے جانے کے بعد بھی اپنے اثرات مقامی آبادی پر چھوڑے خواہ وہ سیاسی نظام ہو یا سماجی، تعلیمی ہو یا معاشرتی ۔ ہر میدان میں ہمیں نو آبادکاروں کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ اور اب مابعد نو آبادیاتی دور میں معاصر شعراء کی شاعری سے ان نکات کو اجاگر کرنے اور عوام کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

فضل احمد خسرو: اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والے مایہ ناز شاعر فضل احمد خسرو معاصر شعراء کی فہرست میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ دونوں زبانوں میں شعر و سخن لکھتے ہوئے حق و صداقت کو اپنا شیوہ بنایا۔ ان کی تصانیف میں صبح صدا، شہر اذاں ،لمحہ موجود ،ہجر ہلونے، وفاواں عشق دیاں، گلزار یوسفی شامل ہیں۔ فضل احمد کا کسب معاش ہومیو پیتھی ڈاکٹری ہے۔ ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاعری کے شغل کو بھی جاری رکھا۔

معاصر شاعری کا ذکر کرتے ہوئے سیاست کا حال بیان کریں تو عہد حاضر کی سیاسی صورتحال بھی بد نظمی کا شکار ہے۔ سیاسی حالات ہی ملکی حالات کی بہتری اور ابتری کا باعث بنتے ہیں۔ سیاست اگر جمہور پر مبنی ہو گی تو عوام پر سکون اور خوشحال رہیں گے لیکن اگر سیاست میں طاقت کا غلبہ ہو تو عوام بھی پریشان اور بے حال ہو گی۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

" سنا ہے!
کہ طاقت ہے دنیا میں امن و امان کی بشارت
یہاں اس کے بل پر

سروں کی ہری کھتیاں کٹ رہی ہیں
کہ طاقت کا بدمست و خونخوار ہاتھی
مری ہستیوں کو
مری بستیوں کو
سرے سے ہی نابود کرتا ہوا دوڑتا جا رہا ہے" (۲)

سیاسی حالات کی ابتری کے عالم میں ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کر کے اور ظلم کا انکار کر کے ہی حالات کو بہتری کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں عوام میں بغاوت کا عنصر پیدا ہوتا ہے اور تبدیلی ہی در حقیقت بغاوت کا نام ہے۔ جب اپنے موجودہ رسم و رواج سے انکار کرتے ہوئے بہتری کی کوشش کے لیے رجعت پسندی سے انکار کیا جائے تو وہی در حقیقت بغاوت کہلاتی ہے اور اسی کا ذکر فضل احمد خسرو کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔

اپنے حصے کا ہمیں سچ بولنا ہے اس گھڑی
کل جو ہو گا کل اسے، اے یار! دیکھا جائے گا
خوف میں جینے سے بہتر ہے کہ مر کے جی اٹھیں
آج کر دیں ظلم کا انکار، دیکھا جائے گا(۳)

فضل احمد خسرو کی شاعری میں وطن عزیز کی بے چارگی کا ذکر، عزتوں کے لٹنے کا ذکر، وطن عزیز کی خاطر جان کا نذرانہ دے کر شہید کہلانے والوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایسے شہداء جو اپنی زندگیوں کو امر کر گئے۔ نو آبادیاتی دور کا ذکر کرتے ہوئے ملکی حالات کی ابتری کا رونا بھی ہمیں شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ فضل احمد خسرو بے بسی اور مفلسی کا ذکر بھی سرِ عام کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جب رب تعالیٰ نے ہر کسی کو رزق دینے کا وعدہ کیا ہے تو پھر آدم زاد ہی کیوں دوسرے کے رزق کو چھین کر اپنے حصے میں کرنا چاہ رہا ہے۔ اپنی ایک نظم "اے میرے رب سچے" میں وہ لکھتے ہیں:

آدم کے پھر رزق میں رازق نے کی تفریقیں
آدم زاد ہی مانگ رہا ہے آدم زاد سے بھیکیں (۴)

مابعد نو آبادیاتی دور میں یہ بات عام ہو گئی ہے کہ محنت کسی اور کی ہوتی ہے اور اجرت یا پھل کوئی اور لے جاتا ہے۔

محنت کس نے کی اور محنت کا پھل کس نے پایا
ہم نے کب بویا تھا مالک جو کچھ ہم نے پایا(۵)

مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھوک اور غربت عام ہو گی ہے مفلسی کے اس عالم میں انسان یہ بھول گیا ہے کہ کیا اس کے لیے بہتر ہے اور کیا نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

کب ہوتے ہیں پورے وعدے! اے میرے رب سچے
بھوک مٹانے کارن آدم بیچ رہا ہے بچے (۶)

مابعد نو آبادیاتی دور کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے فضل احمد خسرو عہد حاضر کے حاکموں کا ذکر کرتے ہوئے بے بسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عہد حاضر کے حکمران بظاہر حق و صداقت کے امین ہیں مگر ان کا باطن سانپوں سے بھی بدتر ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ ہیں معبدوں کے قدیم پجاری
یہ ہیں دیوتاؤں کے تاریک پہلو
انہیں اندھی راتوں سے نسبت بڑی ہے
چمکدار اور نرم و ملائم بظاہر
ابولہب جیسے یہ شعلہ بدن
مگر زہر ان میں ہے سانپوں سے بڑھ کر
بیان و بدیع سے مرصع زبانیں
کہ تلوار سے تیز تر کاٹ ان کی
مگر یہ زبانیں دلائل سے خالی
مگر یہ زبانیں حقائق گریزاں
ابوجہل جیسا تمسخر ہے جن میں
جہالت میں عریاں (۷)

فضل احمد خسرو چونکہ ترقی پسند تحریک کے ماننے والے شاعر ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ہمیں ترقی پسندیت کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ روش ندیم اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"ان کے شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے دل میں بے آسرا و زیر دست
طبقات اور ان کے مسائل کے حوالے سے کتنا درد موجود ہے۔ حتیٰ کہ وہ خدا

اور رسول سے بھی اسی درد کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں ان کی یہ دردمندی
شدت پسندوں کی طرح مخصوص عقیدے، جغرافیے اور رنگ و نسل کی پابند
نہیں بلکہ اس میں تمام کرہ ارض کے مظلوم شامل ہیں ان کی وسعت قلب و
نظر تمام انسانیت کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے۔"(۸)

شاعری کے حوالے سے ان کی دوسری تخلیق "شہر بے اذاں" جو کہ فروری ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آئی اس میں بھی ترقی پسند تحریک کے حوالے سے انسانی سماج کا ذکر بڑے بے باک انداز میں کیا گیا ہے۔ شاعر نے غزل اور تغزل کی مخصوص روایت کو برقرار رکھتے ہوئے شاعری تخلیق کی۔ اور اپنے فن سے ترقی پسند شعور کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ترقی پسند تحریک کا ذکر کیا جائے تو یہ تحریک سیاسی سماجی طور پر عوام کو بدلنے کی تحریک تھی عوام کے ذہنوں کو بدلنے اور جائز، مناسب معاوضے کے حصول اور حق کے حصول کی تحریک تھی۔ فضل احمد خسرو بھی اس تحریک سے وابستہ ایک ایسا کردار ہے جو معاشرے کے نبض شناس ہیں اور معاشرے کے ہر دکھ، درد کو گہرائی اور گیرائی سے محسوس کرتے ہیں۔ اقبال راہی لکھتے ہیں "خسرو نے معاشرے کی دکھتی رگوں پر اس قرینے سے ہاتھ رکھا کہ قارئین اس کے سحر سے نکل ہی نہیں سکتے۔ فضل احمد خسرو نے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھا ہے کہ ان کے ہر شعر میں زندگی موجود ہے۔ وہ تازگی، دلنوازی، خوشگواری، زندہ دلی اور عجز وانکسار سے بنے ہوئے آدمی ہیں۔ اور انہوں نے اپنی یہ صفات شعروں کے ذریعے ہم تک پہنچائی ہیں۔ محبت ان کے رگ وپے میں سمائی ہوئی ہے وہ سرسبز و شاداب طبیعت کے مالک ہیں۔"(۹) اس تخلیقی مجموعے میں بھی مابعد نو آبادیاتی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ خواہ وہ سیاست کے حوالے سے ہوں یا سماج کے حوالے سے، دونوں میں مابعد نو آبادیاتی اثرات اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں۔

سچ پہ تعزیر ہے بولنا جرم ہے
فیض، آدیکھ! لب کھولنا جرم ہے
عافیت ہے اسی میں کہ سچ مان لو
بات کو پرکھنا تولنا جرم ہے (۱۰)

ایک اور جگہ سیاسی حالات کی ابتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سنا ہے سبز رتوں کے جو خواب دیکھے گا
تمام عمر سلگتے عذاب دیکھے گا

ستم کی بات تو یہ ہے کہ ستم رسیدہ بھی
ستم گروں کی محبت کے خواب دیکھے گا (۱۱)

شہر بے اذاں کی بابت ذکر کریں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "اذاں" خسرو کے نزدیک فلاح کی طرف اور کامیابی کی طرف بلانے کا استعارہ ہے۔ ایسا استعارہ جو کامیابی کی نوید ہو اور جس کو اپنا کر معاشرے کے حالات میں سدھار کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ ما بعد نو آبادیاتی صورتحال میں معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو چکا ہے۔ سماجی گھٹن، معاشی ناانصافی اور تہذیبی اقدار کے ٹوٹ پھوٹ کا عمل معاشرے کو مذید بگاڑ کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ ایسے میں شاعر کی یہ تخلیق بگڑے معاشرے کو سنوارنے کی ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔ جس میں ہمیں نا انصافی، گھٹن اور بغاوت نظر آتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک آس، امید اور خوشی کی سی کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے کہ حالات سدھرنے والے ہیں معاشرہ پھر سے امن کا گہوارہ بننے والا ہے اور حالات پھر سے اپنی بہترین ڈگر پر قائم ہونے والے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

آزمائش کی گھڑی میں صبر کرنا چاہیے
تھک کے آخر ظلم کا طوفان ٹھہر جانے کو ہے
آؤنا! پھر سے سجاؤ محفلِ جور و جفا
جسم و جاں سے لذتِ تیغ و تیر جانے کو ہے
آنے والا کل ہمارے خواب سے ہے شادماں
موسمِ کرب و بلا خسرو گزر جانے کو ہے (۱۲)

شہر بے اذاں کی شاعری میں ہمیں ملکی سیاسی حالات کی بدحالی کا نوحہ ملتا ہے۔ آزادی سے قبل اور بعد کے حالات کے حوالے سے فضل احمد خسرو بہت خوبصورتی سے ذکر کرتے ہیں کہ آزادی سے قبل انگریزوں کا غلبہ تھا اور آزادی کے بعد ذہنی طور پر ہم اپنے آپ کو ان کے غلام اور ان سے کم تر تصور کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اندھی کالی رات کا ذکر بظاہر ہمارے عہد کی ناانصافی کا ذکر ہے۔ عابد حسن منٹو کا کہنا ہے:

"اندھی کالی رات ہمارے عہد کے اس سماجی اور تہذیبی آشوب کا استعارہ ہے جو یوں تو کم و بیش ساری تیسری دنیا پر مسلط ہے پر ہمارے اپنے وطن میں آزادی کی منزل پر پہنچنے کے بعد ہمارا مقدر بنی ہے۔۔۔۔ آزادی سے پہلے اس اندھی کالی رات کا حوالہ غیر ملکی سامراجی تسلط تھا۔ سامراج جس کا مقصد

ہی نو آبادیات کو پسماندہ اور محکوم رکھنا تھا تا کہ یہاں کے وسائل کا استحصال
کیا جائے اور یہاں کی افرادی قوت کو اپنی سلطنت کو دوام بخشنے کے لیے
استعمال کیا جاسکے۔" (۱۳)

عہد حاضر کے حکمران اور سیاستدانوں کا ذکر وہ بڑے بے باک انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے لہجے میں بغاوت کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ وہ معاشرتی اور سیاسی حالات سے نالاں دکھائی دیتے ہیں اور انہی حالات کو وہ بے خوف و خطر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں میں استعمال کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

حکمرانوں کا مزاج اپنی جگہ
اور لہو کا احتجاج اپنی جگہ
جانے پھر کیوں بھوک بستی کھا گئی
تھے ہوا، پانی، اناج اپنی جگہ
وقف کر دی ہم نے ساری زندگی
پھر بھی باقی ہے خراج اپنی جگہ (۱۴)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

پھولوں پر کیا بیت گئی
کانٹے بھی پر نم دیکھے ہیں
ذرے ذرے کے سینے میں
میں نے پھر ماتم دیکھے ہیں (۱۵)

فضل احمد خسرو کی شاعری میں ہمیں عہد حاضر کے سیاسی حالات اور حکمرانوں کی کیفیت کا بیان ملتا ہے کہ کس طرح وہ عوام کا خون پسینہ نچوڑتے ہوئے ان پر اپنے احکامات لاگو کرتے ہیں کہ وہ اف تک نہیں کر سکتے اور خاموشی سے اس ذلت اور رسوائی کی زندگی کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔

نواز شاہد: نواز شاہد ایک ترقی پسند دانشور اور کارکن کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری تخلیقی سطح پر ان کے اسی فکری و عملی زاویے کا ایک توانا اظہار ہے۔ اپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے تخلیقی رویے جس جمالیاتی قوت اور چاو کے ساتھ غزل میں ابھرتے ہیں وہ قاری کو اپنے سحر میں لے لیتے ہیں ۔ان کا کہنا ہے کہ مابعد نو آبادیاتی اثرات نے نہ صرف ہمارے سماج کو متاثر کیا ہے بلکہ اس کا براہ راست اثر

ہماری سیاست میں بھی نظر آتا ہے۔ سیاسی حالات کی ابتری کا واضح اور بین ثبوت یہی مابعد نو آبادیاتی صورتحال ہے۔ پاکستان کی سیاست میں گلوبل لبرل اکانومی اپنے استحصالی جواز کے لیے مابعد جدید فکر اور میڈیا کا استعمال اپنی مرضی سے کر رہی ہے۔ سیاسی حالت کی خرابی کی بڑی وجہ یہی سامراجی آلات و نظریات کا چیلنج ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نظام کے تحت ہماری سیاست بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ نواز شاہد نے انہی سیاسی حالات کی ابتری کا ذکر اپنی شاعری میں برملا کیا ہے۔

سیاسی حالات کے بدلنے کی ایک آس باغیانہ رویے کو اپنانا بھی ہے۔ باغیانہ رویے کو اپناتے ہوئے اپنے خیالات سیاسی حکام تک پہنچا کر ہی سیاسی حالت کی ابتری کے خلاف آواز اٹھائی جا سکتی ہے۔ حاکم وقت کے جبر اور وحشت سے گھبرا کر خاموش ہو جانا نواز شاہد کی شاعری میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ ان کے باغیانہ رویے کا ذکر ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔

میری آواز مر نہیں سکتی
میں منافق کا ہم زباں نہ رہا(۱۶)
ہم نے اس دور میں نمو پائی
جس میں جینا کمال ہے پیارے(۱۷)

سیاست کی بگڑتی صورتحال اور حکام وقت کے خلاف نبرد آزما ہونے کا ذکر ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے ۔اور اسی کی تلقین وہ دوسروں کو بھی کرتے ہیں۔

پھر سے حق بات چھپانے کا ہنر عام ہوا
پھر کسی شہر میں مصلوب ہوا ہے کوئی(۱۸)

نواز شاہد عصر حاضر کے وہ شاعر ہیں جو حاکم وقت کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوتے ہیں اور نا انصاف حکمرانوں کے ظلم کا سورج غروب ہونے کا ذکر بڑی بے باکی سے کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں یہی بے باکی ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ اپنی نظم آگ میں وہ لکھتے ہیں:

جاؤ فرعون کو میرا پیغام دو
نوع انساں کی تقسیم
مری خدائی کی تذلیل ہے
میرا خاموش رہنا

ترے آمرانہ رویے کی ترسیل ہے
ساحروں، کاہنوں سے
حقیقت کا احوال سن
ترے دربار کی کہنہ رسیوں کا بل
اژدھا کھا گیا
تیرے غرقاب ہونے کا وقت آ گیا(۱۹)

حاکم وقت کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے وہ مایوس اور پریشان ہیں کہ امیر وقت نے غریبوں اور محکوموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہنستی، مسکراتی زندگیاں تباہ و برباد ہو کر رہ گئیں۔ بستے آباد شہر اجاڑ اور ویران ہو کر رہ گئے۔ شہروں کی ویرانی اور اس کے باسیوں کی پشیمانی حاکم وقت کے ظلم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

شب کے خیمے جلا دیے اس نے
میرے سپنے جلا دیے اس نے
ہنستا سورج لہو میں ڈوب گیا
دن سہانے جلا دیے اس نے
جن سے ملتی تھی زندگی کی بھیک
وہ دریچے جلا دیے اس نے (۲۰)
کیا ہوئیں میرے شہر کی گلیاں
جیسے کانٹوں پہ چل رہا ہوں میں (۲۱)
عجیب دہشت کے سائے چار جانب
مگر جینے کی جراءت کر رہا ہوں (۲۲)

ملکی سیاست پر مابعد نو آبادیاتی اثرات اب تک قائم ہیں۔ اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ ایسے میں شاعر یا ادیب کا ہی یہ فرض ہے کہ ان کے خلاف لکھنے کی جسارت کریں۔ مگر بعض اوقات قلم کی طاقت بھی وہ زور نہیں رکھتی جو روپیہ پیسہ رکھتا ہے۔ قلم کو زر کے زور سے خرید لیا جاتا ہے۔ اور ایسا ہی مابعد نو آبادیاتی دور میں ہوا۔ قلم کی طاقت کا اثر آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ حاکم وقت نے اسے زر اور دولت کے زور سے خرید لیا ہے۔ مگر بعض اوقات حالات ویسے ہوتے نہیں جیسے نظر آتے ہیں۔

اب قلم کی سیاہی بکنے لگی

اب بڑی روشنی کمالوں گا(۲۳)

مگر بعض جگہوں پر وہ قلم کی طاقت کا اثر قائم رکھتے ہوئے روایت سے انحراف کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

میں نہیں مانتا روایت کو
میں نئے دور کا لکھاری ہوں(۲۴)

نواز شاہد کی شاعری کے حوالے سے روش ندیم کا کہنا ہے:

" چونکہ ہمارے ہاں سیاسی سماجی ڈھانچہ ابھی تک کسی بھی بنیادی تبدیلی سے دوچار نہیں ہوا اس لیے روایت اور کلاسیکیت کا ثقافتی، مذہبی اور فکری اثر بھی ابھی تک مجموعی طور پر بہت گہرا ہے۔ اسی لیے نواز شاہد کا کلاسیکی ادبی رجحان سے خود کو جوڑنا گویا وسیع تر ابلاغ اور جڑت کی حکمت عملی کا رویہ ہے۔"
(۲۵)

مابعد نو آبادیاتی دور کے اثرات ہمارے شہروں میں، ہماری گلیوں میں جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ شہروں کی رونقیں قائم نہ رہی اور گلیوں میں ویرانی کا راج ہوا۔ ہر طرف دہشت، وحشت اور خوف کا پہرا ہے۔ دہشت گردی کے حوالے سے اپنی ایک نظم میں وہ لکھتے ہیں۔

رات کے منظر میں لپٹیں شہر کم آباد کی تنہائیاں
نیل کی گہرائیاں
دور تک جاتی ہوئی خالی سڑک کے
اِس طرف بھی
اس طرف بھی
اپنی اپنی روشنی کے سائے میں سہمی ہوئی سرگوشیاں
آسماں کی وسعتوں میں
ایک آدھا چاند اپنے آپ سے روٹھا ہوا
وقت کے سیلاب میں ٹھہرا ہوا(۲۶)

وقت کی رفتار اور گہما گہمی کا ذکر کرتے ہوئے پشیمان ہیں کہ کسی کو دوسرے کے دکھ درد کی فکر نہیں۔ نفسا نفسی کے عالم میں انسانوں کو کتوں سے بھی ارزاں کر دیا گیا ہے۔

ادھر دیکھ لو

یہاں بم دھماکوں نے کرب وبلا کی مناظر کشی
بڑے تیز رنگوں کا وہ سحر کاذب کیا ہے
کہ اجسام والقا کے معنی کی قیمت بھی
کتوں کی قیمت سے کم تر لگی(۲۷)

وہ امرائے وقت کو ان کے عہد وپیماں یاد دلاتے ہیں جس میں انہوں نے عوام کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کا حصول یقینی بنایا تھا۔ مگر وہ بنیادی ضروریات کی فراہمی کا وعدہ نہ پورا ہونا تھا سو نہ ہو سکا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور کی سیاسی حالت کا ذکر کرتے ہوئے نواز شاہد عوام کی تکالیف پر نوحہ کنعاں ہیں کہ وہ کس مجبوری کے عالم میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں ان سے کیے گئے ان کے وعدے وفانہ ہو سکے۔ اپنی ایک نظم "تھوڑا سا آسماں" میں لکھتے ہیں:

پیٹ کی آگ سے کتنے گھر جل گئے
اور شاعر
کہ تتلی کے نازک پروں کی
کہانی سناتے ہوئے
دل کی تکالیف میں مبتلا ہو گیا
اپنی دائیں ہتھیلی کی الجھی لکیروں کی
تحریر میں کھو گیا
تھوڑا سا آسماں
روٹی، کپڑا، مکاں، ایک نیا سلسلہ اذاں(۲۸)

نواز شاہد موجودہ ملکی صورتحال سے بھی نالاں ہیں۔ وہ اس سیاسی و سماجی حالت کی ابتری کا ذکر کرتے ہیں اور اس بات کا اظہار برملا کرتے ہیں کہ یہ دیس تو وہ دیس ہی نہیں جس کا خواب ہم نے دیکھا تھا یا جس کے لیے قربانی دی گئی تھی۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں ہم نے اپنے وطن کو ابتر حالت میں دیکھا ہے۔ جس کو جتنا بھی بہتری کی طرف لایا جائے مگر اس میں ناکامی ہی دیکھنے میں ملتی ہے۔ کیونکہ ہمارے اپنے حکمراں دلی طور پر تبدیلی کے خواہاں نہیں ہیں۔

مظہر حسین سید: یکم جولائی 1977ء میں ہری پور خیبر پختونخواہ میں پیدا ہوئے۔ تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں راولپنڈی میں سکونت پزیر ہیں۔ ان کی معاصر ترقی پسند شاعری پر ہمیں سیاست کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سیاست جمہوریت اور آمریت کے تحت وجود میں آتی ہے۔ جمہوریت کے تحت منظر عام پر آنے والی سیاست عوام دوست ہوتی ہے اور عوام کے دکھ سکھ کا خیال رکھتے ہوئے فیصلے کرتی ہے۔ جبکہ آمریت پر مبنی سیاست صرف ذاتی مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عوام کی خواہشات کا استحصال کرتی ہے۔ عوام کو مجبور اور بے کس کر دیا جاتا ہے اور حالات ایسے پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ عوام حکومت کی بات ماننے اور ان کے لاگو کیے گئے اقدامات اور نظریات کو اپنانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نظام میں سیاست میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ثقافت، تہذیب و تمدن، تعلیم اور رسم و رواج پر اجارہ داری قائم کرنے کے بعد نو آبادکاروں نے ایسے اقدامات کیے کہ عوام کو کسی بھی طور سکون یا چین میسر نہ تھا۔ سیاسی حکمران اپنی سیاست کے نشے میں چور ماتحت عوام کا استحصال کرتے رہے اب یہ استحصال ذہنی، جسمانی، جذباتی، معاشی، معاشرتی یا نظریاتی ہر طرح کا تھا۔ عوام کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق نہ تھا۔ کوئی بھی فیصلہ اپنی منشا یا اپنی سہولت کی خاطر وہ نہیں کر سکتے تھے۔ حکمران اپنی طاقت کے بل بوتے پر غریب اور محکوم عوام کا استحصال کرتے رہے اور غریب اور محکوم عوام غربت کی چکی میں پستے ہوئے طاقت ور حکمرانوں کا لقمہ بننے پر مجبور ہوتی رہی۔ وہ لکھتے ہیں:

شمار عیب نہیں ہے یہ بے نیازی حسن
یہ نشہ ہے کہ جو ہوتا ہے اقتدار کے ساتھ (۲۹)
خواب کیا کیا تھے مگر اب تو غنیمت ہے یہی
سانس لینے کو جو تھوڑی سی ہوا مل جائے (۳۰)
جو کچھ نہیں تھا وہی اب خدا بنا ہوا ہے
مگر میں چپ ہوں کہ اک سلسلہ بنا ہوا ہے (۳۱)
یہ تو سنتی ہے فقط درہم و دینار کی بات
یہ ہے دنیا اسے کردار نہیں چاہیے ہے (۳۲)

کسی بھی ملک کی سیاسی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے وہاں کی عوام کے مسائل و مصائب کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایک پسماندہ اور ترقی پذیر ملک میں بنیادی ضروریات کا حصول ہی عوام کا اولین مسئلہ ہے۔ بنیادی

ضروریات کے حصول کے بعد ہی کوئی ملک اپنی عوام کو خوشحالی کی طرف راغب کر سکتا ہے۔ مقتدا منصور کا کہنا ہے:

"چونکہ مسلمانوں کی سرشت میں جمہوریت نہیں ہے اس لیے انہیں جمہوری معاشروں میں اقلیتوں کے حقوق اور فرائض کے بارے میں آگہی نہیں تھی ۔ماضی کی سوچ میں مقید مسلمان جاگیر داری نظام کو اپنی سیاسی و سماجی قوت کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کی اکثریت غربت و افلاس کی چکی میں پس رہی تھی اور صرف چند فیصد مسلمان جاگیر دارانہ معاشرت سے فیضیاب ہو رہے تھے۔"(۳۳)

مظہر حسین سید نے بھی اپنی شاعری میں سیاسی نظام کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے عوام کی مفلسی اور غربت کا ذکر کیا ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے باوجود ہم غربت اور افلاس سے پیچھا چھڑانے میں ناکام رہے ہیں ۔وہ لکھتے ہیں:

کسی طرح بھی نہ آسیب مفلسی اترا
دعا بھی کی گئی، تعویذ بھی پلایا گیا(۳۴)

نو آبادیاتی دور اگرچہ ختم ہو گیا ہے۔ نو آبادکار چلے گئے مگر جاتے جاتے اپنے اقدار و روایات چھوڑ گئے ہیں کہ ہم آزاد ہونے کے باوجود آج بھی مفلسی اور بیچارگی کے عالم میں غلامی کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

'یہ لوگ عہد غلامی میں جی رہے ہیں ابھی
انہیں تو یہ بھی بتانا ہے کہ زندگی کیا ہے(۳۵)

مابعد نو آبادیاتی سیاست میں حق بات کہنے کی پاداش میں سزائیں دی گئیں۔ عوام اپنے حق کے لیے آواز بلند نہیں کر سکتی تھی۔ اور بالفرض کوئی اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتا تو اسے نقصان پہنچایا جاتا اور اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ ایسے عالم میں لوگوں نے چپ کو ہی غنیمت جانا اور اپنے آمروں کے رعب و دبدبے کو چپ چاپ برداشت کرنے پر مجبور ہو گئے اور نہ صرف مجبور ہوئے بلکہ اسی کو اپنی بقاء سمجھ بیٹھے۔

ہونٹ سی لوں تو یہ ممکن ہے کہ مہلت مل جائے
کھولتا ہوں جو زباں، قتل کیا جائے گا
مجھ کو آثار بتاتے ہیں کہ یہ بستی ہے جہاں

مرد وزن، پیر وجواں قتل کیا جائے گا(۳۶)
امیر شہر سے سچ بات بر ملا کی ہے
غریبِ شہر نے کتنی بڑی سزا کی ہے(۳۷)

نو آبادیاتی نظام میں حق کے حصول کے لیے آواز بلند کی گئی تو ان کا قتل عام شروع ہوا۔ دہشتِ گردی کو فروغ ملا، لوگوں کی زندگیوں کو سرِ عام ختم کیا گیا۔ ایسے عالم میں ہر طرف دہشت گردی کا بول بالا ہوا، سیاسی حکمران اپنی سیاست کے نشے میں دھت دہشت گردی پر قابو پانے کی بجائے اس کا چلن عام کرنے لگے۔ حکمرانوں کی بے حسی کے باعث دہشت، وحشت اور ڈر نے جنم لیا اور لوگ مجبور اور بے بس ہو کر رہ گئے۔ مظہر حسین سید انہی خیالات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

خود کشی بھوک میں کرنے کی ضرورت کیا ہے
جب دھماکوں میں شہادت کی سہولت ہے مجھے(۳۸)

باری تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تو زمین پر تو مر گیا ہوتا
شکر کر تو ہے آسمانوں میں(۳۹)
مسجدیں ہو رہی ہیں خون میں تر
جانے کیا بھید ہے اذانوں میں(۴۰)
وہ پھول بیچنے نکلا تھا صبح بستی میں
پھر اس کے بعد کبھی لوٹ کر نہیں آیا(۴۱)

ایسے دہشت اور وحشت کے عالم میں اس سیاسی نظام کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے شعراء اور ادیب منظر عام پر آئے۔ جنہوں نے نہ صرف اپنی تحریروں سے حکومت وقت کے خلاف لکھا۔ مگر ان میں چند لکھاری ہی ثابت قدمی کا مظاہرہ کر سکے۔ کیونکہ جہاں روپے پیسے اور زر کا زور ہو وہاں ہر چیز زر کی بنیاد پر خریدی جاتی ہے۔ لوگوں کا قلم بھی طاقت کے زور پر خرید لیا گیا۔ ان حالات کی خرابی کا اصل ذمہ دار زر دار اور حکمران طبقہ تھا۔

کھل کے سچائی کا اظہار نہیں کر سکتے
ہم جو کرتے ہیں وہ اخبار نہیں کر سکتے(۴۲)
جو بے وفا تھا اسی کی طرف اشارہ کیا

کنایتاً اسے دنیا نہیں کہا میں نے (۴۳)

معاصر ترقی پسند شاعر مظہر حسین سید اپنی انہی تحریروں کے باعث عوام میں مقبولیت حاصل کرتے گئے ان کے ہم عصر بھی ان کے بے باکی کے معترف ہیں۔ناصر علی سید کا کہنا ہے: " وہ ایک خود آگاہ شاعر ہے۔اسے معلوم ہے کہ اس کٹھور، خود غرض اور سچ کی دشمن دنیا میں اپنے ہونے اور بولنے کی قیمت "لاپتا" ہونے کی صورت میں دینا پڑتی ہے۔" (۴۴) مظہر حسین سید اپنی انہی بے باکانہ تحریروں کے باعث عوام میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں وہ اپنی بات حکمرانوں تک پہنچانے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے۔

روش ندیم : معروف ترقی پسند مفکر، شاعر، ادیب، نقاد، محقق اور پروفیسر روش ندیم کی تخلیقات میں بھی ہمیں مابعد نو آبادیاتی عناصر واضح انداز میں دیکھنے میں ملتے ہیں۔ان کا تعلق درس و تدریس سے ہے۔شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے معلمانہ پیشہ بھی اپنا رکھا ہے اور گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اصغر مال راولپنڈی سے منسلک ہیں آپ بطور وزیٹنگ فکیلٹی اسلامک انٹرنیشنل یونی اسلام آباد میں بھی اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔۔ان کی تخلیق کردہ کتاب " دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں "واضح اور بلیغ انداز میں مابعد نو آبادیاتی عناصر کو منظر عام پر لاتی ہیں۔اس کتاب کا بڑا حصہ سیاسی حالات کی نمائندگی کرتا ہے۔چونکہ وہ دور جنرل پرویز مشرف کے فوجی حکمرانی دور سے تعلق رکھتا تھا اسی لیے اس کتاب میں واضح انداز میں دہشت گردی اور مذہبی شدت پسندی کا ذکر کیا گیا ہے۔دیکھا جائے تو یہ دور فوجی آمریت اور دہشت پسند عسکریت کے حوالے سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں سیاسی مزاج کی جھلک واضح انداز میں محسوس کی جا سکتی ہے۔روش ندیم کی شاعری میں پائی جانے والی شدت پسندی ان کے مزاج، لہجے اور اسلوب میں نمایاں طور پر دیکھنے میں ملتی ہے۔ان کی کتاب "ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں" میں کہیں کہیں رومانوی فضا نظر آتی ہے۔مگر "دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں" مکمل طور پر سیاسی حالات کی عکس بندی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

قسم ہے اس مضطرب زماں کی
کہ لوگ ذلتوں کی دلدلوں میں گھرے ہوئے ہیں
مگر وہ خوش ہیں
کہ دلدلوں کو نیا پیمبر تو ایک جنت بتا رہا ہے
نئی بشارت سنا رہا ہے

اسی خوشی میں خدائے قدوس کو سنہرے سپاس نامے
حسین لفافوں میں بھیجتے ہیں
وہ تازیانوں کو اس کی نشانی
سرخ کلیاں سمجھ رہے ہیں
انہیں خبر کیا
خدا خموشی کی سبز شالوں کو کاڑھنے میں بہت مگن ہے
یہ لوگ طاقت۔۔۔۔!
یہ لوگ عامل۔۔۔۔! (۴۵)

دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں مابعد نو آبادیاتی دور کی وضاحت نہایت عمدگی سے کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ نظمیں اس دور کی سیاسی صورتحال کو ذہن میں رکھتے ہوئے تخلیق کی گئی تھیں مگر وہی سیاسی صورتحال دراصل مابعد نو آبادیاتی دور کی ہی سیاسی صورتحال کی نشاندہی کرتی ہے۔ جس میں امراء، حکمران، بالادست اور بورژوا طبقہ اکڑ ، غرور اور طاقت کے نشے میں سرشار غرباء کا استحصال کرتا جارہا تھا۔ اور اس استحصال میں کسی قسم کی کوئی پشیمانی شامل نہ تھی انوار فطرت کا کہنا ہے:

"روش کی نظموں میں ایک درد انگیز شعریت ہے۔ وہ افسردگی طاری کر کے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ صداقت میں کبھی ابہام نہیں ہوتا، بلکہ واضح اور شفاف ہوتا ہے۔ صداقت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے فریم آف ریفرنس میں رہتی ہے اور زمین سے رشتہ نہیں توڑتی۔ روش کی نظمیں شعری ابہام کے ساتھ رہتے ہوئے غیر مبہم ہیں۔"(۴۶)

مابعد نو آبادیاتی حالات کی بات کریں تو ہمارے صاحبان، سیاست و سرمایہ دار محکوموں کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ وہ اپنا حجم، اپنا زر اور آمدنی بڑھانے کی فکر میں ہیں۔ روش ندیم اسی معاشی اور معاشرتی مسئلے سے نالاں ہیں ۔ روش ندیم حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کبھی اپنی کرسی کے بازو پہ گھونسے چلاتا ہوا
جرمنی کے کسی فلسفی کو بڑی حقارت سے یاد کرتا ہے
اور پھر بشاشت سے اعلان کرتا ہے کہ
"اب یہ میرا زمانہ ہے، میں اس کا حاکم ہوں

سو اس سیارے کی قسمت میں جو کچھ بھی ہو گا
مرے دم سے ہو گا
ہوائیں، گھٹائیں مری حکمتوں کی سزاوار ہوں گی
وہ بس ایٹمی موم کی بتیوں کی جلو میں
ایک عینک غلط فہمی کی لگائے کہے جا رہا ہے" (۴۷)

روش ندیم کی یہ نظمیں خاص عہد اور خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس عہد اور اس کے ماحول کو موضوع بنا کر انہوں نے اپنی نظموں میں حالات کی سختی، کرختگی اور درشتی کا ذکر نمایاں انداز میں کیا ہے۔

خموش لوگوں!
یہ کس کو تم سب نے عہد نو کا رسول مانا ہوا ہے
الہیٰت کا سفیر بھی ہے
تو شیطنت کا ہے ترجماں بھی
حسین صبحوں کا رام بھی ہے
سیاہ راتوں کا راکشس بھی
اسی کے ہاتھوں میں تازیانہ
اسی کے ہاتھوں میں پھول دستہ
نہ کوئی کعبہ
نہ کوئی قبلہ
یہ کس خدا کا پیامبر ہے(۴۸)

مابعد نو آبادیاتی دور میں لکھی گئی یہ نظمیں اس دور کے باقیات کی عمدہ عکاس ہیں۔ نو آبادکاروں کے جانے کے بعد بھی ان کا اثر قائم و دائم ہے۔ ہم ابھی تک ان کی غلامی سے نجات حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ روش ندیم کی یہ نظمیں اسی دہشت زدہ ماحول کی ترجمان ہیں۔ یہ نظمیں دراصل زندگی اور موت کی ترجمان ہیں۔ یہ نظمیں دراصل زندگی اور موت کے ساتھ ساتھ جمود اور ٹھہراؤ، بلکہ دہشت کا تجزیہ کرتے انسان کی ہیں ۔ آفتاب اقبال شمیم کہتے ہیں: "روش ندیم کی نظم کا ایک وصف یہ ہے کہ اس کی نظم سوچتی ہے اور یہ سوچ بیشتر وقت کے اندر اور کبھی کبھی وقت سے باہر نکلی ہوئی نظر آتی ہے۔ انسانی معاشرے اور تاریخ کے جبر کے بارے میں سوچتی ہوئی نظمیں نظری سطح پر ایک تسلسل کا سراغ دیتی ہیں۔" (۴۹) مابعد نو آبادیاتی حالات کی

ستم ظریفی، حاکم وقت کا ڈر، خوف، وحشت اور دہشت کا ذکر ان کی نظموں میں جابجا دکھائی دیتا ہے۔ ملکی حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شہر مسلسل کھانس رہا ہے
برف کی موٹی تہہ اوڑھے مسلسل چھینک رہا ہے
شہر کی سڑکیں، گلیاں اور بازار بالکل سن ہو چکے ہیں
سنا ہے مال روڈ والی مسجد، سکول
میونسپلٹی کا دفتر اور عجائب گھر سڑ گئے ہیں
آسمان پر ہتھیلی بھر سورج اور چاند کی ایک پھانک بچی ہے
لوگ دن کے وقت موم بتیاں جلائے گھومتے ہیں
انتظامیہ کے بقول حالات مکمل طور پر کنٹرول میں ہیں
نیوز کاسٹر تسلیاں دے رہے ہیں
دانشور ٹی وی پر مالیخولیا بارے مکالموں میں مصروف ہیں
مسجدوں سے بار بار اذانیں بلند ہو رہی ہیں
گھروں میں آیت کریمہ کے ختم کرائے جا رہے ہیں
چاروں اور برفیلے طوفان دندنا رہے ہیں (۵۰)

روش ندیم کی شاعری کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور اس ماحول کے باسیوں کو بدل دینے کے خواہشمند ہیں۔ وہ فطرت کو اس کی تمام تر رعنائیوں اور دلکشی کے باعث قائم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں وہ ماحول جو تباہ و برباد ہو رہا ہے اس کی فطری خوبصورتی ماند پڑ رہی ہے روش ندیم اس کو دیکھتے ہوئے مایوسی کا سا انداز اپناتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ابھی وہ دن نہیں آئے
کہ جب سورج سنہرا رتھ لیے آنگن میں اترے گا
کہ جب کلیاں بہت ہی شوخ دوشیزہ کی طرح مسکرائیں گی
گلی سے اک نئے موسم کی مہکاریں جب آئیں گی
ابھی وہ دن نہیں آئے (۵۱)

معاصر شاعری کا ذکر کرتے ہوئے روش ندیم کے ترقی پسند شعور کی وضاحت کی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ موجودہ ملکی حالات، سیاسی و سماجی حالات سے نالاں ہیں۔ حکمرانوں کی عیاشی، غریبوں کی بے بسی، مظلوموں کی آہ و فغاں کو وہ شاعری میں جگہ دیتے ہوئے منظر عام پر لانے میں کوشاں ہیں۔ حکمرانوں کی عیاشی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔

اتنے بڑے عالم میں جس سورج سے چاہو کھیل لو
جس آدمی کی بے بسی تم کو پسند آجائے
اس سے کھیل لو
کون ہے جو معترض ہونے کی جراءت کر سکے
ہم جبر اوڑھے
رات میں کینڈل جلائے
روشنی کے خواب آنکھوں میں لیے بے خود رہے (۵۲)

حکمرانوں کے ظلم و جبر اور تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ان پر جو بھی جبر ہوا ہے جو بھی ظلم ان پر کیے گئے ہیں وہ اتنی ہمت بھی نہیں رکھتے تھے کہ ان کی بابت دریافت کر سکیں کہ وہ کیوں اس ظلم کے حقدار ٹھہرے۔

ہم نے کھڑکی کھول کر ان سے پوچھا تک نہیں
وہ ہماری خلوتوں کو کس کے کہنے پر فنا کرتے رہے؟

چپ رہے، ہم چپ رہے
نیند بن کر رات کی پلکوں پہ بیٹھے
سو گئے
گیت بن کر خواب کی بانہوں میں آئے
کھو گئے (۵۳)

روش ندیم کی شاعری پڑھ کر دو طرح کے تاثرات ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ ایک طرف شاعر کی اداسی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جبر، بے بسی، بے مائیگی، ناانصافی اور طبقاتی کشمکش کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف وہ امید، آس اور صبر و تحمل کا سہارا لے کر آنے والے اچھے دن کے لیے پر امید ہیں اور اچھے دنوں کے لیے بغاوت کا سا انداز اپناتے ہیں۔ آصف فرخی ان کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> Nadeem has cultivated a modernistic stance and his poems are remarkable for their freshness and candour of expression bringing together unusal and starling images from contemporary like, he writes sharplines describing the drift towards meaninglessness in a highly politicised world.(۵۴)

مابعد نو آبادیاتی دور میں روش ندیم کے یہ شعری مجموعے معاشرے کا عکس پیش کرتے ہیں۔ معاشرے میں رونما ہونے والی وحشت، دہشت اور بربریت کا ذکر بڑے واشگاف الفاظ میں کرتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں جس وحشت نے ہمارے سماج پر ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ان کا ذکر روش ندیم کی نظموں میں کثرت سے ملتا ہے۔ تیزاب، بارود، ہلاکت، موت اور خوب جیسے الفاظ کا ذکر کر کے وہ ملکی حالات کو بیان کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک دہشت وہ ہے جس نے نہ صرف سماج کو متاثر کیا بلکہ جدید تہذیب اور کمرشل ازم کے تحت ماحولیات میں بگاڑ پیدا کر کے زندگی کو موت کے حوالے کر لیا ہے۔

ضیاء الحسن: معروف شاعر، محقق اور نقاد 1964ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے شاعری کے ساتھ ساتھ تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ آپ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منسلک ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا بھر سے مختلف قومیں، تہذیبیں اور معاشرے اپنی آسانی اور سہولت کے لیے ایک دوسرے سے مل جل کر زندگی گزارنے کو برتری دیتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ایک دوسرے کے تعاون، باہمی میل جول اور یگانگت سے جو حکومت پروان چڑھتی ہے وہ جمہوریت نواز کہلاتی ہے۔ جس کا اصل مقصد عوام کی ضروریات کو پورا کرنا انہیں زندگی گزارنے کے لیے مناسب اور بنیادی ضروریات کی فراہمی کو یقینی بنانا ہے۔ جمہوریت کے برعکس جب آمریت کا ڈیرہ ہوتا ہے تو سرمایہ داری نظام پروان چڑھتا ہے۔ سرمایہ دار اور زمیندار اپنی قوم کے مزدوروں کو جائز اور مناسب معاوضے دینے کے بجائے ان میں نفاق اور پھوٹ ڈالتے ہیں۔ محکوموں میں نا اتفاقی قائم کر کے یہ طبقہ خود مل جل کر رہتا ہے اور مل کر ان محکوموں کا استحصال کرتا ہے۔ تاکہ اپنے سرمائے میں اضافہ کر سکیں۔ اس حوالے سے لینن لکھتا ہے:

> "سرمایہ داری عام طور سے اور سامراج خاص طور سے جمہوریت کو محض خواب و خیال بنا دیتا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کی بدولت یہ

بھی ہوتا ہے کہ لوگوں میں جمہوری مانگ بڑھتی ہے ،جمہوری تنظیمیں اور
ادارے وجو میں آتے ہیں اور جمہوریت کو مسترد کرنے والے سامراج اور
عوام کے درمیان کشمکش اور تیز ہو جاتی ہے۔" (۵۵)

ضیاء الحسن کے شعری مجموعے بھی موجودہ سیاسی صورتحال کو جاننے اور پرکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں ۔ان کے ذریعے عہد حاضر کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورتحال کو جاننے میں مدد ملتی ہے۔"آدھی بھوک اور پوری گالیاں" ہمیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ ظلم آج بھی بدستور قائم ہے اس کا بظاہر خاتمہ ہوا ہے مگر ظالم آج بھی ہم پر نئے انداز سے ظلم کر رہا ہے۔اپنی اصلاحات نافذ کراتا ہے ،اپنی من مانی کرتا ہے اور ملکی سیاسی حالات اس بات کا بین ثبوت بھی دیتے ہیں۔اپنی ایک نظم " تم نہیں جانتے" میں وہ حکمران طبقے کے ظلم و جبر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں دیکھ رہا ہوں
تم کیا کرتے ہو
میں سمجھتا ہوں
تمہاری باتوں کو
میں جانتا ہوں
تمہارے ارادوں کو
میں جانتا ہوں
تم چھین لو گے
میری باقی ماندہ روٹی
تم دیکھتے ہو
میرا افلاس
تم سمجھتے ہو
میری مجبوریاں
تم جانتے ہو
مری تکلیفیں (۵۶)

ایسے ہی محکوموں پر ظلم و جبر کا ذکر ہمیں ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ اور وہ محکوم طبقہ ایسا ہے کہ ان کو آزادی کی کسی طور فکر نہیں ہوتی۔ انہیں اس بات سے غرض ہے کہ انہیں دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کو جگہ میسر ہو اس کے عوض چاہے ان کا خون بھی نچوڑ لیا جائے انہیں کوئی پروا نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

تم چھین لیتے ہو
میرے پھٹے پرانے کپڑے
روکھی سوکھی روٹی
اور بچوں کی مسکان (۵۷)

عہد حاضر کی سیاسی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکمران دولت اور طاقت کے نشے میں پاگل ہوئے پھرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اعلیٰ اقدار کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ انسانوں کے مابین اگر کوئی تعلق قائم بھی ہے تو وہ محض ذاتی غرض کی بنا پر ہے۔ لینن اس حوالے سے کہتا ہے:

"استحصال کرنے والے لازمی طور سے ریاست کو استحصال کیے جانے والے طبقے پر اپنے استحصالی طبقے کی حکومت کا ایک اوزار بنا ڈالتے ہیں۔ چناں چہ جب تک وہ استحصال کرنے والے باقی رہیں گے جو استحصال کی جانے والی اکثریت پر حکم چلاتے ہیں اس وقت تک جمہوری ریاست لازماً استحصال کرنے والوں کی جمہوریت ہو گی۔" (۵۸)

مابعد نو آبادیاتی عہد میں ضیاء الحسن کی شاعری میں ہمیں موجودہ نظام کے خلاف بغاوت کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس دنیا کو اس کی تمام تر آلائشوں کے ساتھ قبول کرنے سے منکر ہیں۔ سماجی، سیاسی ناانصافی کو دیکھتے ہوئے ان کا دل نہ صرف کڑھتا ہے بلکہ وہ اس کے خلاف با آواز بلند بغاوت بھی کرتے ہیں، احتجاج بھی کرتے ہیں اور ان کا یہ احتجاج، یہ بغاوت معاصر حکمرانوں کو للکارنے کی ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔ عہد حاضر میں جہاں عام انسان دکھ، درد اور کرب میں مبتلا ہوتے ہوئے زندگی گزار رہا ہے وہیں وہ ناانصاف اور ظالم حاکم کے خلاف بھی نبرد آزما ہونے کا عزم رکھتا ہے۔

عبدالکریم کے خون میں غلامی کا نشہ
کم ہونے لگا ہے
جب بھوک سے اس کا پہلا بچہ مرا

اس نے زمیندار کو گالی دی
زمیندار نے اسے
تھانے میں جوتے لگوائے
دوسرا بچہ مرا
اس نے زمیندار پر درانتی سے حملہ کیا
زمیندار نے محافظ رکھ لیا
اب اس کا تیسرا بچہ مر گیا ہے
وہ کھیت کو آگ لگانے
اور جسم سے بم باندھنے کا
سوچ رہا ہے
اور زمیندار نے اپنے محافظوں کی تعداد میں
اضافہ کر لیا ہے(۵۹)

غربت اور افلاس کے باعث مجبور بے بس عوام، خودکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ یا وہ حکمران کے خلاف کھڑی ہو جاتی ہے لیکن اگر عوام خودکشی اور حکمرانوں کے خلاف بغاوت پر نہ اتر سکے تو وہ دہشت گردی کا راستہ اپنا کر اور محکوم طبقے کا خاتمہ کرنے کا عزم کر لیتے ہیں تاکہ ظلم کا خاتمہ جڑ سے ممکن بنایا جا سکے۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں سیاست اور حکومت کا چلن اتنا خراب ہو چکا ہے کہ لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں۔ ہر طرف خاموشی ہے، ہو کا عالم ہے، ہر طرف سناٹا ہے، وہ جگہیں جو بارونق ہوا کرتیں تھیں جہاں فطرت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی تھی وہاں اب سناٹا ہے خاموشی ہے۔ ہر طرف دکھ درد نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ اور اسی دکھ کے باعث لوگوں نے گھروں سے نکلنا ترک کر دیا ہے۔

شہر چپ ہے گلی گلی چپ ہے
ایک مدت سے زندگی چپ ہے
سارے گلشن میں ہو کا عالم ہے
پتا پتا کلی کلی چپ ہے

حاکم وقت کے لیے لکھتے ہیں:

بولے تو جانے کیا ستم ڈھائے

صد غنیمت کہ وہ ابھی چپ ہے (۶۰)

دنیا کی بے رونقی دیکھتے ہوئے شاعر غمزدہ اور مایوس دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ وہ حساس طبیعت کا مالک ہے اور دکھ درد اس کی روح کو چھلنی کر دینے کے لیے کافی ہیں اسی لیے وہ حکمرانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

کوئی دنیا نئی بساؤ میاں!
کوئی کام تو کر کے جاؤ میاں!
کوئی قصہ نیا کرو آغاز
کوئی منظر نیا بناؤ میاں!(۶۱)

ضیاء الحسن کی شعری تخلیق "بار مسلسل" کی غزلوں میں ہمیں تصوف کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔ غزل جو کہ عہد حاضر میں طرح طرح کے الزامات کے باوجود اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے۔ اسی کو وسیلہ بناتے ہوئے ضیاء الحسن نے معاشرتی اور سیاسی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔

سعادت سعید: اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر سعادت سعید 15 مارچ 1949ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ آپ شعبہ تدریس سے وابستہ رہے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے اپنے فرائض سر انجام دیئے۔ ان کا ماننا ہے کہ سماج جہاں مابعد نو آبادیات سے متاثر ہوا وہیں ملکی سیاسی حالات بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ سماج کا بدلاؤ اسی صورت میں منظر عام پر آتا ہے جب سیاست اپنا فعال کردار ادا کرتی ہے۔ جہاں سیاست میں بگاڑ منظر عام پر آیا وہیں برائی اور انتشار نے جنم لیا۔ سعادت سعید کی شاعری میں بھی ہمیں سیاسی نظام پر مابعد نو آبادیاتی اثرات کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ نو آبادکار جو کہ اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھتے تھے انہیں مقامیوں کے مسائل اور تکالیف کی قطعاً پرواہ نہیں تھی اسی صورتحال کا ذکر سعادت سعید اپنی تحریروں میں کرتے ہیں۔ حاکم وقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس کی مکاریاں
بے زباں لٹ گئے
اس کی گلکاریاں
آسماں لٹ گئے
روش در روش

ارغواں لٹ گئے (۶۲)

ریاست کے وجود کا ذکر کیا جائے تو ایک وقت ایسا بھی تھا جب ریاست کا وجود ہی نہیں تھا، باہم مشورے نظم و ضبط، رِیت رواجوں یا سرداروں اور عورتوں کے اثر و رسوخ سے کام چلایا جاتا تھا۔ (عورتوں کا ذکر اس لیے ہے کہ اس دور میں عورتیں مردوں سے افضل مانی جاتی تھیں اور مدر سری نظام رائج تھا) تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب سماج میں طبقاتی کشمکش نے سر اٹھایا تو اسی وقت لوگوں کو دبانے اور اپنی من مانیوں کو قائم رکھنے کے لیے ریاست کا وجود عمل میں آیا۔ لینن اس حوالے سے کہتا ہے:

" شروع میں ہمارا سماج غیر طبقاتی سماج تھا۔ پہلا سر قبیلی، قدیم سماج جس میں اشرافیہ کا وجود نہ تھا اس کے بعد ایک ایسا سماج جو غلامی پر مبنی تھا، غلاموں کا سماج۔ پورے کا پورا متمدن یورپ اس دور سے گزرا ہے۔۔۔ دو ہزار سال پہلے عہد غلامی کا دور دورہ تھا، دنیا کے دوسرے خطوں کے قوموں کی زبردست اکثریت بھی اس منزل سے گزری۔ کم ترقی یافتہ قوموں میں اب تک اس عہد غلامی کی نشانیاں باقی ہیں" (۶۳)

عہد حاضر میں بھی اس غلامی کا دور دورہ قائم ہے۔ ترقی یافتہ ہوتے ہوئے اکیسویں صدی میں داخل ہو کر بھی ہم اس غلامی کی سی زندگی سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکے۔ ایسے میں حالات کی ستم ظریفی اور برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے سعادت سعید لکھتے ہیں:

ہماری پیاری زمیں پہ روشن
جواں صداؤں کو
سولیوں پہ
لٹکتے دیکھا تو ہو گا تم نے
جہاں بھر کے مغنیوں کے
دہکتے نغموں کو کس نے قبروں میں لا اتارا؟
ہمارے اشکوؤں کے جگنوؤں کو
بجھایا کس نے
ہمارے باغوں کو
زرد پوشاک کس نے بخشی؟

ہمارے شہروں کی ہنستی صبحوں کو
اشک زاروں میں بدلا کس نے
ہمارے خلوت کدوں میں
خاموشیوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں! (۶۴)

حالات کا ذکر کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ تمام سرمایہ دار ملکوں میں زمیں کے مالک، ملوں کے مالک ، سرمایہ دار یا حاکم طبقہ ملکی آبادی کا بہت کم حصہ ہیں یعنی وہ اقلیت میں ہیں۔ اور بعض اوقات یہی کم تعداد کے حاکم محنتی عوام کی محنت کے بل بوتے پر راج کرتے ہوئے اپنا سرمایہ بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور محکوم طبقہ یہ سب دیکھتے ہوئے خاموش ہے کیونکہ وہ حکمرانوں کے غضب کا نشانہ بننے کی سکت نہیں رکھتے۔ سعادت سعید حاکم وقت سے گلہ کرنے کے انداز میں کہتے ہیں:

زر و مال کے دیوتاؤں کے مندر طلائی ہیں
ہیروں سے آراستہ ہیں
کروڑوں جوانوں کے
جسمانی سرمے سے حاصل ہوئے ہیں
زر و مال کے دیوتا مست و مسرور ہیں
ان کا دعوٰی ہے کہ سب لوگ خوش ہیں
مگر کون اس سے کہے کہ یہاں
زندگی کے ستارے نحوست کی زد میں ہیں
بجھنے ہی والے ہیں (۶۵)

عہد حاضر کی سیاسی سماجی صورتحال کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہی سیاسی سماجی صورتحال ہے جس کا سامنا آج سے کئی سال پہلے کارل مارکس اور لینن نے کیا تھا۔ یعنی طاقت اور قوت کے زور پر کمزوروں کو کم تر ثابت کرنا، انہیں اتنا مجبور کر دینا کہ وہ اپنی روزی روٹی کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہ سکیں۔ ان کا ذہن سرمایہ داروں اور حکمرانوں کی چالوں کی طرف نہ جا سکے۔ وہ انقلاب یا تبدیلی کے خواہاں نہ ہوں اور نہ ہی یہ سوچ سکیں کہ انہیں اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنی ہے۔ "عام لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کے لیے جمہوریت اور طاقت کا استعمال کر کے مخالفین کو دبانا، یعنی جمہوریت کے دائرے سے عوام کا استحصال کرنے والوں اور

زبردستی کرنے والوں کو خارج کر دینا، یہ ہے وہ تبدیلی جس سے جمہوریت اس دور سے گزرتی ہے جو سرمایہ داری سے کمیونزم میں عبور کا دور ہے۔" (٦٦) ایسی جمہوریت جس میں نام تو جمہوریت کا رکھا جائے مگر انداز آمرانہ اپنایا جائے اسی کا ذکر سعادت سعید اپنی تحریروں میں کرتے ہیں۔

وہ فصلیں جو ہم نے بنجر بے آباد زمینوں میں
اپنے جسموں کی کھاد
اور لہو کی تخم پاشی سے تیار کی تھیں
اجنبی گورکنوں کے حواریوں نے
انہیں بے دردی سے کاٹا ہے
ہمیں اور ہمارے اعصابوں کو
تہ تیغ کیا ہے (٦٧)

ملکی حالات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر اس دیس کے شہروں کی ویرانی کی بابت بیان کر رہے ہیں کہ شہر اجاڑ، ویران اور سنسان ہیں۔ خوف دہشت اور وحشت کا ہر طرف ڈیرہ ہے۔ لوگ ڈر کے مارے گھروں سے نکلتے نہیں، باہر جانا ان کے لیے محال ہو گیا ہے۔

اب شہر ویرانے ہیں اور
شاداب گلیوں کے سانس تھمے ہیں
گھر گرہستیوں، اجنبیوں اور
بے گھروں کو
سانپ سونگھ گئے ہیں!
دلوں کے دھڑکتے ستارے
منجمند قدموں تلے مٹی میں
آ ملے ہیں (٦٨)

حکمرانوں کے غیض و غضب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سماج سے ظلم، ناانصافی اور طبقاتی کشمکش کا خاتمہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق وسائل سے نوازا جائے۔ جہاں یہ اصول تجاوز کرے گا وہیں سے بگاڑ پیدا ہو گا اور حکمرانوں کا ظلم و زیادتی شروع ہو جائے گی۔ وہ کہتے ہیں:

جن کی بینائی کے چاند گہنا چکے ہیں
اور دانائی کے سورج
سرد ہو گئے ہیں وہ
ہماری معصوم آنکھوں پہ
واہموں کی
پٹیاں چپکا دیتے ہیں
انہوں نے ہمارے ہونٹوں سے
زہر پیالے لگا دیے ہیں
ہمیں مارنے کی کوشش میں
نا قابل فہم پیغامات کا ورد
ان کی عادت ہے
ان کی ہیرے جڑی پوشاکیں اور انگوٹھیاں
ہماری آنکھوں اور شکموں کی بھوک میں اضافہ کر رہی ہیں(۶۹)

سعادت سعید اپنے اسی ترقی پسند شعور کے باعث اپنا الگ اور مرتبہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ عہد حاضر کے یہ نامور شاعر اپنی تحریروں کے باعث اپنے خیالات کو حکمرانوں اور عوام تک پہنچاتے ہیں۔ ان کا اچھوتا انداز ہمیں مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

کاشف رضا سید: عصر حاضر کے ممتاز ادیب، شاعر اور مترجم کاشف رضا سید ادبی حلقوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ 1973ء میں پیدا ہوئے اور اب کراچی میں مقیم ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے صحافت میں بھی اپنا نام بنایا۔ گزشتہ دو دہائیوں سے آپ الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہیں۔ آپ نے ایک ناول "چار درویش اور ایک کچھوا" بھی لکھا جس سے اردو میں ڈرامائی حقیقت نگاری کو فروغ ملا۔ ان کے نزدیک کسی بھی ریاست کی بقا اس کی عمدہ سیاست میں مضمر ہوتی ہے۔ سیاسی حالات کی بہتری ہی عوام کو حکمرانوں کی طرف سے مطمئن کرنے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ریاست میں بد نظمی دراصل عوام میں انتشار اور نفاق کا باعث بنتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نظام میں جو سیاست منظر عام پر آئی اس کا مقصد صرف شر اور نفاق پھیلانا تھا ،چونکہ نو آبادکار اپنے آپ کو افضل اور اعلیٰ گردانتے تھے اور دوسروں کو کم تر پنچ اور گھٹیا سمجھتے تھے یہی وجہ

ہے کہ وہ ہر جگہ اپنا تاثر یہی قائم کرتے کہ وہ عدل اور مساوات کے قائل ہیں اور جاہل اور غیر مہذب قوم کو تہذیب یافتہ بنانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ڈاکٹر مبارک علی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"سامراجی حکومت اپنے بارے میں یہ تاثر قائم کرتی تھی کہ وہ عدل و انصاف کی حامی ہے اس کے کارکن اور منتظمین ایماندار، محنتی اور کام کرنے والے ہیں ،وہ اس لیے حکومت کر رہے ہیں تا کہ مقامی لوگوں کو مہذب بنائیں اور ان کی زندگی کو پر سکون اور پر امن بنا دیں۔اچھے و برے، کمزور و برتر، ادنیٰ و اعلیٰ، غیر مہذب و مہذب اور سست و کام کرنے والے کا یہ فرق محکوم و حاکم کے درمیان قائم کرنے کے بعد ان کے لیے حکومت کرنے کا خلاقی جواز پیدا ہو جاتا ہے۔" (۷۰)

ایسے ہی برطانوی سامراج، ان کی فریبی چالوں اور ان کے ماتحت قیدیوں کی سی زندگی بسر کرنے کا ذکر کاشف رضا اپنی تخلیق "ممنوع موسموں کی کتاب" میں کرتے ہیں۔

مجھے جہاں بھی لے جایا جاتا ہے
ایک زنجیر پیروں سے
بندھی رہ جاتی ہے
جو وہاں سے شروع ہوتی ہے
جہاں سے مجھے گرفتار کیا گیا تھا(۷۱)

کاشف رضا سید فوجی آمروں، فسطائی رجحانات اور مذہبی تنگ نظری سے بہت نالاں ہیں اور اسی بات کا ذکر وہ اپنی تحریروں میں کرتے ہیں۔وہ حالات کی ابتری کا ذمہ دار حکمرانوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو ٹھہراتے ہیں، جو کہ مزدور کو اس کی مزدوری دیے بنا اپنی تجوریاں بھرنے کی فکر میں ہیں۔اسی وجہ سے مزدور طبقہ گزر بسر کے لیے بھی دوسروں کی ہمدردی اور توجہ کا محتاج بن جاتا ہے۔اس حوالے سے لینن کا کہنا ہے:

"مزدور کی محنت سے جو سرمایہ پیدا ہوتا ہے وہ چھوٹے مالکوں کو تباہ کرنے اور بے روزگاروں کی فوج کھڑی کر کے مزدور کو کچلتا ہے۔صنعت میں تو بڑے پیمانے کی پیداوار کی کامیابی فوراً نظر آجاتی ہے لیکن زراعت میں بھی یہی مظہر دکھائی دیتا ہے۔بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ زراعت کی برتری

بڑھتی جاتی ہے ۔مشینوں کے استعمال میں اضافہ ہوتا ہے ،کسانوں کی
معیشت زر اور سرمائے کے شکنجے میں پھنستی اور تنزل کرتی جاتی ہے۔"(۷۲)

کاشف رضا سید کا کہنا ہے کہ ایسے تنگ دستی اور بے بسی کے حالات میں مزدور اور، حکوم طبقہ خدا سے نہ صرف رزق کی بھیک مانگتا ہے بلکہ وہ زندگی کے لیے تازگی کا بھی طلبگار ہوتا ہے۔ تاکہ تازہ دم ہو کر اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کوشاں ہو سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

اے دعائیں مانگنے والو
دعائیں مانگنے جانا
تو بس اتنا اسے کہنا
ہمارے لمس کو بھی دھوپ سی تابندگی دے دے
ہماری صورتوں کو سبزہء نوروئیدہ سی تازگی دے دے
دعائیں مانگنے والو
خدا سے صرف یہ کہنا کہ ہم کو زندگی دے دے(۷۳)

کاشف رضا اپنے سیاسی حالات سے نالاں ہیں ۔جس سماج میں رہتے ہوئے مزدور کو اس کے خون پسینہ بہانے کے باوجود اس کی مناسب اجرت نہ دی جائے وہ اس سماج کے خلاف کھلم کھلا جنگ کا اظہار کرتے ہیں ۔وہ لکھتے ہیں:

"پے در پے فوجی آمریتوں ،فسطائی رجحانات اور مذہبی تنگ نظری نے
میرے سماج کو بہت دکھ دیے ہیں۔ سو ان سے میری کھلی جنگ ہے۔ میرا
ملک، میرا سماج، ان دنوں سے بہت دور نظر آتے ہیں جب کوئی شاعر صرف
محبت کے گیت گائے گا اور تاریخ اسے بے ضمیر نہیں لکھے گی۔ میں کوئی سماج
سدھارک نہیں۔ لیکن اگر کوئی میری دنیا، میرے موسموں کی ساری تتلیاں
سمیٹ کر انہیں سپردِ آتش کرنے لے چلے تو خاموش رہنا ہر حسن سے بے
وفائی ہے۔"(۷۴)

وہ اپنے دور کے حاکموں، حکمرانوں، سرمایہ داروں اور بورژوا طبقے کے خلاف نبرد آزما ہونے کو تیار کھڑے ہیں ۔وہ ماضی کا رونا رونے کی بجائے حال کو بہتر بنانے کے خواہاں ہیں ۔اس لیے وہ حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے میں بھی بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ ظالم حکمرانوں کو لکھتے ہیں:

ہمارے ہاتھ اور پاؤں کاٹ کر
ہمیں زندگی کی دوڑ میں دھکیل دو
ہم خود نہیں رکیں گے
ہماری پلکوں تلے
آتش بازی کا تماشا کر لو
ہم آنکھیں کھلی رکھیں گے
ہمارے جسموں سے سانس کے علاوہ
ساری زندگی نکال دو
ہم چلتے پھرتے رہیں گے
ہماری یاداشت سے دکھوں کے علاوہ
ساری یادیں نکال دو
ہم ہنستے مسکراتے رہیں گے (۷۵)

کاشف رضا سید کی شاعری میں ہمیں مادر وطن سے محبت کا جذبہ واضح انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی تحریریں ہمیں عہد حاضر کے حالات کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی تحریروں میں وہ رومانوی انداز بھی اپناتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کے ترقی پسند شعور کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔

ارشد معراج: معروف شاعر، نقاد اور ادیب 18 مارچ 1965ء کو پھلرون ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ آپ نے ملازمت کا آغاز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے 1986ء میں بطور کلرک کیا۔ اس کے بعد 1997ء میں آپ گورنمنٹ ڈگری کالج کہوٹہ راولپنڈی میں بحیثیت لیکچرار منسلک ہوئے۔ 2011ء میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو سے منسلک ہوئے۔ آپ نے 1982ء میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ آپ کا کہنا ہے کہ سیاست خواہ کسی بھی دور کی ہو اور حکمراں چاہے جو کوئی بھی ہو سماج پر اپنے گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ نو آبادکاروں کی آمد سے جہاں سماج میں تبدیلی آئی وہیں سیاست بھی اس سے متاثر ہوئی۔ حکمران، امراء اور جاگیر دار طبقہ محکوموں پر ہر طرح کے مظالم ڈھاتے۔ ایسی اصلاحات نافذ کی جاتیں جن سے محکوم طبقہ ترقی کی طرف قدم نہ بڑھا سکے۔ بربریت کے اس دور میں ارشد معراج نے اپنے شعری مجموعوں میں موجودہ سیاست پر مابعد نو آبادیاتی اثرات کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر انوار فطرت ارشد معراج کی شاعری کی حوالے سے لکھتے ہیں:

"جس عہد میں آپ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس خطے سے آپ کا تعلق ہے تو وہاں کیا ہر چیز رات کی آمد کا اشارہ نہیں کر رہی؟ ارشد بھی تو یہی کچھ کہہ رہا ہے کہ جسم ایندھن ہے۔۔ پھر بھی چاروں طرف۔۔ رات ہی رات ہے" (۷۶)

ارشد معراج سیاسی طور پر مابعد نو آبادیاتی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہیں:

میں ہوں دم بخود کروں کیا گلہ
مرا سر نگوں کھلے آسماں
میں غلام تھا، میں غلام ہوں
تیری تیز آنکھوں کے پانیوں میں جو بہہ گیا
جو الاؤ تھا تیرے پیار کا
وہ بھی بجھ گیا
مری شام نگری میں شام تھی (۷۷)

نو آبادکاروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

وہی ابتداء
وہی فاصلے
مرے روبرو مرے راستے
میں جہاں رہا میں وہاں نہ تھا
وہی کھینچ کر مجھے لے گئے
فرات و دجلہ کے نام پر
جو سوار آئے تھے دور سے
(مری ساری فصل وہ کھا گئے) (۷۸)

محنت مزدوروں کی اور اجرت یا پھل سرمایہ دار، جاگیر دار یا زمیندار حاصل کر لیں یہ ہی نو آبادیاتی دور کا المیہ ہے ۔مزدوروں کو بس اتنی سی اجرت ملتی تھی کہ وہ بمشکل دو وقت کا کھانا حاصل کر سکیں۔ محنت کے عوض مزدوروں کو دو وقت کی روٹی ملنا بھی محال ہو گیا ہے۔ ان کی قلیل اجرت کے باعث ان کا جینا دو بھر گیا۔

مگر یہ کیا ہے
تمام شب ہم نے روئی کاتی

جسے سویرے سیانے تاجر
مکاں سے اگلے مکاں کی سمت لے گئے
قلیل اجرت ہوا کے رخ پہ بکھر گئی
ہماری نیندوں میں کاربن کے سیاہ سینے پگھل رہے ہیں (۷۹)

ارشد معراج چونکہ خود دیہاتی پس منظر رکھتے ہیں اس لیے ان کا دل مزدوروں، محکوموں اور پرولتاریہ طبقے کے لیے بہت کڑھتا ہے۔ وہ ان کے غم کو اپنا غم محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں مابعد نو آبادیاتی دور کے اثرات ان کے ذہن پر اپنا نقش ثبت کر دیتے ہیں۔ وہ مایوسی کے عالم میں سوچتے ہیں کہ اچھے دن خواب ہوئے اب زندگی اسی قید مسلسل میں جی کر گزارنی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

گھاس اگتی نہیں
پیڑ خاموش ہیں
کھیت ویران ہیں
اور زمیں تھور ہے
عقل فکر زدہ
آنکھ بنجر ہوئی
دل کے کھلیان پر سنڈیوں کا بسیرا ہوا
سانس ساکن رہی
اور ہوا رک گئی
تھک گئے ہیں بدن، ہو گئے کوہ کن
رنگ لاتی نہیں
اب کوئی دعا (۸۰)

ارشد معراج کی شاعری میں زردار طبقے کے خلاف نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ وہ حکمرانوں اور امراء سے نالاں ہیں جو محکوموں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ وہ نو آبادکاروں کو عیار اور مکار کہتے ہیں جو محض تجارت کی غرض سے آئے اور حکمران بن بیٹھے۔

وہ جانتا ہے
خرد فروزی کے راز سارے

جہاں دیگر کے ساز سارے
وہ چکھ کے نکلا ہے جام و مینا
نئے علوم و فنون کی ساری اصطلاحیں بھی جانتا ہے
سمجھ ہے اس کو گلابی دھندے
وہ منڈیوں کی حساب داری
کوئی بھی اس سے الجھتا کب ہے
کسے کہاں پر لتاڑنا ہے
وہ جانتا ہے (۸۱)

حالات کی ابتری کے باوجود ہمیں ان کی نظموں میں آس اور امید کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ وہ آس کا دامن نہیں چھوڑتے۔ نو آبادکاروں کی عیاری و مکاری کو جانتے ہوئے انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ایسا ہو گا کہ ہم روشنی دیکھیں گے، سحر ہماری منتظر ہو گی، غم کے بادل چھٹیں گے اور پھر سے سویرا ہو گا، ہم پھر سے دنیا میں کامران ہوں گے، اپنا نام، مقام اور معیار پھر سے حاصل کریں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

اسے معلوم ہے
ازلی صحیفوں میں بھرا سارا غبار اک دن چھٹے گا
نور پھیلے گا
پھر اک بگ بینگ ہو گا
رینگنے والے چلیں گے
اور عزت دار ٹھہریں گے
زمانے سن لیا تو نے؟ (۸۲)

ارشد معراج کی شاعرانہ صناعی کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں: " ارشد کی نظموں میں خارج کی آلودگی، منافقت کی بدرنگی اور بدبو کا بدن چیرنے والا احساس سن ساٹھ کی نسل جیسا طرز احساس ہے۔ جہاں خارج کی آلودگی، ذات کو آلودہ کرتی جاتی ہے، مجھے کسی ہم عصر شاعر کے ہاں ہم عصر زندگی سے خوف ناک مایوسی اس کے لیے بے معنویت، لایعنیت اور باطن معاشرے کی آلودگی کا احساس اتنی شدت کے ساتھ نظر نہیں آتا جتنا ارشد معراج کی شاعری میں ملتا ہے۔" (۸۳)

حارث خلیق: مابعد نو آبادیاتی نظام میں سیاست نے گہرا اثر قبول کیا۔ عوام کے سیاہ و سفید کے حکمران ان پر جو ظلم ڈھاتے ان کا ذکر ہمیں حارث خلیق کی نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ سیاسی طور پر حکمران طبقہ اپنے ذرائع اور اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے غرباء کا استحصال کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ محکوم طبقہ غربت سے نچلے درجے پر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ ایسے حکمران مسلط ہو گئے جو اپنی طاقت کے نشے میں مست غریبوں پر ظلم و جبر کیے جا رہے ہیں۔

خوشبو نہ کوئی بات میں، رنگ نہ کوئی ذات میں
شیخ تھا اگرچہ کہنہ مشق، جبہ بھی عطر بیز تھا(۸۴)

حارث خلیق کی شاعری میں کہانی کی سی صورت ملکی حالات کا ذکر، نو آباکاروں کی آمد اور قابض ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ اپنی شاعری میں وہ نہایت خوبصورتی سے نو آباکاروں کی آمد اور ان کے قابض ہونے کا ذکر کرتے ہیں

۔

کہانی
برس ہا برس ہے پرانی
کسی ایک راجا کی جس کو
رعایا نے خود اپنا راجا بنایا۔۔۔
ریاست پہ مالک کا کیسا غضب تھا
وہ راجا بڑا بدنیت کم نسب تھا(۸۵)

حارث خلیق اس سیاسی بد نظمی سے نالاں ہیں ان کا کہنا ہے کہ محکوموں، مزدوروں سے میرا تعلق کافی پرانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ برصغیر میں امن و امان کا بول بالا ہو، مگر ملکی سیاسی حالات میرے اس خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتے۔ وہ لکھتے ہیں: " گزشتہ پانچ چھ برسوں میں موت پاکستانوں کے بازاروں، گلیوں، محلوں اور میدانوں میں رقص کناں رہی ہے۔ ساری دنیا ایک طرح سوچتی ہے اور ہمارے مقتدر ادارے اور طبقات دوسری طرح۔ بین الاقوامی دہشت گردی ہو یا عالمی کساد بازاری، ہمارے پاس اپنی حماقتوں پر آنسو بہانے کا وقت نہیں بچا۔ مگر ہمارا حال گواہی دے رہا ہے کہ ہم مستقبل کے لیے کچھ سیکھنے پر بھی کم ہی تیار ہیں ۔"(۸۶) حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دو وقت کی روٹی سے محروم ہونا۔ عہد حاضر میں بھی یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنے افسروں کو خوش کرنے کی فکر میں ماتحت اپنی عزت نفس کی بھی پرواہ

نہیں کرتے وہ یہ تک بھول جاتے ہیں کہ انہیں اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا ہے مگر پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے وہ اپنی عزت، آبرو اور خود اعتمادی کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ اور نو آبادکار مقامی آبادی کو کھلونا سمجھتے ہوئے انہیں اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں اور ان سے ہر طرح کے کام کرواتے ہیں۔

کتابن جانے میں کتنی سہولت ہے
وقت پہ کھانا مل جاتا ہے
وقت پہ باہر جانا
کبھی کسی مہمان کی خاطر
کرتب کوئی دکھانا
دم جو نہ ہو تو اور اچھا ہے
سر ویسے ہی ہلانا
مالک کے چرنوں میں اپنی
پوری عمر بتانا
کتابن جانے میں کتنی سہولت ہے (۸۷)

نو آبادکاروں نے مقامی باشندوں کے ہنر سے فائدہ اٹھایا، ان سے محنت لی اور اس محنت کے عوض چند سکے تھما کر بری الذمہ ہوئے اور کود ان کی ہی محنت سے محل تعمیر کرنے اور اپنی تجوریاں بھرنے میں لگے رہے۔ محنت کسی اور کی، اور پھل کوئی اور کھاتا رہا۔ یہ سب نہ صرف اس دور میں بلکہ آج کے دور میں بھی سر عام ہو رہا ہے ۔ حکمران، سیاست دان اپنا مال منال بڑھانے کی فکر میں ہیں۔ غرباء کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ہنر کو بیچتے رہے اور ہنر ور خود اپنی محنت کا جائز معاوضہ حاصل نہ کر سکے۔ اور نو آبادکار اپنی عیاری، چالاکی سے سب کچھ اپنے قبضے میں کرنے میں کامیاب رہے۔

یہ کون لوگ ہیں، یہ شہر کس حصار میں ہے
ہر ایک مال غنیمت کے کاروبار میں ہے
ابھی سے تازہ شگوفوں کی راہ دیکھتا ہوں
ابھی تو دیر بہت آمد بہار میں ہے (۸۸)

حارث خلیق اپنے شعری مجموعے " عشق کی تقویم " کی ایک نظم میں سیاست دانوں کا اصل چہرہ کھاتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے مقامی آبادی سے مزوروں اور محنت وروں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ان کی محنت کا پھل ان کو دیئے بغیر اپنا پیٹ بھرا۔ طاقت کے بل بوتے ان سے دن رات محنت کروائی۔ ان کی طاقت کو اپنے مصرف میں لاتے ہوئے اپنے اثاثے بڑھائے۔ حارث خلیق نو آباکاروں کی زبان اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

چلو آؤ
ہم اپنے بینک کے
بڑھتے اثاثوں کے تناسب سے
نئی بلڈنگ بنائیں
اور اس تعمیر میں
ہم وہ وسائل کام میں لائیں
جو پس ماندہ ممالک کے
سبھی نادار جسموں میں ذخیرہ ہیں (۸۹)

غرض حالات خواہ جیسے بھی رہے ہوں حکمرانوں کا ناروا سلوک مقامیوں پر قائم تھا اور عصر حاضر میں محکوم اور مجبور طبقہ اس بدتر سلوک کی چکی میں پس رہا ہے۔

(ب) معاصر ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے سماجی اثرات

فضل احمد خسرو : فضل احمد خسرو کو اردو ادب میں اور خاص طور پر غزل میں ترقی پسند روایت کے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ انہوں نے اب تک ترقی پسند غزل کی روایت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں آج بھی سماجی افراط و تفریط اور معاشرتی طبقاتی کشمکش دیکھنے میں ملتی ہیں۔ وہ ان مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعے اس کام میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری ہمیں اس انسان سے متعارف کراتی ہے جو دہشت، وحشت اور خوف میں گھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے گرد خوف کا ایک ہالہ سا بنالیا ہے۔

خواب، ممتا، تتلیاں اور پھول جلتے ہیں یہاں

زندگی ہر روپ میں لگتی ہے شہرِ بے اذاں (۹۰)

ایک اور جگہ معاشرتی حالات کی ابتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

محبت کا کوئی لہجہ ،نہ کوئی پیار کی بولی
بڑا خاموش اور سنسان ہے سارا نگر اب کے
نہ کوئی جشن رنگ و بو نہ کوئی نغمہ شادی
بہار آئی ہے پیڑوں پر بااندازِ دگر اب کے (۹۱)

فضل احمد خسرو کی شاعری میں ہمیں سماجی گھٹن، معاشی ناہمواری اور تہذیبی ٹوٹ پھوٹ واضح دکھائی دیتی ہے ۔وہ عہد حاضر کے انقلابی شاعر ہیں جو اپنی نظموں اور غزلوں میں معاشرتی ناہمواری کو بیان کرتے ہیں۔ان کی آزاد نظموں میں ہمیں مابعد نو آبادیات کے اثرات واضح انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔افضل آدرش لکھتے ہیں:

"خسرو کی شاعری کسی روایتی شاعر کی تصوراتی شاعری نہیں بلکہ تجربات و واقعات کی شاعری ہے وہ خارجی عوامل کو اپنے داخلی محسوسات کی کسوٹی پر پرکھ کر مشاہدات کو جذبات کی بھٹی میں جلا کر کندن کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔" (۹۲)

معاشرتی ناانصافی میں مزور ،بے بس، محکوم طبقہ جو غربت کی چکی میں پستا چلا جاتا ہے ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ان کا ذکر فضل احمد خسرو اپنے شعری مجموعوں میں بڑی بے باکی سے کرتے ہیں۔اپنی نظم "مزدور کارجز" میں وہ لکھتے ہیں:

میری محنت مشقت کا سارا ثمر
ان کمینوں میں باہم دِگر بٹ گیا
یہ جہاں ظلم اور جور سے اٹ گیا
میں بھی مالِ غنیمت بنا جنگ میں
ایسی جنگ جس کو میں نے لڑا ہی نہیں
اور پھر یوں ہوا
مجھ کو میرے ہنر کی سزا دی گئی
بھوک، افلاس، بیماریاں۔۔۔زاریاں
میری قسمت نہ تھیں

پھر بھی مجھ کو ملیں
غاصبوں نے میری زندگی کے لیے
میرا حق چھین کر
مجھ کو یوں مات دی
میری محنت کا حق نہ کبھی بھی دیا
میری محنت پہ بھی مجھ کو خیرات دی (۹۳)

شاعر سماجی برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے ماتم کنعاں ہے کہ معاشرے میں بھوک، افلاس، غربت اور ناانصافی عام ہوتی جارہی ہے۔ شاعر ماضی کے حوالے سے ماتم کنعاں ہے اور یہ سوچ سوچ کر افسردہ ہے کہ کس طرح ماضی میں وہ ایک عالم پر حکومت کرتے رہے ہیں اور اب حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ظالم حاکم جس نے حالات کا رخ موڑا اور دھرتی میں ایسے بیج بوئے کہ خوشحال دن خواب ہوئے اور ظلم وجور کا دور دورہ شروع ہوا ۔ علم و فن کی جگہ جہل کو رواج ملا۔ حسن و جمال کی جگہ فریب و آسیب نے لے لی۔ دوستی کی جگہ رقابت کا عنصر پروان چڑھنے لگا۔

یہ ہنروروں کا وہ دیس تھا
جہاں صبح ملتی تھی شام سے
یہاں روز ہوتی تھی گفتگو
یہاں خوب سجتے تھے رتجگے
یہاں دوستی کا رواج تھا جو عبادتوں کا شمار تھا
یہاں خودسری کا رواج تھا کہ ہر ایک سر میں خمار تھا
یہاں پھول کھلتے تھے نور کے
یہاں سب گھروں میں چراغ تھے
یہاں رزق ملتا تھا فکر کو
یہیں فلسفے کے دماغ تھے
یہاں ایک خاکی ہوا چلی
وہ ہوا جو باد سموم تھی
یہاں جال پھینکا فریب نے

یہاں گھیر اسب کو آسیب نے
یہاں سانحوں کی دھمال تھی
وہ کمال تھا یہ زوال ہے (۹۴)

عہد حاضر کا معاشرہ اندرونی خلفشار اور بد نظمی کا شکار ہو چکا ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کی فکر میں ہے۔ آپس میں اتحاد کی بجائے نفاق کو فروغ دیا جارہا ہے، بد نظمی اور بے ربطی کی سی کیفیت ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ یہی معاشرتی مسائل ہمیں ان کی غزلوں اور نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جیلانی کامران اس حوالے سے کہتے ہیں: "ہمارے زمانے میں غزل کی نئی اور بدلی ہوئی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور غزل کو شعری طور بروئے کار لانے کے لیے مختلف انداز فکر بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان آوازوں اور فکر کے پھیلے مناظر میں فضل احمد خسرو کی آمد ایک ایسا اضافہ ہے جسے ہر اعتبار سے خوش آمدید کہا سکتا ہے۔" (۹۵) فضل احمد خسرو چونکہ حساس طبیعت کے مالک ہیں وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں اور نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس پر کڑھتے بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں اس کا نمایاں اظہار ملتا ہے۔ خسرو کی شاعری میں ہمیں قدروں کی گمشدگی کا احساس ہوتا ہے کہ کس طرح پرکھوں کی قائم کی گئی اقدار وروایات ختم ہوتی جارہی ہیں۔ فضل احمد خسرو کی شاعری اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ادب خواہ کسی بھی رنگ میں ہو اپنا گہرا اور دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔ خسرو کی پنجابی اور اردو دونوں زبانوں کی شاعری میں ہمیں ان کا ترقی پسند شعور واضح نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کو کمائی کا ذریعہ بنانے کی بجائے عوام کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ حاکم وقت سے ڈرے اور نہ ہی باغیانہ تحریریں لکھتے ہوئے کمزور پڑے۔ ان کی شجاعت اور دلیری ہمیں ان کی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو اپنی شاعری میں جابجا پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

نواز شاہد: عہد حاضر میں مابعد نو آبادیاتی صورتحال کے اثرات شاعری کی صورت میں واضح طور پر دیکھنے میں ملتے ہیں۔ معاصر ترقی پسند شعراء نے اس حوالے سے نہ صرف اپنے خیالات عوام تک پہنچائے بلکہ اپنی تخلیقات سے بھی ترقی پسند شعور کی وضاحت کی۔ اس سلسلے میں ایک نام نواز شاہد کا ہے۔ جنہوں نے اپنی معاصر شاعری سے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی اثرات نہ صرف ہمارے سماج پر بلکہ ہماری سیاست پر بھی اپنا گہرا اثر چھوڑ چکے ہیں۔ انہی کا برملا اظہار نواز شاہد کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ وہ بے باک شاعر جو محسوس کرتے ہیں اسے بیان کرتے ہیں۔ ان کا دل عوام کی تکالیف،

پریشانیوں اور آہوں سے کڑھتا ہے۔ اپنی شاعری میں وہ نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی نظام کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں عوام کے لیے وجودیت کے مسئلے نے سر اٹھایا۔ عوام اپنی پہچان، اپنی شناخت، اپناوجود کھو چکے تھے۔ احساس محرومی ان کی رگوں میں سما گیا تھا۔

ایسے پاؤں تلے زمین گھومی
گردش آسمان کو رہنے دیا
مری ہستی فنا کی زد میں تھی
قصہ جاوداں کو رہنے دیا (۹۶)
وہ زمین اور آسمان نہ رہا
اپنے ہونے کا بھی گماں نہ رہا(۹۷)
عجب اسرسر کی بارات اتری
نگاہِ ناگہاں ہے اور میں ہوں (۹۸)
میں اپنے شہر میں گم ہو رہا ہوں
ترے سارے حوالے کھو رہا ہوں (۹۹)

نواز شاہد عصر حاضر کے حالات سے نالاں ہیں۔ وہ اپنے ارد گرد کے حالات دیکھتے ہوے اس پر نوحہ کنعاں ہیں ۔ دھرتی کے دکھ ان کی رگ رگ میں سرایت کر چکے ہیں۔ ان کی غزلوں نظموں میں یہ نوحہ ان کے غم کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ موجودہ گلوبلائزیشن کے دور میں جہاں بہت سی آسانیاں پیدا ہوئی ہیں وہیں تیسری دنیا کی عوام کے لیے حالات کا ایسا بگاڑ منظر عام پر آیا ہے کہ دکھی دل اور حساس دل رکھنے والے فنکار اس سے متاثر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نواز شاہد چونکہ غزل کے شاعر ہیں ان کی غزلوں میں ہمیں عہد حاضر کی سیاسی بدحالی اور معاشرتی انتشار کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ اور اسی کیفیت کے عالم میں وہ حالات کو بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں مابعد نو آبادیاتی نظام کے اثرات کا ذکر ان کی اس نظم میں بہت ہی عمدہ انداز میں کیا گیا ہے۔ ان کی نظم " اب صفیں ٹوٹنے کا منظر ہے" عہد حاضر کے مابعد نو آبادیاتی حالات کی عمدہ تصویر کشی کرتی ہے۔

خواب بکھرے ہوئے سڑکوں پر
اور انہیں چننے والا کوئی نہیں

اس سے پہلے شناخت ہوں آنکھیں
دن نیا پیرہن بدلے گا
یہ خبر بھی گزشتہ رات کی ہے
جب تواتر سے شمعیں بجھنے لگیں
کوئی جنگل کی آگ ہاتھوں پر
اپنے گھر کی گلی میں لے آیا
بھوکے کتوں کی سخت ہف ہف میں
نہ گلے پھاڑ کر خطاب کرو
آگہی سے تہہ زمینوں پر
اب صفیں ٹوٹنے کا منظر ہے (۱۰۰)

مابعد نو آبادیاتی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے وہ زندگی سے پشیمان ہیں اور اس روشنی کے حوالے سے مایوس اور نا امید دکھائی دیتے ہیں۔ روشنی ان کے نزدیک بہتر مستقبل کا استعارہ ہے۔ اس سے وہ آنے والے دنوں کی بہتری کا خواب دیکھتے ہیں مگر اس میں بھی وہ مایوس ہی نظر آتے ہیں کہ نو آبادکاروں نے اس حد تک اپنے پنجے مقامی آبادی پر گاڑے کہ ان کے جانے کے بعد بھی بہتری کی آس اور امید نظر نہیں آتی۔ اپنی نظم میں وہ لکھتے ہیں۔

میں شب خون کا عزم رکھتا ہوں
اس حویلی پر جس کے سارے مکیں
سایہء وہم کی پناہ میں ہیں
چار اطراف میں دھواں ہی دھواں
زندگی ہے نہ روشنی کوئی
کوئی حد ہے نہ سرحدوں کا یقین (۱۰۱)

غزل کا ہر شعر چونکہ دوسرے سے الگ ہوتا ہے اور ایک مکمل اکائی رکھتا ہے۔ اس میں پوری ایک کہانی سمائی ہوتی ہے۔ نواز شاہد کی غزل میں بھی یہ چیز ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی غزل کے کسی شعر میں ہمیں سماجی حالات کی ابتری کا ذکر ملتا ہے تو کسی میں سیاسی مظر نامہ دکھائی دیتا ہے۔ کہیں وہ محبوب کا ذکر کرتے ہیں تو کہیں وہ معاشی ناانصافی پر نوحہ کنعاں ہوتے ہیں۔ ذکاءالدین شایان اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"غزل کا فن نظم گوئی سے بہت مختلف ہے۔ غزل میں ہر بات کو مطلق العنانی کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہر طرح کے موضوع کے لیے وضاحت اور بیان کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ غزل کہتے وقت اگر کوئی شاعر یہ چاہے کہ جو بھی احساسات یا خیالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے ہیں انہیں بے کم وکاست شعر میں اتار دے تو یہ غزل ہی میں نہیں شعر میں بھی ناممکن ہے، تراش خراش اور انتخاب و تہذیب کا عمل اور اس کا سلیقہ سب سے زیادہ غزل میں درکار ہوتا ہے۔" (۱۰۲)

نواز شاہد کی غزل میں بھی ہمیں ایسے ہی عناصر کی جھلک ملتی ہے۔ ان کی نظم بھی انہی خیالات سے مبرا ہے۔ نظم کے ساتھ ساتھ غزل کے ذریعے بھی وہ مابعد نو آبادیاتی اثرات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ صناعی بہت مہارت سے مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو لفظوں کے پیراہن میں ڈھال کر زبان زدِ عام کرتی ہے۔ اپنی غزلوں میں بھی وہ معاشرے کے پسے ہوئے مظلوم، محکوم اور زیر دست طبقے کا ذکر نمایاں انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں جہاں تہذیب و شائستگی کا عنصر نظر آتا ہے۔ وہیں پر وہ ہمیں بہتر مستقبل کی آس اور امید بھی دلاتے ہیں۔ آس اور امید کے رویے کا ذکر بھی ہمیں ان کی نظم کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

پھر لہو کے زور سے اس خزاں کی بارش میں
کاغذی گلاب میں اک دیا جلایا ہے (۱۰۳)

نئی دن کے اجالے تم ہی دیکھو
میں اپنی راکھ بن کر سو رہا ہوں (۱۰۴)

یہ اماوس کی رات ڈھلنے دو
کل نیا چاند بھی اچھالوں گا (۱۰۵)

مابعد نو آبادیاتی دور کے سماجی اثرات سے متاثر ہوتے ہوئے نواز شاہد محکوم طبقے کی آواز بن کر ابھرے ہیں۔ اور ان طبقات کو آس امید اور روشن جہاں کا خواب دکھاتے ہوئے پر امید ہیں کہ روشن صبح ضرور ہو گی جس میں کوئی کسی کا حق نہیں کھائے گا۔ کسی ظالم کا ڈر اور خوف نہ ہو گا۔ کوئی دہشت اور وحشت زندگیوں میں نہ ہو گی۔ نواز شاہد کی شاعری کے حوالے سے روش ندیم کا کہنا ہے کہ: "نواز شاہد اپنے خارجی و سماجی، سیاسی

فکری زاویوں کے ساتھ دو حوالوں سے واضح اور منفرد نظر آتے ہیں۔ اول حوصلہ و امید کا رویہ اور دوم تہذیبی شائستگی اور وقار۔ چاہے وہ سماجی و سیاسی معاملات کو زیر بحث لائیں یا وہ اپنے ذاتی و داخلی قصوں کو تخلیقی اظہار کا حصہ بنائیں ان کے یہ رویے ان کی شخصیت کا خاصہ ہیں۔ یوں بھی کٹھن ترین حالات کے بیان اور تجزیے کے باوجود ترقی پسندوں کے ہاں حوصلہ اور امید کا پہلو ہمیشہ روشن رہا ہے۔" (۱۰۶) سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور بورژوا طبقے کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے نواز شاہد اپنی نظموں اور غزلوں میں ان کے خلاف بغاوت کا سا انداز اپناتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ سرمایہ دار نو آبادکاروں کا نیا روپ ہے جو بظاہر تو جا چکے ہیں مگر ان سب کے باوجود نواز شاہد پر امید ہیں کہ بہتر مستقبل کے لیے اچھے دنوں کے لیے نئی صبح کے سورج کے طلوع ہونے کے آرزومند ہیں۔

یوں تو مشکل ہے راہِ شوق مگر
اور کچھ دیر چل کے دیکھتا ہوں (۱۰۷)
شب کا مرقد بنانے والا ہوں
نیا سورج اگانے والا ہوں
میری گم راہی پر نہ آنسو بہا
نیا راستہ دکھانے والا ہوں
میرے حال شکستہ پر نہ جا
نئی دنیا دکھانے والا ہوں (۱۰۸)

اپنی ایک نظم " چوتھی سمت میں دو قدم " میں وہ زندگی کے حوالے سے بہتر اور روشن، مستقبل کی آس کا ذکر کرتے ہیں۔

صبح شہر نگاراں کی پہلی کرن
دن کی بانہوں میں سمٹا ہوا روشنی کا بدن
چاندنی کی بہاروں میں گھلتی ہوئی
نرم لہجے کی لو
کھلتی کلیوں کی سرگوشیوں میں اٹی
زندگی کی مہک
رقص کرتی ہواؤں کی پائل کی مدھم

پہلی بارش کے قطرے میں بھیگا ہوا آرزوئے جہاں
جھیل کے ٹھہرے پانی میں ہلکورے لیتا ہوا مہ کا عکس رواں
لہر تپتی ہوئی یاد کے قافلوں کی کسک
آنے والے سہانے سمے کی لپک
میری نظروں کے سارے دریچوں سے ہو کر
مجھے دیکھتی ہے
مجھے مانگتی ہے(۱۰۹)

مابعد نو آبادیاتی دور میں غربت، افلاس، تنگ دستی اور بیچارگی کا چلن عام ہے۔ نو آبادکاروں نے مقامی آبادیوں کی زمین، جائیداد، تہذیب و ثقافت کو ان سے چھین کر اپنی تہذیب متعارف کرائی۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی کہ ہم آپ کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے ہیں ہم اعلیٰ اور آپ کم تر ہیں۔ ان کی انہی باتوں کے باعث مقامی آبادی ان کے قریب ہوتی گئی اور ان کی فریب زدہ چالوں کو نہ سمجھتے ہوئے اپنا سب کچھ ان کے لیے چھوڑ دیا۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو اپناتے ہوئے مقامیوں کو اسیر بنایا انہیں دو وقت کی روٹی کا محتاج کر دیا انہیں گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ سماجی حالت کی خرابی کا باعث یہی آبادکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت سے لے کر عصر حاضر تک اس بگاڑ سے نجات ممکن نہ ہو سکی۔

اندر کی شورشوں کی کسی کو خبر نہ تھی
ہر ایک کہہ رہا تھا کہ آنکھیں کھلی رکھو
شاہد تجھے ہی تیز ہواؤں کا شوق تھا
اب ریت کی طرح سے بکھرنا بھی سیکھ لو (۱۱۰)
تو بڑے شوق سے ہو تازہ ہواؤں کا رفیق
ہم بکھرتے ہی چلیں جائیں، وہ حالات نہ کر
ایک ہی بھاو میں اٹھنے لگے ہیرے کنکر
اے میرے شہر کے عادل یہ مساوات نہ کر (۱۱۱)

مابعد نو آبادیاتی دور میں اپنی مرضی سے جینا اور سانس لینا بھی جرم ہے، اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا اور کوشش کرنا محال نظر آتا ہے۔ عصر حاضر میں اس کے اثرات کے تحت ہم آزاد ہونے کے باوجود قیدیوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ ذہنی اور سماجی طور پر ہم آج بھی مفلوج ہیں۔ ہم اپنی حالت کی بہتری کے لیے ہاتھ پاؤں تو

مارتے ہیں، مگر اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ زندگی کے حوالے سے مایوسی کا ذکر کرتے ہوئے نواز شاہد بھی پشیماں اور پریشان نظر آتے ہیں۔

زندگی ایک ڈھیر کوڑے کا
جس میں بدبو کا شہر پلتا ہے
تن بدن میں الاؤ جلتا ہے
رینگتے، کلبلاتے کیڑوں میں
جینے مرنے کا کھیل مہنگا ہے
شہر بھر کی سبھی دکانوں پر
ہاتھ سستے ہیں، میل مہنگا ہے (۱۱۲)

یعنی سرمایہ دار یا تاجر حضرات غرباء سے محنت تو لیتے ہیں مگر اس کا جائز مناسب معاوضہ ان کو نہیں دیا جاتا۔ اس محنت کے بدلے ان کو بمشکل دو وقت کی روٹی میسر ہوتی ہے۔ جس کو وہ خوشی خوشی قبول کر لیتے ہیں اور اس معاوضے کی کمی کا کوئی گلہ سرمایہ دار سے اس ڈر سے نہیں کرتے کہ کہیں وہ ناراض ہو کر ان کی وہ دو وقت کی روٹی بھی ان سے نہ چھین لے۔ ان کی روزی روٹی کا جو ذریعہ قائم ہے وہ کہیں سرمایہ دار کے غضب کے باعث ختم نہ ہو جائے۔ ایک نظم میں لکھتے ہیں۔

میرے جسم پر پھر سے لوہے کی کنگھی چلاو
گھنیرے شجر کی پناہ واماں سے مجھے کیا ملا
پھر سے آرہ بناؤ مجھے چیر ڈالو
کہ میں نے حصار جازت کی تحقیر کر کے
تری مملکت میں
قدم اپنی مرضی سے فرشِ زمیں پر رکھا (۱۱۳)

غلامی اور محکومی کا ذکر ہمیں مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی نظر آتا ہے۔ انسان آزاد پیدا ہوا مگر جہاں دیکھو وہ اپنی آزدای کے باوجود پابہ زنجیر ہے۔ اپنے کسی بھی فعل میں وہ آزاد نہیں بلکہ محکوم ہے۔ اسے کسی بھی معاملے میں آزادی میسر نہیں خواہ وہ معاملہ سماجی ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا معاشرتی، ہر حال میں ہر معاملے میں وہ زنجیروں میں یا اصولوں کی بیڑیوں میں بندھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں گندم کاٹنے والا

سوالوں سے بھری حیران آنکھوں سے
پرانے خواب کی منزل میں
رستہ بھول جاتا ہوں
خداوندانِ نعمت کی کتابوں میں
لکھی تفسیر پڑھتا ہوں
تو سچائی کا چہرہ بھول جاتا ہوں
کہ عہد نبوت میں
مدینے کی رہ ورسم اخوت میں
غلامی مر نہیں سکتی
فقط گرگٹ کی صورت میں رنگوں میں بہکتی ہے
غلامی زندہ رہتی ہے(۱۱۴)

نواز شاہد کا ترقی پسند شعور ان کی نظموں اور غزلوں میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔مابعد نو آبادیاتی دور کا ذکر ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔وہ الفاظ کا چناؤ اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری کے دل پر گراں بھی نہیں گزرتا اور وہ اپنی بات بھی دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں۔نواز شاہد عہد حاضر کے وہ معروف شاعر ہیں جو عوام کی پریشانیوں کو دیکھ کر نہ صرف ان کے حل کے لیے کوشاں رہتے ہیں بلکہ حکمران وقت کو اپنی کوتاہیوں سے آگاہ کرنے سے بھی نہیں گھبراتے۔وہ قلم کی طاقت کے زور سے اپنے خیالات عوام اور حکمرانوں تک پہنچاتے ہیں۔معاشرے کے مجبور، مہجور اور بے کس عوام کے دکھوں کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کڑھتے ہیں، اور ایسی عوام کو جو کہ غربت اور ذلت کی چکی میں پَس رہی ہے انہیں اپنے حقوق کا شعور دلانے کی سعی کرتے ہیں ۔ان کی شاعری میں ہمیں مابعد نو آبادیاتی اثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔وہ کھلے لفظوں میں عوام اور حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہیں۔اپنی شاعری میں وہ معاشرتی صورتحال کو اجاگر کرتے ہیں۔ان کی تحریریں مایوس کن افراد کے لیے روشنی کا استعارہ ہیں جس کی بدولت وہ اپنے اندر نئے سرے سے زندگی جینے کی آس محسوس کرتے ہیں۔

مظہر حسین سید: پاکستان کا معاصر ادبی منظر نامہ جس طرح بحران کا شکار ہے اور جس طرح مغرب کے سیاسی، سماجی معاشی اور میڈیائی اثرات نے اپنا اثر چھوڑا ہے ان سب کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ

مغرب کا تسلط آج بھی ہم پر قائم ہے۔ ہم اس تسلط میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ ہماری سوچیں آج بھی مغرب کی سوچ کی عکاس دکھائی دیتی ہیں۔ ہم آج بھی ان کو خود سے افضل اور اعلیٰ گردانتے ہیں۔ ایسے میں ہمارے ترقی پسند شعراء اور ادیب عوام کا رشتہ مغرب سے توڑ کر مشرق کی طرف جوڑتے ہیں۔ ہمارے ترقی پسند ادیب اپنی الگ پہچان اور شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہی ادبا اور دانشوروں میں ایک اہم نام مظہر حسین سید کا بھی ہے۔ آپ کو عہد حاضر کے شاعروں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ آپ کی شاعرانہ تخلیق "سکوت" مابعد نو آبادیاتی اثرات کو واضح انداز میں بیان کرتی ہے۔ کتاب کا ہر ورق مغرب کے دیئے گئے دکھ ،درد اور پریشانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان کی تخلیق کے حوالے سے روش ندیم کا کہنا ہے:

"مظہر حسین سید کی شاعری کا مطالعہ ہمیں جس شعری دنیا سے آشنا کراتا
ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور متاثر کن بھی۔ کیونکہ وہ حیرت اور مسرت کے
گہرے احساسات سے دوچار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" (۱۱۵)

عہد حاضر میں مابعد نو آبادیات کے اثرات ہمیں ہر طرف دکھائی دیتے ہیں خواہ وہ سیاسی صورتحال ہو یا سماجی منظر نامہ ہر جگہ پر اسی کے اثرات کا ڈیرہ ہے۔ کمزور دن بدن کمزور اور طاقت ور اقتدار کے حصول اور اس کے نشے کے خمار میں سرمست ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کون اس کے اقتدار کے زیر اثر پِس رہا ہے اور اپنا وجود آہستہ آہستہ ختم کرتا جا رہا ہے۔ مظہر حسین سید کی شاعری میں ہمیں ایسے ہی حاکم اور محکوم ،بالادست اور زیر دست، پرولتاریہ اور بورژوا طبقے کا ذکر ملتا ہے۔ حاکم وقت نشے میں دھت ہے اور غرباء کو ان کے جائز اور مناسب معاوضہ دینے میں بھی تامل محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غریب طبقہ امراء کے خلاف کمربستہ ہو کر ان کے خلاف بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ سماج کی اسی نفسا نفسی کا ذکر مظہر حسین سید بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔

عجب لوگ تھے مردوں سے بات کرتے تھے
جو مر رہے تھے انہیں کوئی پوچھتا نہ تھا (۱۱۶)
لے کر نکلا تھا خواب آنکھوں میں
شہر سے سوگوار آیا ہوں (۱۱۷)
رکوں تو پیڑ نہیں کوئی سایہ دار نہیں
چلوں تو شہر میں چلنے کا راستہ نہیں ہے (۱۱۸)

یہاں افتاد یہ کیسی پڑی ہے
جسے دیکھو اسے اپنی پڑی ہے (۱۱۹)

مابعد نو آبادیات کے تحت سماج میں طاقت کا عمل دخل متعارف کرایا گیا تھا۔یعنی جس کے پاس طاقت ہو گی ،اقتدار ہو گا،روپیہ پیسہ ہو گا،وہ کوئی بھی جرم کرلے، کسی کے ساتھ جس مرضی نوعیت کی زیادتی کرلے،اس پر کسی قسم کا کوئی بھی رد عمل ظاہر نہیں کیا جاتا تھا ۔اور یہی سب کچھ مابعد نو آبادیاتی معاشرے میں عام ہو گیا تھا۔ایسے میں مزدور، محکوم اور زیر دست طبقہ جو کہ پہلے ہی غربت کی چکی میں پس رہا تھا اسے اپنی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے اٹھارہ سے بیس گھنٹے کی مشقت کروائی جارہی تھی۔ان پر اس نظام کے تحت مذید ظلم ڈھایا گیا۔ جس سے ان کی مصیبتوں اور دکھوں میں اضافہ ہوا۔غرض مابعد نو آبادیاتی نظام میں غریب طبقے کے دکھوں، مصیبتوں اور مسائل میں اضافہ ہی ہوا۔ان کو نو آبادکار کے آنے اور اپنا سکہ جمانے کا فائدہ تو کوئی نہ ہوا مگر نقصان کافی اٹھانا پڑا۔

مظہر حسین سید جو کہ ترقی پسند شعراء کی فہرست میں اپنا نام اور مقام رکھتے ہیں انہوں نے اپنی شاعری میں یہ نکتہ اجاگر کیا۔انکی شاعری مابعد نو آبادیاتی دور کے دکھوں، مصیبتوں، مسائل اور مصائب کو منظر عام پر لانے کی عمدہ کاوش ہے۔ جس سے مزدور اور محکوم طبقے کے حالات کو زیر بحث لایا گیا۔

بات کب ضبط کرنے والی تھی
ہاں مگر حوصلہ کیا میں نے (۱۲۰)
رنج و غم یہ مصیبت یہ دشتِ تنہائی
مرے خدا مجھے در پیش کربلا تو نہیں (۱۲۱)

مابعد نو آبادیاتی دور میں حکمران، سرمایہ دار اور زر دار طبقہ محکوم عوام پر قابض ہوتے ہوئے ان کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔اس بات سے قطع نظر کہ ان کے اوپر بھی ایک خدا ہے جو ان کے سب اعمال جانتا ہے۔

کفر تو فرض ہے ایسے ماحول میں
ہو جہاں آدمی کا خدا آدمی (۱۲۲)

ایسے سماجی حالات کے بگاڑ کے بعد بھی مظہر حسین سید مایوس نہیں ہوتے وہ ایک آس اور امید لگائے ہوئے ہیں کہ اچھے دن آئیں گے، بہتر مستقبل کی آس کو اپنے دامن سے باندھے رکھتی ہے۔انہوں نے نہ سہی مگر ان

کی آنے والی نسلیں ضرور سہانا دن دیکھیں گی۔ ضرور سویرا ہو گا، نیا سورج طلوع ہو گا اور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا پر حکومت کرے گا۔ ان سب خیالات کا ذکر وہ اس انداز میں کرتے ہیں۔

تاریکیوں کا دور تھا سو جو بھی مل گیا
اس کو دیا بنا کے جلانا پڑا ہمیں (۱۲۳)
ٹھہرو ابھی امید کے پودے کو نہ کاٹو
ممکن ہے کسی شاخ سے پتا نکل آئے (۱۲۴)
دفعتاً بڑھ گئی ہے تاریکی
آمد صبح کا اشارہ ہے (۱۲۵)
شام غم ہے مگر اس نے بھی گزر جانا ہے
یہ شفق ہے کوئی رکنے کا اشارہ نہیں ہے (۱۲۶)

نو آبادکاروں نے مقامی آبادی کو جو سہانا خواب دکھایا، جس بہتر مستقبل کی آس دلائی، ویسا کچھ بھی ممکن نہ ہوا۔ بلکہ ان کو بہلا پھسلا کر اپنا کلچر، اپنی تعلیم اور اپنے رسم و رواج لاگو اکروا دیے گئے۔ ان کے ذہنوں کو پختہ کر دیا گیا کہ مغرب ہم سے بہتر ہے۔ اور ہم چاہ کر بھی مغرب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہذا ہمیں ان کی پیروی کر کے ان کی نقل کرتے ہوے ان جیسا بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ وہ فریب تھا جو مقامی آبادی کے ذہنوں میں بھر دیا گیا تھا۔ مظہر حسین سید نے اسی فریب اور دھوکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عوام کو اس سے آگاہ کیا ہے۔ نو آبادکاروں کے آنے سے کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مگر نقصان کافی برداشت کرنا پڑا۔

فائدہ ذرہ برابر تیرے ہونے سے نہ تھا
پھر بھی نقصان تیرے چھوڑ کے جانے سے ہوا (۱۲۷)
سب کے سب مل کر میرے سامنے صف آراء ہیں
کام ایسا ہے کہ دو چار نہیں کر سکتے (۱۲۸)
شور فرمائیں جو آزادی سمجھتے ہیں اسے
ہم حوالات سمجھتے ہیں سو چپ رہتے ہیں (۱۲۹)

مابعد نو آبادیاتی دور میں جو بھی مزدور کی محنت یا اجرت تھی وہ نو آبادکاروں نے اپنے نام کرالی۔ محنت مقامی آبادی سے لی گئی مگر ان کو ان کی محنت کا جائز مناسب معاوضہ تک نہ دیا گیا۔

میں نے کھیتوں میں ہل چلایا تھا
جو اگایا تھا سب پرایا تھا (۱۳۰)
آپ ملتے تھے تو پھر جان فدا کرتے تھے
انتہا تھی ہی نہیں آپ کی عیاری کی (۱۳۱)

مابعد نو آبادیاتی دور میں حالات اگرچہ بہتر نہ ہوئے مگر ان حالات میں عوام میں خوف، دہشت، وحشت اور ڈر کا عنصر پیدا ہوا۔ وہ آبادکار جو حالات کی بہتری کی طرف گامزن کرنے کے لیے ہم پر مسلط کیے گئے تھے انہوں نے غریب عوام میں اپنا ایسا ڈر اور خوف بٹھا دیا کہ ان کے خلاف کوئی بھی آواز بلند نہ کر سکا۔ یہی وجہ ہے ڈرا دھمکا کر مقامی آبادی کو اپنی تہذیب اور اقدار اپنانے پر زور دیا گیا ان کو کسی حد تک وحشت زدہ کر دیا گیا کہ وہ اپنے سائے سے بھی گھبرانے لگے۔

مکیں خواب سے جاگے ہی تھے کہ سہم گئے
ہر اک مکان کی چوکھٹ پہ ڈر لکھا ہوا تھا (۱۳۲)
راستے دو ہی نکلتے ہیں تری بستی سے
فیصلہ کرنا ہے مر لیں کہ گزارہ کر لیں (۱۳۳)
ہم کو تہذیب و تمدن میں کہاں ڈھونڈتے ہو
عہد وحشت ہے میاں جس کے قریں ہیں ہم لوگ (۱۳۴)

ایسے وحشت اور خوف کے عالم میں لوگوں نے جینا ایک سزا سمجھا اور خود کو حالات کی خرابی کا ذمہ دار سمجھ کر جان گنوا دی۔ کچھ نے نو آبادکاروں کے رویوں سے تنگ آکر موت کو گلے لگا لیا۔ حالات کی ستم ظریفی تو دیکھئے کہ جو مکیں اپنے گھروں میں رہایش پزیر تھے ان کو وہاں سے بے دخل ہونا پڑا۔ اپنی جگہ، زمین، تہذیب و تمدن ،اقدار، زبان، رسم و رواج سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ ایسے میں حساس دل موت کی خواہش کرنے لگے۔ حقیقت میں ان کی موت کا اصل ذمہ دار نو آبادکار اور ان کا رویہ تھا۔

ہمارے قتل کا الزام آخر
ہماری بے بسی پر آگیا تھا (۱۳۵)
حیات جاوداں بھی سامنے تھی
مگر میں خودکشی پر آگیا تھا (۱۳۶)

مظہر حسین سید نے مابعد نو آبادیاتی دور میں رہتے ہوئے مایوسی، لاچاری اور بیچارگی کا ذکر کیا ہے۔

جو محو جشن ہیں مظہر وہ لوگ میرے نہیں
جو کٹ گیا وہی خاندان میرا ہے (۱۳۷)
ایک بے نام جزیرے کے مکیں ہیں لوگ
ایسے موجود ہیں جیسے کہ نہیں ہیں ہم لوگ (۱۳۸)

مظہر حسین سید کی اسی شاعرانہ خصوصیت کا ذکر ان کے ہم عصر بھی کرتے ہیں۔ وہ بھی ان کی شاعری کے معترف ہیں وہ جس بے باکی سے حالات کی ستم ظریفی کا ذکر کرتے ہیں وہ تعریف کے قابل ہے۔ ان کے ہم عصر ان کی شاعری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"مظہر حسین سید وہ شاعر ہے جس نے غزل کی روایت و نزاکت کو کہیں بھی مجروح نہیں کیا۔ اس نے غزل سے وفا کی ہے اور کیوں نہ کرتا کہ اس کا تعلق ہی اسی قبیلے سے ہے جو وفاداری کی روایات نبھانے میں ایک اختصاص رکھتا ہے۔" (۱۳۹)

نو آبادیاتی نظام کا مقصد سراسر طاقت کا حصول تھا۔ ایسی طاقت جس کو اختیار کر کے اقتدار پر قابض ہوا جاسکے ۔ اور طاقت خواہ کسی بھی صورت میں ہو اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہے۔ نو آبادکاروں نے طاقت کے بل بوتے پر مراعات حاصل کیں۔ مختلف طبقات میں لوگوں کو تقسیم کر کے ان کو سماج میں رہنے اور سماج میں اپنا وجود برقرار رکھنے کے طریقوں سے آگاہ کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جو طریقہ مقامی آبادکاروں کو اپنانے پر مجبور کیا گیا وہ سراسر غلامی اور قیدی کی سی زندگی گزارنے کا تھا ۔ باطل کو دیکھتے ہوئے حق کے لیے آواز نہ اٹھانا اور خاموش رہنا یہی دستور نو آباکاروں نے طاقت کے بل بوتے پر رائج کرایا۔ اسی حوالے سے قاسم یعقوب کا کہنا ہے:

"دنیا کی قدیم تہذیبوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ سماج ہمیشہ سے کم از کم دو بڑے حصوں میں تقسیم رہا ہے۔ ایک طبقہ طاقت ور اور اشرافیہ کا، جب کہ دوسرا طبقہ محکوم اور مجبور یا ایسے افراد پر مشتمل ہے جو طاقت یا ذرائع پیداوار پر دسترس نہیں رکھتے تھے۔ (مقامی آبادی)۔ سماج کی مجموعی تخلیقیت بنیادی طور پر انہی دو طبقوں کی حرکات پر مشتمل تھی۔ ایک طبقہ اپنی طاقت اور اشرافیائی اقدار کو قائم رکھنے میں مصروف رہتا جبکہ دوسرا طبقہ

اپنی موجودہ حیثیت کو بدل کر اشرافیائی اقدار میں تبدیل کرنے کی کوشش
کرتا رہتا ہے۔"(۱۴۰)

اپنی شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر مظہر حسین سید عوام میں بے پناہ مقبولیت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی عکاس ہے۔وہ سیاسی حکمرانوں سے نالاں ہیں ان کے رویے سے عاجز اور ان کی حکمت عملیوں سے پریشان ہیں۔ان کا شاعرانہ ذوق ہمیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ محکوموں کا ساتھ دینے میں پیچھے نہیں ہٹتے۔اپنی تحریروں میں وہ سیاسی و سماجی حالات کے ساتھ ساتھ ملکی معاشی حالات کی ابتری کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں ہمیں حکومت وقت کے خلاف تحریریں بھی ملتی ہیں۔آزاد ہونے کے باوجود وہ عہد غلامی کا ذکر کرتے ہوئے مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔

روش ندیم: ترقی پسند شاعروں نے جو ادب دنیا کے سامنے متعارف کرایا وہ عوام دوست اور جمہوریت نواز ادب تھا۔اس میں عدل،انصاف،اخوت اور مساوات کی بات کی گئی۔اس ترقی پسند ادب کا اپنا اک نکتہ تھا ،ایک الگ نظریہ تھا،وہ تبدیلی کے خواہاں تھے۔ترقی پسند تحریک کی ذیل میں جو ادب پروان چڑھا اس کا اصل مقصد ملک سے پسماندگی کا خاتمہ کر کے انقلاب لانا تھا۔اسی وجہ سے کسان،مزدور اور محکوم طبقہ اپنی آواز حکام بالا تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔اس سے قبل ایسا ادب منظر عام پر نہیں آیا تھا۔روش ندیم اس حوالے سے کہتے ہیں:"ہندوستان میں کلاسیکی ادب زیادہ تر نوابوں،حکمرانوں اور بادشاہوں کے درباروں اور حویلیوں میں پروان چڑھا۔لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد نئے تصورات نے درمیانے طبقے کو پیدا کیا،جس سے درمیانہ طبقہ ادب کا نمائندہ بنا۔ترقی پسند ادب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا اور عوامی طبقات یعنی مزدور،کسان اور محنت کشوں کو ادب میں جگہ دے کر ان کی زندگیوں کو موضوع بحث بنایا۔" (۱۴۱)معاصر ترقی پسند شعراء کا ذکر کرتے ہوئے اگر عصر حاضر کے ممتاز شاعر،دانشور اور نقاد اور مفکر روش ندیم کی شاعری کی بات کی جائے تو ان کی شاعری میں بھی ہمیں دو طرح کے طبقات نظر آتے ہیں۔ایک محنت کش طبقہ دوسرا حاکم اور بالا دست طبقہ۔روش ندیم نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد ہونے والے مصائب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بظاہر تو نو آبادکار چلے گئے مگر ان سے منسوب دہشت،وحشت اور خوف کے پہرے ہنوز ہمارے ذہنوں پر موجود ہیں وہ ہمارے ذہنوں پر ڈیرے ڈالے ہوئے ہمیں ہراساں کیے ہوئے ہیں۔

جن بستیوں کے نیچے نمکین دلدلیں ہیں
سیال کیچڑوں میں کالی رطوبتیں ہیں

تیزاب کے ہیں جوہڑ، گندھک کی آبنائے
اور منطقوں میں پھیلی زہر آب کی ہے دہشت
اور گھورتی ہے سب کو بارود کی ہلاکت
سبزے ہیں جن سے لرزاں
ہیں ندیاں بھی سہمی
سو کون یہ بتائے۔۔۔۔۔(۱۴۲)

روش ندیم کا ماننا ہے کہ کوئی بھی معاشرہ بالادست اور زیر دست کے وجود کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ حاکم طبقہ سماج میں رہتے ہوئے اپنے معیارات قائم کرتا ہے۔ اور محکوم طبقہ حاکم کے پسند و ناپسند کے معیار کے باعث بہت سے مسائل سے دوچار رہتا ہے۔ مگر وہ ان مسائل کا اظہار نہیں کر پاتا۔ کیونکہ حاکم کی رضا میں ہی وہ اپنی رضا جان کر خاموش ہو جاتا ہے۔ حاکم طبقہ محکوم طبقے کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دیتے ہیں کہ وہ محکوموں ، مظلوموں اور کسانوں کی مدد کرنے کے لیے اقدامات کر رہے ہیں، جس سے مزدور طبقہ مطمئن ہو جاتا ہے اور حاکم کو اپنا خیر خواہ ماننے لگتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔

یہاں باغ کے اس طرف تھوڑی خالی جگہ ہے
برائے تحفظ جہاں ایک دیوار سی چن رکھی ہے
مگر پھر بھی آسیب وحشی درندوں کی صورت میں
اسے پھاند کر آجاتے ہیں(۱۴۳)

سماجی حالات کی خرابی کا ذکر، جیون کے دکھ کا ذکر، حکمرانوں کے خوف اور رعب و دبدبہ کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

یہ خواہش کب ہماری تھی
کہ ہم افلاک کے فرمان کی سولی پر جا لٹکیں
دکھی جیون کی اندھی گاٹیاں اتریں
پھر ان بے کار سانسوں کی اسیری کا کفن اوڑھیں
یا ایک دن بس یونہی بیٹھے بٹھائے
موت کی انگلی پکڑ کر مرقدوں اندر اتر جائیں(۱۴۴)

روش ندیم اپنی ترقی پسندانہ شاعری میں تخاطب کا سا انداز اپناتے ہوئے نو آبادکاروں کا ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے آنے سے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ دن کا اجالا سیاہ کالی رات میں بدل گیا۔ امن و سکون بے سکونی میں تبدیل ہوا، آسایشوں کی جگہ مصائب نے ڈیرہ ڈال لیا۔ وہ حکمرانوں کی ظلم و زیادتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ذرا دیکھو
کہ سورج کتنے جنموں سے مری گلیوں میں ٹھہرا ہے
مگر ایسی سیاہی تو کبھی دیکھی نہیں ہو گی
سیہ سورج، سیہ گندم، سیہ آنسو، سیہ پرچم
سیہ اوراق بھی تم نے کبھی دیکھے نہیں ہوں گے (۱۴۵)

روش ندیم کی انہی نظموں کو ترقی پسند شاعری کا ماڈل قرار دیتے ہوئے ریاض صدیقی یوں رقمطراز ہیں: "ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں ترقی پسند شعری روایت کے پیٹرن سے ہٹی ہوئی پوسٹ ماڈرن گلوبل مناظر میں وارد ہونے والی ترقی پسند شاعری کا ماڈل ہیں" (۱۴۶) روش ندیم نے مابعد نو آبادیاتی نظام کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں مابعد نو آبادیاتی دور کی تبدیلیوں کا ذکر، ان کے مسائل، اس کے تقاضے، موجودہ دور کے انسان کی رہنمائی، خارجی و باطنی توڑ پھوڑ جیسے محرکات کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ان کی ترقی پسندانہ شعور کی نظموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کس طرح ایک باشعور انسان نے زمان و مکان کے تسلسل، تاریخی و سماجی شعور، تہذیبی جبریت، ثقافتی ادراک، انسانوں کے ذہنی و قلبی مسائل، بے اطمینانی، بے چینی، یاسیت کو شاعرانہ بصیرت سے دیکھتے ہوئے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں ان کا سیاسی سماجی شعور جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

پٹخ دیا ہے قلم بھی، سفید کاغذ بھی
انڈیل دی ہے سیاہی ادھوری نظموں پر
جلا دی اپنے ہی ہاتھوں سے ہر غزل اپنی
گرا دیا بیاضوں کو کوڑے دانوں میں
سو خواب کا ہے تکلف، نہ آس کا جھنجھٹ
نہ حسرتوں کا الم ہے، نہ آرزو کا ملال

نہ رنج کی ہے شکایت، نہ درد کا شکوہ
ہواؤ! آؤ کہ اب گر گئے ہیں سارے کواڑ
ہواؤ! آؤ کہ اب ڈھے گئی ہیں دیواریں (۱۴۷)

معاصر ترقی پسند شاعری میں مابعد نو آبادیاتی عناصر کا ذکر کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نو آبادیاتی عہد سرمایہ داری اور جاگیر داری کو فروغ دینے کے لیے شروع ہوا۔ اس کے تحت سرمایہ داروں کی صنعت کو فروغ ملا، ان کی اجرت میں اضافہ ہوا اور وہ کام جو مزدوروں اور محکوموں سے لیا جاتا تھا آہستہ آہستہ مشینوں کی نذر ہوتا گیا۔ جس سے ماحولیاتی اور ذہنی آلودگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ روش ندیم نے اس حوالے سے اپنی ایک نظم پولیوشن لکھی؛

بارودرت میں
کیمیکل سے اٹی فضا میں
سیال مادے سمندروں میں بدل رہے ہیں
مری زمین کی ہتھیلیاں بھی
زہر آلود پانیوں سے تڑخ رہی ہیں
چمنیوں کے کھلے دہن سے نکلی دھند کا
غبار روشن بصارتوں کو ستا رہا ہے
مشین کے جنگل سے ابھرتا یہ آکٹوپس
لہلہاتی سبز کرنیں جلا رہا ہے
رنگین پردوں میں لپٹا پنجر
دھوئیں کا زہر اب پی رہا ہے، پلا رہا ہے
ہاں یہی ہے
میرے عہد کا جدید انساں
لڑکھڑاتا، گرتا پڑتا، ہانپتا اور کھانستا
ہوائے تازہ کی نرم خوشبو سے جس کے نتھنے نا آشنا (۱۴۸)

مابعد نو آبادیاتی دور میں وقت کا دھارا تیزی سے بہتا جارہا ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ ایک کو دوسرے کی پرواہ نہیں۔ انسان کی زندگی مکمل طور پر مشینی ہو گئی ہے۔ دوسروں کے دکھ درد سمیٹنے، بانٹنے کا وقت نہیں۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کی دوڑ میں زندگیاں گزر رہی ہیں۔

میں اکثر سوچتا رہتا۔۔۔!
یہ دنیا کیسی دنیا ہے
جہاں لوگوں کو دفتر کے جھمیلوں سے فراغت ہی نہیں ملتی
سویرے چائے میں اخبار کے کالم بھگو کر ناشتہ کرنا
پھر اس کے بعد دن بھر فائلوں پر بیٹھ کر
دریائے فردا کے نئے گمنام ساحل ڈھونڈتے رہنا
اور آخر ڈوبتے سورج کی کرنوں پر گئے دن کی
خباثت تھوک کر گھر لوٹنا اور سوچنا۔۔۔ ہم کون ہیں؟(۱۴۹)

روش ندیم کی نظموں میں معاصر مصائب اور مسائل کا ذکر روش ندیم کس عمدگی اور نفاست سے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اصل میں نظم کہلاتی ہی وہی ہے جو ارد گرد ہونے والے واقعات کو اس خوبصورتی سے بیان کرے کہ قاری داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ احتشام حسین اس حوالے سے لکھتے ہیں: "جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس پیدا ہو سکے۔"(۱۵۰)

ضیاء الحسن : شعر و ادب کا سہارا لیتے ہوئے انسانی جذبات و احساسات کو بطریق احسن پیش کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کے ادیب اور شاعر وہاں کے حالات و واقعات کا گہرا اثر لیتے ہیں۔ ادیب اور شاعر چونکہ حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اسی لیے ان کے ذہنوں پر سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ اور یہی اثرات ہی ہیں جو جذبات و احساسات کی صورت میں شاعری کا لبادہ اوڑھے ہم تک پہنچتے ہیں۔ شاعری کی صورت میں دقیق سے دقیق مضمون بھی ایسا سہل ہو جاتا ہے کہ قاری اس مضمون کے بہاو میں بہتا چلا جاتا ہے۔

عہد حاضر کے شاعر ضیاء الحسن وسیع المطالعہ شاعر ہیں۔ انہوں نے مابعد نو آبادیاتی دور میں اپنی شاعرانہ خصوصیت کا استعمال کرتے ہوئے اس عہد کے معاشی، سیاسی، معاشرتی اور بالخصوص زرعی مسائل کو اجاگر کیا

ہے۔ان کی دو شاعری کی کتب " آدھی بھوک اور پوری گالیاں " اور "بار مسلسل" منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کی پہلی کتاب " آدھی بھوک اور پوری گالیاں " در حقیقت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ نظموں کو "وجود" اور " عبدالکریم" کے نام سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے حصے کی نظموں میں شاعر نے وجودیت اور شناخت کے مسئلے پر بحث کی ہے۔عہد حاضر میں انسان نفسا نفسی کے عالم میں اپنی پہچان،شناخت اور وجود کھو رہا ہے ۔ضیاء الحسن نے اپنی کتاب کے اس حصے میں اسی مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔اس میں پیار، محبت،امن اور سلوک کا درس دیتے ہوئے حالات کے بہتر ہونے کی نوید دی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے "عبدالکریم" میں انہوں نے زرعی معاشرتی نظام،طبقاتی کشمکش،کسان کے مسائل ،روزی روٹی کے مسائل اور اناج کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔عبدالکریم کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں عبدالکریم ملک عبدالکریم ہوا کرتا تھا۔لوگوں کا مال ہڑپ کرنا،عورتوں کی عصمت دری کرنا اور بے گناہوں کا قتل عام کرنا اس کا شیوہ تھا۔اس کے پاس حویلی،باغات،زمینیں اور جانور سب کچھ تھا۔مگر حالات نے رخ بدلا تو ملک عبدالکریم کی بجائے صرف عبدل رہ گیا۔اس پر ظلم ہوا،اس پر کتے چھوڑے گئے اور جس طرح اس نے لوگوں کی عزتیں پامال کیں تھیں اب بالکل اسی طرح اس کی عورتوں کی عزتوں کی بے حرمتی کی گئی۔یہ سب سہتے ہوئے وہ دہشت گرد بن گیا جس کے باعث اسے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ضیاالحسن کے اس شعری مجموعے کی بابت سعادت سعید لکھتے ہیں۔" آدھی بھوک اور پوری گالیاں" کی شاعری انسانوں کی مایوسیوں اور گہرے دکھ درد کی عکاسی کے باوجود آرزؤں سے خالی نہیں ہے۔اس میں جابجا امیدوں اور اثباتی تمناؤں کے پھول کھلے نظر آتے ہیں۔"(۱۵۱)سعادت سعید کے اسی بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں ضیاء الحسن کی شاعری میں آس،امید کا ذکر ملتا ہے۔عبدالکریم کے حوالے سے وہ کہتے ہیں:

تمہیں اپنی فصل خود کاشت کرنی ہے
فصل پکنے سے پہلے
اپنی درانتی تیز کر والو
تمہیں کاٹنی ہے
اپنی بوئی ہوئی فصل
ظلم آمادہ ہاتھ
اور کلف لگی گردن

ایسے وقتوں میں
میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں گا
میں مضبوط کروں گا
تمہارے ہاتھ اور دل
بڑھاؤ گا تمہاری ہمت
اور دکھاؤں گا تمہیں راستہ
نئی زندگی کا (۱۵۲)

ایسے ہی وہ محکوموں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انہیں ہر قدم پر حالات کا مقابلہ کرنے کا درس دیتے ہوئے ان کو آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں ایک نظم میں وہ لکھتے ہیں:

لیکن تم نہیں دیکھتے
مری آنکھوں میں
تم نہیں سمجھتے مرے ارادے
تم نہیں جانتے
جب راستے ختم ہو جائیں
تو ایک راستہ رہ جاتا ہے
تم نہیں جانتے
بنالیا ہے یہ راستہ اپنے دل میں
چلنے والا ہوں اس رستے پر
اور کھینچنے والا ہوں زمین تمہارے پانو سے (۱۵۳)

ضیاء الحسن کی اس مجموعے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا سیاسی سماجی شعور بہت پختہ ہے۔ جس معاشرتی نظام میں پل کر وہ جوان ہوئے اس معاشرے کی برائیوں اور خامیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ مابعد نو آبادیاتی اثرات ابھی تک ہم پر غالب ہیں۔ ہم ان سے کسی طور چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ یہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح کسان اناج اگاتا ہے، موسموں کی سختیوں کو سہتے ہوئے اپنے بچوں کے رزق کا بندوبست کرتا ہے مگر اس کے اپنے ہی بچے اس اناج سے محروم رہتے ہیں۔ وہ کپاس کاشت کرتا ہے مگر اس کا اپنا وجود ڈھکنے کے لیے اسے دو جوڑے لباس میسر نہیں ہوتے۔

عبدالکریم جانتا ہے
وہ ساری دنیا کے کسانوں سے زیادہ
کھاد بجلی اور ڈیزل
کی قیمت ادا کرتا ہے
اور ساری دنیا کے کسانوں سے کم
اپنی گندم کی قیمت وصول کرتا ہے
اس کی فصل کا منافع
سرکاری اہل کار اور دلال
لے جاتے ہیں
باقی ماندہ زمیندار
عبدالکریم اپنے گھر
صرف بھوک اور ننگ لے جاتا ہے(۱۵۴)

مابعد نو آبادیاتی دور کے اس عالم میں ضیاء الحسن اپنی تحریروں کی صورت میں رنج و غم کا ذکر کرتے ہیں۔ موجودہ سماجی حالات پر نوحہ کنعاں ہوتے ہوئے وہ مایوس نہیں ہوتے۔ وہ صنعتی اور زر پرست زندگی کے بارے میں بھی تحریر کرتے ہیں، جہاں نفسا نفسی کے باعث آگے بڑھنے اور زائد کمانے کی دوڑ میں رشتے، اقدار اور تہذیبیں دم توڑتی جارہی ہیں۔ ہماری اقدار بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔

کسی موہوم سے اک نقطے پر
زندگی پیدا ہوئی
کسی موہوم سی امید پر ہم
زندگی گزارتے ہیں
کسی موہوم سی اک منزل پر
آخر کار پہنچنا ہے ہمیں(۱۵۵)

مابعد نو آبادیاتی دور میں چونکہ نو آبادکاروں کے جانے کے بعد بھی ان کے آثار باقی ہیں ان کے باقیات لوگوں کے دلوں پر قائم ہیں۔ عہد حاضر کا معاشرہ امن، محبت، خلوص، وفا اور سکون جیسی خصوصیات سے عاری ہو چکا

ہے۔ فطری رنگ جو کائنات کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے، کائنات کی رعنائی اور دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے اب ان کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں۔ خوشبو سے عاری پھول اپنی دلکشی کھو چکے ہیں۔

ستارے تم کہاں ہو؟
کون سی دنیا میں رہتے ہو؟
کہاں پر جگمگاتے ہو؟
مری تاریک دنیا میں
بھلا کب لوٹ کر آؤ گے تم؟
کب جگمگاؤ گے؟
ستارے!
پھول، کلیاں، رنگ، خوش بو، تتلیاں پیاری
تمہارے ساتھ رخصت ہو گئیں ساری(۱۵۶)

نو آبادکار کے جانے سے بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ ہم ان سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، ان سے چھٹکارہ پا لیا مگر یہ صرف دیوانے کا خواب سا ہی تھا۔ ان کے چلے جانے کے باوجود ہم ان کی اقدار، طور طریقوں کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ وطن بھی حاصل ہو گیا، نو آبادکار سے نجات بھی مل گئی مگر ان سب کے باوجود انسانی ذات خوشی اور سرشاری سے عاری ہے۔

کوئی صورت ہی نہیں جینے کی
اب نہ خوشیاں ہیں نہ غم
ایک بے کیف تسلسل
نہ ہمیں جینے کی خواہش، نہ کوئی صورت مرگ
اور جانے ابھی کب تک ہمیں جینا ہو گا
دل میں ایک موسم فرقت تھا
سو جی لیتے تھے
ایک خواہش تھی تجھے پانے کی
ایک آس خواہش تکمیل میں کتنے ہی زمانے گزرے
اب یہ خواہش ہے نہ دل

اک کسک تھی قربت دل
سو وہ اب بھی نہیں
اب خزاں ہے نہ بہار
ایک بے کیف تسلسل میں جیے جاتے ہیں (۱۵۷)

مذکورہ کتاب میں شاعر اس نکتے کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ کسان محنت کش محنت تو کرتا ہے مگر اس محنت کے جائز مناسب معاوضے سے محروم رہتا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں یا این جی اوز جو در حقیقت انسانی حقوق کی بات تو کرتی ہیں مگر ان کی ہر بات کے پس منظر میں ان کا اپنا نفع چھپا ہوتا ہے۔ اور اسی نفع کی بابت سوچتے ہوئے وہ محکوموں کو غربت میں ہی رہنے دیتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

عبدالکریم!
تم یونہی بیل کی طرح محنت کرتے رہے
تو تمہارے بچوں کو بھی یہی میراث ملے گی
آدھی روٹی اور پوری گالیاں
تمہیں اس چکرویو سے نکلنا ہو گا
اپنے بچوں اور ان کے بچوں کی خاطر
اپنے کھاتے سنبھال کر رکھنا عبدالکریم
ایک دن
تمہیں حساب لینا ہے
تڑخے ہوئے ہاتھوں
کمر سے لگے پیٹ
اور بھوک سے بلکتے بچوں کا (۱۵۸)

شاعر مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی دہشت، وحشت اور بربریت کا ذکر کرتے ہیں۔ کسی بھی وقت کوئی بھی سانحہ در پیش ہو سکتا ہے۔ کسی لمحے کوئی بھی حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔ اور موجودہ دور میں ایٹمی طاقت کے استعمال سے زندگیاں اور سستی ہو گئی ہیں۔ غریبوں کا خون پانی سے بھی سستا ہو گیا ہے۔ ایسے میں ہر طرف خوف کے پہرے ہیں۔ گھروں سے نکلنا اور دو گھڑی دوستوں کے درمیان بیٹھنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں بصارت سے محروم کر دیا گیا ہے

یا منظر سے حسن غائب ہو گیا ہے
ایک لامتناہی سیاہ پردہ ہے
جس سے ماتمی لباس تیار کیا جا سکتا ہے
اور احتجاجی پٹیاں بنائی جا سکتی ہیں
ہمیں ایک سورج درکار ہے
جس سے
معطل بہار کے پھول کھلائے جا سکیں
جہالت کے پردے میں چھپا
ایک دن طلوع ہو سکے (۱۵۹)

بالکل ایسے ہی انداز میں ایک اور نظم میں وہ زندگی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"زندگی کے خلاف ہم نے
نیو کلیائی ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں
نسلی، لسانی اور جغرافیائی تضادات گھڑ لیے ہیں
کہتے ہیں یہ دنیا بھی
کسی حادثے کے نتیجے میں اتفاقاً وجود میں آئی تھی" (۱۶۰)

ضیاءالحسن غزل میں بھی کمال مہارت رکھتے ہیں۔ان کا شعری مجموعہ "بار مسلسل" غزلوں پر مشتمل ہے۔غزل کا ہر شعر اگرچہ پوری اکائی ہوتا ہے۔مگر ضیاءالحسن کی پوری غزل ایک ساتاثر ایک سی وحدت رکھتی ہے۔ایسے میں ان کی کہی گئی غزل کو غزلِ مسلسل بھی کہہ سکتے ہیں۔امجد طفیل ان کی غزل کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"بارِ مسلسل کی غزلوں کے مطالعے سے ایک بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ضیاءالحسن نے تصوف کا مطالعہ کیا اور اس کے گہرے فکری اثرات قبول کیے۔ان کی غزلوں میں عشق ایک ایسے رویے کے طور پر ابھرتا ہے جو صرف کسی ایک فرد کے لیے مخصوص جزبات کا نام نہیں بلکہ کائنات پر محیط ایک قوت ہے۔انہوں نے عشق کے روایتی تصور سے قوت حاصل کر کے اپنے خارج میں موجود انتشار، خوف، دنیاداری، ایک دوسرے سے بے

اعتنائی، اعنانیت اور مادی اشیا سے جذباتی وابستگی جیسے منفی رویوں کو رد کیا ہے
۔" (۱۶۱)

"بار مسلسل" کی غزلوں میں جہاں موجود حالات کی تلخی، ناخوشگوار واقعات کا ذکر موجود ہے اس کے ساتھ مسئلہ وجودیت ان کی غزلوں میں واضح طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ مگر در حقیقت بار مسلسل کی غزلیں عشق حقیقی کی طرف میلان رکھتی ہیں۔ عصر حاضر کے حالات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ظلم و جبر کا دور دورہ ہر طرف ہے۔

کیسے گزرے گا ضیاء دن یہ قیامت جیسا
کیسے گزرے گی بھلا رات جو طوفانی ہے (۱۶۲)
زیست کرنے کے لیے روز مرتے ہیں
بے بسی مقدر ہے یاں ہمارا بھی (۱۶۳)
جاں پہ آسیب ہے کیسا کہ یہ سہمی ہوئی ہے
دل پہ کس دیو کا سایہ ہے کہ مرجھایا ہوا ہے (۱۶۴)

شاعر اپنی غزلوں میں محبت، امن اور آشتی کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ مابعد نو آبادیاتی دور اگرچہ حالات کی سختی کا دور ہے مگر ایسے میں محبت اور امن سے رہ کر، محبت کے نغمے گا کر حالات کی سختی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

اک شہر محبت جیسا ہو
اک خوابوں جیسی دنیا ہو
اک حسن و جمال کی وادی میں
اک پیار کا دریا بہتا ہو (۱۶۵)
کھوئی ہوئی منزل کی خواہش زندہ کرتی ہے
ایک نئی دنیا کے سب کو خواب دکھاتے ہیں (۱۶۶)

انہوں نے اپنی شاعرانہ تخلیقات میں واضح انداز میں غریبوں کا ذکر کیا ہے۔ کسانوں، مزدوروں کا ذکر اور ان سے نفرت کا ذکر واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اپنی شاعری کے حصے " عبدالکریم " اور " وجود" میں انہوں نے نہایت عمدگی سے کسانوں کے دکھوں کا ذکر کر کے موجودہ مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو واضح کیا ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور سہل ہے۔

سعادت سعید: عہد حاضر میں ادب کو ترقی پسند نظریے سے ملانے کا کام معاصر ترقی پسند شاعر سر انجام دے رہے ہیں۔ اس نظریے سے جہاں ادب کو نیا افق ملا، وہیں معاصر مسائل بھی منظر عام پر آئے۔ ایسے مسائل جس کا ذکر تاریخ میں اس سے قبل نہیں ملتا تھا۔ ادب کو اس دور کے مسائل سے مربوط کر کے پیش کرنے کا فن ترقی پسندوں کا خاصہ ہے۔ جب تک کسی بھی ملک کے سیاسی و سماجی مسائل کو اس دور کے ادب یا شاعری کی بدولت اجاگر نہ کیا جائے اس وقت تک وہ مسائل اپنا حل نہیں پا سکتے۔ ترقی پسندوں نے سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کی طرف سر عام اشارہ کیا ہے۔ اور نہ صرف اس کا ذکر کیا ہے بلکہ سرمایہ داری نظام کے تحت رونما ہونے والے مسائل کو اپنی تحریروں میں جگہ دیتے ہوئے حکومت وقت سے ان مسائل کے حل کا مطالبہ بھی کیا ہے۔

عہدِ حاضر میں منظر عام پر آنے والے مسائل کافی حد تک نو آبادکاروں کی دین ہیں۔ نو آبادکار آتے گئے ،زمینیں لیتے گئے ،کالونیاں قائم کر کے ان پر قابض ہوئے اور نہ صرف قابض ہوئے بلکہ مقامی آبادی کا استحصال بھی کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے مقامیوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ ہم آپ سے افضل ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ جیسے غیر مہذب اور ناخواندہ کو تہذیب یافتہ بنائیں۔ اس فرض کی تکمیل کے لیے انہوں نے معاشرے میں رسم ورواج کی تبدیلی کو یقینی بنایا نئی اصلاحات نافذ کرائیں اور نہ صرف نافذ کرائیں بلکہ ان پر عمل بھی یقینی بنایا۔

مابعد نو آبادیاتی نظریات کے فروغ میں سعادت سعید کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ادب میں ان کا پسندیدہ موضوع نو آبادیات ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور تحریریں رقم کیں۔ نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر اور سینئر صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ ان کی شاعری میں بھی ما بعد نو آبادیات کی جھلک ملتی ہے۔ اردو ادب میں مابعد نو آبادیات اب ایک اصطلاح کے طور پر رائج ہو چکی ہے ۔ اس حوالے سے اس پر آرٹیکل، تحریریں اور، مقالے منظر عام پر آرہے ہیں۔ عہد حاضر کے ترقی پسند شاعر سعادت سعید کی دو تخلیقات " بانسری چپ ہے " اور "شناخت" میں ہمیں مابعد نو آبادیاتی عناصر ملتے ہیں ۔ اپنی شاعرانہ تخلیقات میں عہد حاضر کے انسان کی غلاموں کی سی زندگی کا ذکر کرتے ہیں کہ انسان آزاد ہونے کے باوجود غلاموں کی سی زندگی گزار رہا ہے۔ ہر جگہ وہ کسی نہ کسی طور پابہ زنجیر ہے۔ نظم برنگ قیس میں شاعر لکھتے ہیں:

برنگِ قیس دنیا میں کسے حاصل ہے آزادی
کہ جس ماحول میں رہتے ہیں اس میں
فکر کا مکتب کہ جذبے کے مکاتب
فرد کا مذہب اداروں کے مذاہب
اپنی آزادی کا دم بھرنے سے خائف ہیں
عوام الناس ایک دوجے کے مغلوب و اسیر
خود سے بھی سہمے ہوئے
جیسے ان کے سر پہ چنگیزی سائے
ننگی تلواریں، دمکتی تیز سنگینیں لیے
ایستادہ ہوں
ذرا سی جنبش خاطر بھی ان کو
موت کے تاریک غاروں میں دھکیلے گی
یہی ان کا گمان ہے اور یہی ہے آسماں ان کا(۱۶۷)

معاشرتی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں خلوص معاشرے سے ناپید ہو چکا ہے۔ انسان ایک دوسرے سے اپنی غرض کی خاطر تعلق رکھے ہوئے ہیں، ان کا رشتہ دوسرے لوگوں سے غرض کا رشتہ ہے۔ جہاں غرض پورا ہوا، اپنا مطلب نکلا وہیں رشتہ ختم۔ رشتوں سے خلوص اور مٹھاس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور یہ سب مابعد نو آبادیات کے اثرات ہیں۔ روپیہ پیسہ خونی رشتوں پر غالب آ چکا ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ لکھتے ہیں:

مروجہ رشتوں کے تیز چاقو
بے دردی سے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے
میں مصروف ہیں
راءج الوقت سکے کھوٹے ہیں
اور نئے سکے نایاب ہیں
رائج الوقت کرنسی کے وسیلوں سے
روشنی خریدنے کی خواہش نے
ہمارے سینوں کو روشن اندھیروں سے

بھر دیا ہے
مروجہ رشتوں کی چھتریوں تلے
ماؤں کا پیار نہیں ملتا!
باپ کی شفقت
بہنوں کی انسیت اور بھائیوں کا اخلاص
تجارت ہو کے رہ گیا ہے(۱۶۸)

سعادت سعید نثری نظموں کا سہارا لیتے ہوئے ،معاشرتی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔نو آبادکاروں کے چلے جانے کے باوجود ابھی تک اثرات ہم پر قائم ہیں اور انہی اثرات کا ذکر سعادت سعید نے نظموں کی صورت میں کیا ہے۔معاشرتی مسائل کو اجاگر کر کے نظم کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔نثری نظم کے حوالے سے احمد سہیل لکھتے ہیں :"اردو میں نثری شاعری لسانی تشکیلات کی فکری ساخت اور اس کی لسانی حسیت سے زیادہ قریب بھی تھی۔جس کی وجہ سے اردو کی شاعرانہ فضا میں نثری نظم کو حرارے ملے اور ایک باغیانہ رجحان کے ساتھ ستر کی دہائی میں ریڈیکل شعری رویوں کے ساتھ ابھری اور وہ نوجوان نسل جو اردو شاعری کے متروک ماپال کلمات سے بیزار تھی اس نسل نے نثری نظم کو خوش آمدید کہا۔"(۱۶۹) سعادت سعید اپنی شاعری میں ما بعد نو آبادیاتی دور میں ہونے والی غربت ،مفلسی اور نا انصافی کا ذکر کرتے ہیں۔غریبوں کے دکھ درد کو اپنی نثری نظموں بیان کرتے ہیں۔ادب سے ہمیشہ تنقید حیات کا کام لیا گیا۔اس کو زندگی کا ترجمان بنا کر پیش کیا گیا اس میں عدل اور مساوات کو جگہ دیتے ہوئے تبدیلی کا ذکر بھی کیا گیا۔ترقی پسند شاعروں کے نزدیک شاعری محض عشق و عاشقی پر بحث کرنے کا نام ہی نہیں ہے،بلکہ اس شاعری سے حیات کے مسائل کے حل کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ما بعد نو آبادیاتی دور میں پروان چڑھنے والی شاعری سے ملک میں غربت ،افلاس ،بھوک اور پسماندگی کے خاتمے کو یقینی بنایا گیا۔اس کے لیے قلم کا سہارا لیتے ہوئے انقلابی راہ اپنائی گئی۔

بندگی کے بھی دو ہی طبقے ہیں
ایک سرمایہ دار ایک غریب
چیختے ہیں معاشرے کے دکھ
انکا سرچشمہ جانتے ہیں سب
قصرِ انصاف میں ہمانہ رہا

خوفِ فریادِ بے نوا نہ رہا(۱۷۰)

سعادت سعید اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ظلم و جبر کا ذکر کرتے ہیں۔ ظلم و جبر کے باعث ہونے والی بھوک اور ناداری ان کی نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔

تمہیں کیا معلوم جبر کی ہواؤ!
تمہیں کیا معلوم
انتڑیوں کے چراغ
بجھ رہے ہیں
اعضاء جسموں کی ڈالیوں سے
جھڑ رہے ہیں!!(۱۷۱)

ایک اور نظم (زمیں کہ ہماری) میں وہ ظلم و جبر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

چاروں جانب قبریں ہیں
ان گنت قبریں
مظلومیت کے کتبوں
محرومیوں کے پھولوں سے
آراستہ قبریں
کم مائیگی بے نوائی کے
پودے اگاتی قبریں!
ہمارے خواب اور قسمت میں
کائنات کے اسرار کھولتی
آنکھوں کی قبریں بھی ہیں(۱۷۲)

معاشرے میں حاکم اور محکوم کا فرق، زیر دست اور بالا دست کا فرق، پرولتاریہ اور بورژوا طبقے کا فرق جہاں ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ وہیں پر معاشرے میں رونما ہونے والے مسائل کا سبب بھی بنتا ہے۔ معاشرے میں رہنے اور اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اپنی مدد آپ کے جذبے کو فروغ دینا ناگزیر ہے۔ اگر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا جائے، محنت نہ کی جائے، ہمت، طاقت اور کوشش کا مظاہرہ نہ کیا جائے تو تبدیلی کا عمل محض خواب

بن کر رہ جاتا ہے۔ایسے معاشرے کی مدد کے لیے دوسرے ممالک بھی آگے نہیں بڑھتے،اور آسمانی مدد بھی انہی کا ساتھ دیتی ہے جو اپنی مدد آپ کے جذبے سے سرشار ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔

ترقی پسند ادب کے تحت معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا گیا اور ان کے حل کے لیے کوشش کی گئی۔اس حوالے سے حمیرا اشفاق کا کہنا ہے:

> "ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے۔(ان مسائل میں غالبا طبقاتی کشمکش اور دینوی آسائشوں کی تقسیم سب سے زیادہ اہم ہیں)اور سماج میں ایسے فکری، جزباتی یا عملی رجحانات پیدا کرنا ہے جن سے ان مسائل کا حل نسبتاً آساں ہو جائے۔"(۱۷۳)

سعادت سعید بھی ان ہی معاشرتی مسائل کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔اپنی شاعری میں وہ ماضی کا ذکر بھی کرتے ہیں جب ہر طرف امن اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ہر طرف سکھ اور چین تھا،کوئی کسی کا دشمن نہ تھا ۔وہ لکھتے ہیں:

اٹھ گیا سینہ گیتی سے وہ انسان کہ جو
دور تہذیب کا عنواں ہوا کرتا تھا
آؤ فریاد کریں
کسی معبد میں چلیں
یا کسی میخانے میں
آنسوؤں سے اسے آباد کریں
اس کے جانے کا سبب یاد کریں (۱۷۴)

اپنی نثری نظموں میں وہ انسانی تقدیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ظلم و جبر سہنا، معاشرتی طبقاتی کشمکش سہنا اور اذیت بھری زندگی گزارنا انسانی تقدیر نہیں ہے۔بلکہ یہ سب ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ہم کو زبردستی مجبور کیا گیا ہے کہ ہم ان ظالموں کے خلاف سر جھکا لیں اور ہونٹ سی لیں۔وہ لکھتے ہیں:

آنسو ہماری تقدیر نہیں
اختیار نہیں
ہمارا اختیار!
بے آسرا آس

خود حفاظتی کی آرزو سے محروم آس
رنگ برنگے ملمع کا عظیم الشان شہروں میں
ہجوم کے بطن میں
ہولناک سناٹوں کے خیمے تان رہی ہے
کون کہے؟
یہ ہمیں کون کہے؟
ہم معصومی اور بے شعوری کے
آہنی کوڑوں کی
سزا بھگت رہے ہیں(۱۷۵)

ظلم کے خلاف لکھتے ہوئے ظالم حکمرانوں کے لالچ اور ہوس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ تو آسمانوں، سیاروں، ستاروں کے
باشندے ہیں
زمین کے حکمراں ہیں
آسمانی کی حکمرانی سے
محروم ہیں
ان کی بے روح آوارہ چمڑیوں میں
جلتی بجھتی آنکھیں
کہکشاں کی رعایا ہیں
وہ تو سورجوں کے
تخت و تاج چھیننے کے
چکر میں ہیں(۱۷۶)

عہد حاضر میں مابعد نو آبادیاتی دور میں ترقی پسندی در حقیقت سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور کی ان بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جہاں اکثر انسانوں کے مفادات زر دار طبقے کے مفادات کے مقابلے میں کم تر تصور کیے جاتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی میں بالادست طبقے کا استحصال اور اس کا جابرانہ کردار منظر عام پر لانا اکیسویں صدی کا اہم خاصہ ہے۔ عہد حاضر کی شاعرانہ خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مابعد نو آبادیاتی دور میں ظلم

و جبر کے خلاف بر سر پیکار ہونا اور جانتے بوجھتے ہوئے ان سے چھٹکارا کسی طور ممکن نہیں مگر پھر بھی ان کے خلاف لکھنا معاشرے کو آس دلانے کا ایک طریقہ ہے۔ ہمارے چاروں جانب مابعد نو آبادیاتی اثرات اس حد تک اپنی جڑیں مضبوط کر چکے ہیں کہ ہم ان سے کسی طور نہیں بچ سکتے۔

مکڑیوں نے چاروں جانب جالے تان لیے
مہین، ریشمی نہ ٹوٹنے والے جالے
ہم مجبور ہو گئے ہیں محصور ہو گئے ہیں
ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی
ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں(۱۷۷)

ایک اور جگہ نو آبادکاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقت کی سوئیاں
اپنی انتہا کو چھو چکی ہیں
نیم خوابی نے
ہمارا شعور ہم سے چھین لیا ہے
ظلم کی شعاعیں
ہمیں تاراج کر چکی ہیں
ناداری کے سیہ پانیوں سے
ویرانیاں جھانک رہی ہیں
مردے اٹھائے جانے کا
وقت قریب ہے(۱۷۸)

ایسے حالات میں بھی سعادت سعید آس اور امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ پر امید ہیں کہ اچھے دن آئیں گے ،روشن مستقبل ہماری نسلوں کا منتظر ہے۔ ہماری وہ نسلیں جنھوں نے نو آبادکاروں کے ظلم و جبر کا سہا ہے، ان کو برداشت کیا ہے۔ وہ وقت دور نہیں کہ ان کی آنے والی نسلیں خوشی اور امن کے دن دیکھیں گی۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں چاہیے کہ آنے والوں کے لیے راہ ہموار کریں۔ ایسی راہ جس پر چل کر وہ مستقبل کو روشن اور منور پا سکیں۔

پگھلنا جب مقدر ہے تو

کیوں نہ بادل بنیں
ساون کے بادل
قہر کا سورج بجھاتے بادل
کھیتیاں اگاتے بادل
زمیں میں دھنسنا ہی
اگر مقسوم ہے تو
کیوں نہ اپنی ہڈیوں کے
فرش تیار کریں(۱۷۹)

اپنی کتاب "بانسری چپ ہے" کی ایک نظم میں وہ آنے والے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی نسلوں کو ظلم اور جبر سے محفوظ رکھنے کا عزم کرتے دکھائی دیتے ہیں:

ہمیں اپنے مردہ جسموں میں گھرے
سرد ڈھانچوں کو
تازہ لہو کی توانائیوں میں بھگونا ہے
ان میں نمو کے تحیر کو بیدار کرنا ہے
آنکھوں کے کاسوں کو روشن سمجھنا ہے
انبوہ کے منجمند رقص کو
تیوروں کے نئے سلسلوں کی
خبر بھی تو کرنا ہے
اپنی جواں نسلوں کو
منحوس تہذیبی رسموں سے محفوظ رکھنا ہے(۱۸۰)

عصر حاضر کے نامور شاعر سعادت سعید کی تحریریں ان کے ترقی پسند شعور کو واضح کرتی ہیں۔ اپنی بات کو منوانے کے لیے وہ قرانی آیات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں کہیں کہیں تضمین جیسی خصوصیات بھی ملتی ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو واضح انداز میں عوام تک پہنچاتے ہیں۔ مگر اسلوب کی پیچیدگی عام قاری کے لیے مشکل پیدا کرتی ہے۔ پیچیدہ الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف شاعری کے حسن کو بڑھایا ہے بلکہ

اس کے ساتھ ساتھ مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو بھی بیان کیا ہے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں ظلم ،جبر،نا انصافی،طبقاتی کشمکش کو بیان کیا ہے ان کی تحریریں ان کے ترقی پسند شعور کا جاننے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

کاشف رضاسید: سرگودھا سے تعلق رکھنے والے عہد حاضر کے شاعر کاشف رضاسید ۱۹۷۳ء میں پیدا ہوئے ۔آپ کا تعلق تدریس کے شعبے سے تو نہیں مگر آپ کی شاعری آپ کو اہل علم میں نمایاں کرتی ہے۔آپ کا تعلق میڈیا سے ہے۔اُپ جیو چینل سے بطور سینئر پروڈیوسر وابستہ ہیں۔اُپ کی شاعری کی پہلی کتاب "محبت کا محل وقوع" ہے اس مجموعے کی نظمیں اور غزلیں رومان سے تعلق رکھتی ہیں۔لیکن اس رومانس کے علاوہ وہ اپنے اردگرد کی دنیا سے بھی بے خبر نہیں۔اس دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی واقف ہیں اور انہی تبدیلیوں کا ذکر وہ شاعری کی صورت میں کرتے ہیں۔عہد حاضر کے اس شاعر کی شاعرانہ فضا بھی مابعد نو آبادیاتی نظام کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔وہ ترقی پسند شعور کے حامل ہیں اور اپنی شاعری میں اسی شعور کی وضاحت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی نظمیں اور غزلیں ان کے ترقی پسند شعور کی ترجمان ہیں۔ان کی نظموں میں ہمیں ایک آس اور امید کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔وہ پرعزم اور پرہمت ہیں اور حالات کا سامنا دیدہ دلیری سے کرنے کا عزم بھی رکھتے ہیں۔وہ حکمرانوں کو للکارتے ہیں اور ان کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ تم جیسے مرضی ظلم وستم ڈھاؤ ہم پھر بھی زندہ رہیں گے اور اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک تم کو ناکام ونامراد نہ دیکھ لیں۔وہ لکھتے ہیں:

چاہے ہماری رہائش کے لیے سولیاں مہیا کر دو
چاہے ہماری محبوباؤں کو ہم سے برگشتہ کر دو
چاہے ہمارے میدان دشمنوں کے حوالے کر دو
چاہے ہمارے پیاروں کو چھین لو
زندہ رہیں گے
زندہ رہیں گے ہم (۱۸۱)

اپنی نظموں میں وہ دکھ اور درد کو موضوع بحث بناتے ہوئے اس پر نوحہ کنعاں ہیں۔وہ محکوموں کے دکھ میں مبتلا ہوتے ہوئے اس بات سے نالاں ہیں کہ اچھے اور معیاری عہدے طاقتور اور حکمرانوں کے زیر سایوں کو ہی کیوں دیے جاتے ہیں۔کوئی بھی شخص جتنی بھی محنت کر لے اس سے محروم کیوں رہتا ہے۔اپنی نسل اور اپنے پیاروں کو ہی عہدوں سے نوازنا کہاں کا انصاف ہے۔ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے:

"نسل پرستی کا جذبہ معاشرے میں نہ تو فطری ہے اور نہ ہی مستقل۔ یہ ایک
غیر فطری تخلیق ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے غیر مساوی درجہ
بندی کو مستقل طور پر قائم کیا جائے قوموں کی پس ماندگی کی بنیادی وجہ یہ
ہے کہ وسائل کی تقسیم مساوی بنیادوں پر نہیں ہے۔" (۱۸۲)

زمانہ خواہ کوئی بھی ہو بورژوا طبقہ ہمیشہ ہی پرولتاریہ کو اپنے زیر رکھنے کے چکر میں رہتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ ان پر ظلم کرتا ہے اور انہیں ہر طرح کا جبر سہنے کا عادی بناتا ہے تاکہ وہ کسی قسم کی بغاوت کے لیے سر نہ اٹھا سکیں۔

جبر
لغت میں رینگتا پھرتا ہے
ہر نئے لفظ کو چاٹنے کے لیے
اسے اپنے جملوں میں استعمال کرنے کے لیے (۱۸۳)

ایک اور جگہ شاعر مابعد حکمرانوں کے ظلم و جبر کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

ہم تمہارے بوٹوں سے کچلی جانے والی فٹ پاتھ پر
تمہارے ٹینکوں سے روندے جانے والے میدانوں میں
تمہارے تلوں سے بچھائے جانے والے کارپٹس پر اگیں گے
ہم ان دستاویزات پر اگیں گے جن سے تم منحرف ہو گئے
ان معائدوں سے اگیں گے جن سے تم نے روگردانی کی
ہم تمہاری سنگین کی نوک پر
تمہارے تکبر کی ناک پر اگیں گے (۱۸۴)

مابعد نو آبادیاتی دور میں سیاسی انتشار، خلفشار اور بدامنی نے ہر طرف ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ لوگوں کا امن ، سکھ اور چین سب اس سے متاثر ہوئے۔ ہر طرف دکھ درد کا پہرہ تھا۔ اس انتشار کی فضا میں لوگوں کے آپس کے تعلقات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے تعلقات پر بھی اثر پڑا وہ بھی آپس میں مل کر مسائل کا حل تلاشنے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر اتر آئے۔ شاعر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

ہم ایک سرخ رومال

جیب میں رکھتے ہیں
اور ایک سفید رومال
ہوا میں لہرا دیتے ہیں
ایک علاقے میں ہمیں ظالم کہا جاتا ہے
دوسرے علاقے میں
ہم خود کو مظلوم کہتے ہیں(۱۸۵)

ایک اور جگہ پر وہ دکھ درد اور پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس انداز میں لکھتے ہیں:

دکھ بکھرا ہوا ہے
سڑکوں پر سر جھکائے
آہستگی سے چلیے
خاموشیاں بننے میں
جب ہر طرف شور بکھرا ہوتا ہے(۱۸۶)

کاشف رضا سید کی شاعری میں ہمیں دھرتی کے دکھ دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں دھرتی کے ساتھ ساتھ رومانویت پر بھی بات کی ہے۔ ان کی تخلیقات میں ہمیں نہ صرف معاشرے کے دکھ، درد اور مسائل کا ذکر ملتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ محبوبہ کا ذکر بھی نہایت خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ وہ عہد حاضر کے سیاسی حالات سے اس حد تک نالاں ہو چکے ہیں کہ وہ رب سے آزادی اور شعور نہیں بس زندہ رہنے کے لیے سانسیں مانگتے ہیں۔ ان کی تحریریں انہیں اپنے منفرد انداز کی بنا پر دوسروں سے نمایاں کرتی ہیں۔

ارشد معراج: سماج میں رہتے ہوئے نو آبادیاتی اثرات سے خود کو بچایا جا سکے ایسا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ معاشرہ انسانوں سے تشکیل پاتا ہے اور انسانوں کے مل جل کر رہنے سے معاشرتی اخوت برقرار رہتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی اثرات ہمیں نہ صرف دیہی علاقوں میں بلکہ شہری علاقوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے اور رعایا کے درمیان فرق قائم رکھنے اور خود کو افضل سمجھتے ہوئے طاقت ور اور محکوم کا تصور دیا۔ جس کے لیے انہوں نے طبقاتی تقسیم کو رائج کیا۔ بنیادی طور پر سماج میں طبقوں کی تقسیم کا عمل ہمیشہ سے رہا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سماج میں رہتے ہوئے غریب طبقے کا استحصال کیا جائے۔

جب کوئی آفت آنے کو ہو
ڈنگر پکھنو سارے ہجرت کر جاتے ہیں
سفر سلامت
رستے آپ بتا دیتے ہیں کدھر کو جائیں
لیکن جو پل پڑتا ہے مجھے ہجر کی سولی والا
کیسے اس کو پار کریں(۱۸۷)

ایک اور نظم میں شاعر ظلم و جبر کی رات کٹنے کے منتظر ہیں:

سکھی کب رات گزرے گی
سکھی کب پی ملن ہو گا
مری جاں سولیوں پر ہے
سکھی تن تھک گیا ہے
من بھٹکتا ہے
مرے پاؤں کی پائل بھی
زمانے سے یونہی خاموش بیٹھی ہے
مری آنکھیں بھی پتھر ہیں(۱۸۸)

سماج میں رہتے ہوئے ہم آس پاس کے لوگوں کے رویوں کو محسوس کرتے ہیں۔ ایک طاقتور اپنی طاقت کا زور دوسروں پر آزماتے ہوئے ان کے حقوق غصب کرتا ہے اور انہیں خود سے کم تر گردانتے ہوئے ان پر ظلم و جبر کرتا ہے خود کو آقا اور کمزوروں کو غلام تصور کرنے لگتا ہے۔ قاسم یعقوب اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"سماج میں بہت سی تبدیلیاں آتی رہیں مگر سب سے خوفناک تبدیلی ذہنی اشرافیائی طاقت کے حصول کی تبدیلی تھی انسان نے خود کو کسی طبقے کے حصار میں لپیٹنے کی بجائے ذہنی طور پر دوسروں کو غلام اور محکوم بنانے کی کوشش کر دی۔ یہ تبدیلی جدید انسان کا المیہ تھا۔"(۱۸۹) معاشرے میں رہتے ہوئے تمام انسان برابر ہیں۔ کوئی کسی کا آقا یا غلام نہیں۔ انسانی صلاحیتوں یا ذرائع پیداوار کی دسترس رکھنے کے باعث کوئی بھی طبقہ دوسرے سے افضل یا اعلیٰ نہیں ہے۔ سماج میں سب سے کم تر اور گھٹیا تصور طاقت کا تھا جس کو استعمال کرتے ہوئے کمزوروں کو کچلا جاتا، ان کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا جاتا اور انہیں دو وقت کی روٹی کے لیے ذلیل و رسوا کیا جاتا۔ ارشد معراج لکھتے ہیں:

درد ہی درد ہے
روشنی ریگزاروں میں جلتی رہی
جسم ایندھن بنا
اور منصور نے ایک کروٹ لی
درد بڑھتا گیا
پیڑ سے ٹوٹ کر شاخ روتی رہی
فاختہ کھو گئی (۱۹۰)

دو وقت کی روٹی کے عوض سرمایہ داروں کی جھاڑ سننا، گرمی سردی کی پرواہ کیے بغیر بلکہ موسموں کے سرد گرم سے بے خبر ہوتے ہوئے مزدور محنت کرتا ہے تاکہ گھر کا چولہا جل سکے۔ ارشد معراج لکھتے ہیں:

ان کو کیا کہے گرمی
ان کو کیا کہے سردی
گردنیں جھکا کر
چل رہے ہیں مدت سے
جل رہے ہیں مدت سے
رنگ ہیں سیہ کالے
دانت زرد ہیں ان کے
آنکھ میں ندامت کی کون سی قیامت ہے؟
نسل کے دراوڑ ہیں
ان کے باپ دادا بھی اینٹ ہی بناتے تھے
اینٹ ہی بناتے ہیں
اینٹ ہی بنائیں گے (۱۹۱)

مثالی معاشرے میں ہر فرد دوسرے کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ مگر مابعد نو آبادیاتی نظام میں ایسا محسوس کیا جانے لگا کہ غریب حکمرانوں کے ماتحت ہیں اور حاکم اس سے افضل اور طاقت ور ہے۔ اس لیے مزدور کام کر رہا ہے اور اپنے حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے وہ رات دن کی پرواہ کیے بغیر جانوروں کی طرح مشقت کرتا ہے۔ ارشد معراج کے ترقی پسند شعور میں یہ بات کسی گناہ سے کم نہیں سمجھی جاتی کہ مزدوروں کو کم تر اور نیچ

جانا جائے۔ان کی نظموں میں بھی ہمیں یہ تاثر دکھائی دیتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم ان کی نظموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ایک بڑی تعداد ایسی نظموں کی بھی ہے جو زمانے کی بے مہری اور حبس زدہ موسموں میں خود سے بچھڑی محبت کے نوحے ہیں۔ان تمام نظموں کا مشترک عنصر وہ شعریت ہے جو اچھوتے اور غیر مانوس لفظوں کو بھی قابل قبول بنا دیتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ شعریت ہی شاعری کی شرط اول ہے "۔(۱۹۲)

مابعد نو آبادیاتی نظام کے تحت ہم نے کامیابی اور ناکامی کے تصورات قائم کر لیے ہیں۔ دولت، حسن، کامیابی اور تعلیم کے تصورات کو نو آبادکاروں سے منسوب کیا جانے لگا، حالانکہ ایسا بالکل غلط تھا۔ گاؤں کا تعلیم یافتہ شخص شہر کے پڑھے لکھے سے زیادہ ذہین فطین ہو سکتا ہے۔ مگر اس تصور کو معاشرے میں تب ہی جگہ مل سکتی ہے جب ہم تناظر یا تقابل سے اشیاء کا جائزہ لینا ترک کریں گے۔مابعد نو آبادیاتی دور میں کامیابی اور ناکامی کے ساتھ ساتھ حاکم اور محکوم کے تصور کو بھی ابھارا گیا۔ اور یہی وہ تصور تھا جس کا خاتمہ آج تک نہ ہو سکا۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود حکمران اور زردار طبقہ محروم طبقے کو نیچا اور کم تر دکھانے کے چکر میں رہتا ہے۔ ایسے عالم میں کمزور طبقہ خدا سے التجا کرتا ہے کہ ان پر ظالم حکمران کو کسی آزمائش کی صورت ہم پر مسلط کیے گئے ہیں ان کا خاتمہ ہو جائے۔ ارشد معراج لکھتے ہیں:

چاچا!
خدا دا شکر کر دے ہاں
جے اس ساڈے تے ایس از میش پائی ھے
جو او کر دا ہمیشہ، ٹھیک ہی کر دا
پر اے دسیں جو نمبر دار مر سی
وت اے او کھت گھٹ ویسی (۱۹۳)

شاعر محکوم طبقے کی زبان بنتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہم بھی کیا ہیں؟
روکھی سوکھی گڑ کی بھیلی جیب میں رکھی
اور صدیوں کی گٹھڑی سر پر

روز سویرے انگڑائی لے نام خدا کا جی اٹھتے ہیں
شام تلک مر جاتے ہیں (۱۹۴)

ارشد معراج ایسے سماجی بگاڑ کے باوجود نا امید اور مایوس نہیں ہیں۔ان کی تحریروں میں ہمیں آس اور امید جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔اسی آس اور امید کے بل بوتے پر ہی ہر طرح کا ظلم اور جبر برداشت کیا جاتا ہے ۔تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ پر امید ہو کر ہی حالات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔اور یہ امید ہی ہے جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی قدم ڈگمگانے نہیں دیتی۔وہ لکھتے ہیں:

پانی ڈھونڈو، سائے ڈھونڈو
جاگو گرم ہواؤں سے
اپنی گٹھڑی آپ اٹھاؤ
دھوپ کڑی ہے بدن بچاؤ
راہ کی اود بلاؤں سے (۱۹۵)

ایک اور نظم میں آنے والے روشن دنوں کا ذکر کرتے ہیں کہ سویرا ہو گا، نیا، اجلا اور روشن سورج ضرور طلوع ہو گا اور سارے عالم پر اپنی تب و تاب بکھیر تا ہوا دھ درد اپنے اندر سمیٹ لے گا۔

مگر جب دن چڑھا تو یہاں منظر نیا ہو گا
ہزاروں نور برسوں کی مسافت سے مسافر لوٹ آئیں گے
ہمارے واسطے پیغام لائیں گے
ہمارے جینز کی ابجد سکھائیں گے
ستارے پھر سے روشن ہو رہے ہیں
کائناتی وسعتوں میں روشنی کا راج ہے
روشنی کی ابتداء بھی روشنی ہے
انتہا بھی روشنی ہی ہے (۱۹۶)

ایک اور جگہ امید کے روشن دیے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ دیکھو!
دور میداں میں دیا روشن ہے مدھم سا
وہاں کوئی تو ہو گا۔۔۔ہاں

ہمیں اس پاس جانا ہے (۱۹۷)

نو آبادکاروں کے فریب اور لالچ کا ذکر کرتے ہوئے ارشد معراج لکھتے ہیں کہ ان کے آنے کا اصل مقصد اصل میں کوئی اور تھا مگر انہوں نے ظاہر یہ کروایا کہ وہ مقامیوں کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے ہیں تاکہ ان کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنا سکیں۔ اسی بنا پر انہوں نے آہستہ آہستہ قدم جمانے شروع کر دیے اور ہم بے خبر ہی رہے کہ کب وہ اپنی اقدار، اپنے رسم ورواج اور اپنی زبان ہم پر مسلط کر گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

ہم جان ہی نہ پائے
قزاق نیلی آنکھیں
نمکین پانیوں سے وہ کھارے پانیوں تک
جس نے بگل بجائے
سوچوں کے ہنس اس نے رکھے ہیں رہن ایسے
پہچان ہی نہ پائے (۱۹۸)

ارشد معراج کی شاعری میں ہمیں زردار اور حاکم طبقے کے لیے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ وہ زردار طبقے کے رویے سے نالاں ہیں۔ اپنی تحریروں میں وہ حالات کی ابتری کا ذکر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ روشن صبح کی امید بھی دلاتے ہیں کہ سویرا ہو گا اور اجالا نمودار ہو گا۔ ہمیں ان کی مابعد نو آبادیاتی تحریروں میں عہد حاضر کے مسائل واضح نظر آتے ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے وہ قلم کے ذریعے آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کے ترقی پسند شعور میں ہمیں محکوموں کی فکر اور ان کے لیے دادرسی جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔

حارث خلیق: عہد حاضر میں معاشرے، میں اثر ورسوخ برقرار رکھنے کے لیے طاقت کا وجود ناگزیر ہے۔ اسی طاقت کے بل بوتے پر کمزوروں کو بے کس اور بے بس بنایا جاتا ہے۔ ان کی محنت سے کام لیتے ہوئے انہیں اس قدر لاچار اور مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور امراء کے آگے بولنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ایسے میں محکوم طبقے کے لیے شعراء اور ادباء منظر عام پر آئے۔ اپنی تحریروں سے محکوموں کے لیے آواز بلند کی۔ اور ان کے دکھ میں شریک ہوئے۔ انہی شعراء میں ایک نام حارث خلیق کا بھی ہے۔ معاصر ترقی پسند شاعری میں ان کی تخلیقات "عشق کی تقویم" اور "میلے میں" ہمیں مابعد نو آبادیاتی عناصر کے اثرات واضح انداز میں محسوس ہوتے ہیں۔ حارث خلیق چونکہ اسی سماج کا حصہ ہیں اور اسی دھرتی سے انہوں نے شاعری کے موضوعات لیے

جن میں ہمیں دکھ درد اور کسک واضح انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ سرمایہ دار، جاگیر دار اور بورژوا طبقے کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نو آبادکاروں کے خلاف نفرت کا اظہار ملتا ہے۔

جاؤ اب اور کو خراب کرو
کھل چکے تم سراب ختم ہوا (۱۹۹)

نو آبادکاروں کی طرف سے دکھائے گئے سہانے خواب کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

یوں تو بہت بھرپور تھا
اس خواب میں کیا کیا نہ تھا
لیکن جو آسودہ کرے
ایسا کوئی لمحہ نہ تھا(۲۰۰)

بورژوا اور زمیندار طبقہ چونکہ اس زعم میں تھا کہ ہم طاقت ور ہیں اقتدار میں ہیں اور ہمارے ماتحت کام کرنے والے مجبور اور بے بس لوگ ہیں اسی سوچ نے انہیں محکوموں پر ظلم کرنے پر آمادہ کیا۔ محکوموں سے ظلم و بربریت کا سلوک روا رکھا گیا، ان کی دادرسی سننے کی بجائے انہیں سخت سے سخت سزا دی گئی۔ جس حد تک ممکن ہوتا ان سے ظلم روا رکھا جاتا۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں ان مظلوموں کی دادرسی سوائے لکھاریوں کے اور کوئی نہ کر سکا۔

برسوں سے نہ کوئی خواب دیکھا
آنکھوں میں تنے ہوئے تھے جالے
طاقت کی غلام گردشیں تھیں
ہونٹوں پہ پڑے ہوئے تھے تالے(۲۰۱)

مجبور اور بے بس عوام حکمرانوں اور نو آبادکاروں سے اس حد تک وحشت زدہ ہو گئی کہ ان کے خلاف بولنا جرم سمجھنے لگی۔ اور کسی حد تک یہ خیال درست بھی تھا۔ نو آبادکاروں، سرمایہ داروں، بورژوا اور زمیندار طبقے کو محکوموں نے اپنا آقا مان لیا، انہیں اپنا دیوتا تصور کر کے انہیں پوجنا شروع کر دیا اور اپنے حکمرانوں کو رزق کا وسیلہ سمجھتے ہوئے انہیں اپنا آقا بنا بیٹھے۔ ان کا ماننا تھا کہ

"انہی کے دم سے ہے جو آب و دانہ ہے۔"(۲۰۲)

مابعد نو آبادیاتی دور میں ہنر وروں اور کاریگروں کی کوئی قدر نہ تھی۔ ان کو محض مزدور ہی گردانا گیا۔ ان کے پاس اپنا ہنر ہونے کے باوجود اتنی آمدنی نہ ہوتی کہ وہ اپنی اولاد کے لیے دو وقت کی روٹی کما سکیں۔

ریاضت عمر بھر کی
بے ثمر ٹھہری
کہاں کوئی تمیز خیر و شر ٹھہری
ہنر ور جو بھی ہے وہ بے ہنر ہے(۲۰۳)

ان سب مظالم کے ساتھ ساتھ مقامی باشندہ اس بات سے بھی نالاں ہے کہ اسے حکمرانوں کو ہر طور خوش کرنا ہے۔ ان کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ اور اس رضا کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے اور اس رضا کے حصول کے لیے وہ جان اور خیر و شر کی پرواہ کیے بغیر کوشاں ہے۔ کہ کہیں اس کا افسر، یا حکمران اسے ذرا سی بات پر ناراض ہو کر اس کی نوکری کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے۔ یا اس کی ملازمت نہ ختم کر دے اور اس کی روزی روٹی کا جو ذریعہ ہے وہ کہیں بند نہ ہو جائے۔ ان سب مظالم کے ساتھ ساتھ مقامی باشندہ اس بات سے بھی نالاں ہے کہ اسے حکمرانوں کو ہر طور خوش کرنا ہے۔ ان کی خوشنودی اور رضا کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی ہے۔ اور اس رضا کے حصول کے لیے وہ خیر و شر کی پرواہ کیے بغیر کوشاں رہتا ہے۔ تاکہ اس کی روزی کا وسیلہ بنا رہے۔ لہذا وہ اپنے افسروں اور سرمایہ داروں کو خوش کرنے کے حیلے ڈھونڈتا رہتا ہے۔

مرد گرمیوں میں بھی
ٹائیاں لگاتے ہیں
افسروں کو خوش کرنے
لنچ پر بلاتے ہیں(۲۰۴)

اپنے ڈر اور خوف کا ذکر کرتے ہوئے مقامی آباد کار لکھتا ہے:

ڈر کوئی مجھ کو اگر ہے
تو وہ دن کا ڈر ہے
دن جو نکلے گا مجھے گھر سے نکلنا ہو گا
اک اک لمحہ جانکاہ ڈسے گا مجھ کو
ایک ادبارِ مسلسل سے گزرنا ہو گا
جانے کس کس سے مجھے اپنی طبیعت کے خلاف

خندہء بر لب بہت اخلاق سے ملنا ہو گا
ہر خطا کار، ستم پیشہ، وزر کش کے حضور
جسم تو جسم مری روح کو جھکنا ہو گا
اور احساس کے اس شعلہ سوزاں کے طفیل
کرب کی آگ میں دن بھر مجھے جلنا ہو گا(۲۰۵)

ایسے میں شاعر خواہش کرتا ہے کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ حکمرانوں اور مزدوروں کی آپس کی نفرت اور غم و غصہ ختم ہو جائے۔ سب ایک سے ہو جائیں۔ مل کر زندگی گزاریں تاکہ معاشرہ امن اور سکون کا گہوارہ بن جائے۔

آج جب ہوئی بارش
دل میں یہ خیال آیا
اس طرح کی ایک بارش
ذہن آدمی پر ہو
تفرقے مٹا ڈالے
نفرتوں کو دھو ڈالے
بیج ایک محبت کا سب دلوں میں بو جائے(۲۰۶)

معاشی ناانصافی، طبقاتی کشمکش اور زرعی طور پر کیا جانے والا جبر ہمیں حارث خلیق کی نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی بے بسی پر لکھتے ہیں جو ظلم تو سہتے ہیں مگر اس کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے۔ حکمران اور بورژوا طبقہ ان پر ظلم و جبر کرتے ہوئے انہیں بے بس اور مجبور کر دیتا ہے ان کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ شاعر ان محکوموں کی آواز بنتے ہوئے رب تعالیٰ سے گلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تو کہ حاذق ہے اور رازق ہے
تجھ سے شکوہ ہے ایک بندے کا
بند پتھر میں ایک کیڑے کو
رزق تو نے دیا اگر مالک
یہ جو دنیا میں بے شمار انساں ہیں
روز فاقہ کشی سے مرتے ہیں
ان کو انساں کیوں بنایا تھا

کوئی کیڑا بنا دیا ہوتا (۲۰۷)

حارث خلیق مابعد نو آبادیاتی معاشرے میں مذہبی شدت پسندی کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ان کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں۔خواہ وہ کسی بھی مسلک سے ہوں، کسی بھی عقیدے کے ماننے والے ہوں ان کو بنا کسی وجہ کے مسلک کو بنیاد بنا پر قتل کرنا یا ان کا جینا دوبھر کرنا کرنا جرم ہے۔ اسی لیے وہ کراچی کے ڈاکٹرز کے قتل پر بھی نوحہ کنعاں ہیں جو محض اس لیے قتل کر دیے گئے کہ وہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔

سلامتی مانگتا ہوں رب سے
پڑا ہوا ہوں اس ایک سجدے
جانے کب سے
نماز وحشت کچھ اس طرح سے
دراز ہو گی خبر نہ تھی
وہ جرم جن کا علی سے نسبت
انہیں نہیں ان طویل سجدوں کی
کچھ ضرورت۔۔۔۔۔
نماز وحشت میں پڑھ رہا ہوں
کہ میرے شہروں، میرے وطن پر
خدا نہ چاہے۔۔۔
کبھی نہ منسوخ ہونے والا حکم اترے
عذاب اترے (۲۰۸)

ان تمام دکھوں، مصیبتوں کا ذکر کرتے ہوئے اور پر امید ہے کہ اچھے دن آئیں گے۔وہ پر عزم اور پر ہمت ہے اور محکوموں کو بھی روشن مستقبل کی آس اور یقین دلاتے ہیں۔

ایک دن وہ آئے گا
ظلمتوں کا یہ دریا
نور میں نہائے گا
ظلمتیں فنا ہوں گی
روشنی کے دریا میں (۲۰۹)

ایسے ہی ایک اور جگہ آس اور امید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

چلو آج ہم تم سے
جہاں بھر کے سارے دکھوں کو
گلے سے لگالیں
انہیں اپنی ہستی کا حصہ بنالیں
جو جبر مسلسل کی دلدل سکھادے
جو سکھ کے گلابوں کی قلمیں لگادے(۲۱۰)
نکال لیں گے بھنور سے سفینہ ءجاں کو
ہمارا عزم رخِ بادباں بدلے گا(۲۱۱)

نو آبادکاروں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک صحافی کی زباں میں لکھتے ہیں کہ:

تم بجھاؤ دیے
ہم جلائیں لہو
تم نے پیاسا کیا
ہم بنے آب جو
تم ہو ننگ وطن
ہم سے ہے آبرو
ہو گے تم دربدر
ہوں گے ہم سرخرو(۲۱۲)

عہد حاضر میں سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے ہر شخص دوچار ہے۔ دکھ، درد، کرب، خوف، عدم توازن، بے اطمینانی، کذب وریا، ناداری اور نامرادی کے اس عالم میں ہر کوئی اس آس میں ہے کہ کہیں سے کوئی خضر آئے اور انہیں راہ دکھائے، ان کی مشکلات کا حل بتائے۔

ایسے عالم میں ستم خوردہ وپژمردہ عوام
منتظر ہے کہ کوئی آئے کرے نور کار قص
شاعرو، لفظ گرو، نغمہ طراز آؤ
نور کار قص کریں آؤ کریں نور کار قص

نورکا رقص کہ ہو جس سے درخشاں یہ حیات
جس کے سائے سے بھی لرزاں ہو وجود ظلمات (۲۱۳)

حارث خلیق حکمرانوں کے رویے سے عاجز آتے ہوئے اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔وہ ما بعد نو آبادیاتی صورتحال کی وضاحت کے لیے راجا اور پرجا کا ذکر کر کے اپنی شاعری میں اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں کہ کس طرح راجا نے پرجا کی دولت ہتھیالی، اس پر قابض ہو کر ان کا دشمن بن بیٹھا اور انہیں قید کروادیا۔ان کی تحریریں ہمیں مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔اپنی تحریروں میں وہ اپنی غریب کو کتے سے تشبیہ دیتے ہیں جو صرف مالک کے سامنے اس لیے دم ہلاتا ہے تا کہ اسے دو وقت کی روٹی مل سکے۔یہی موجودہ صورتحال ہمارے ملکی نظام کی ہے۔اور حارث خلیق کے ترقی پسند شعور میں ہمیں یہ سب چیزیں واضح انداز میں ملتی ہیں۔اپنے ترقی پسند فکر کی وضاحت وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ علی عباس جلالپوری، عام فکری مغالطے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۱۷۳

۲۔ فضل احمد خسرو، لمحہ موجود، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء ص: ۳۰

۳۔ ایضاص، ۳۵۔۳۴

۴۔ ایضاص: ۲۵

۵۔ ایضاص: ۲۴

۶۔ ایضاص: ۲۶

۷۔ ایضاص: ۱۲۸

۸۔ ایضاص: ۱۹

۹۔ اقبال راہی، شہر بے اذاں، مشمولہ، ماہنامہ، تارکین وطن، لاہور، جنوری ۲۰۰۹ء جلد ۳ شمارہ ۱۲ ص: ۳۵

۱۰۔ فضل احمد خسرو، شہر بے اذاں، لیبر فرنٹ اوکاڑہ، ص: ۳۳

۱۱۔ ایضاص: ۱۳۵۔۱۳۶

۱۲۔ ایضاص: ۵۶

۱۳۔ ایضاص: ۱۴

۱۴۔ ایضاص: ۳۴۔۳۵

۱۵۔ ایضاص: ۵۸

۱۶۔ نواز شاہد، سایہ تاک، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء ص: ۲۵

۱۷۔ ایضاً ص: ۹۸

۱۸۔ ایضاً ص: ۱۲۲

۱۹۔ ایضاً ص: ۱۶۵

۲۰۔ ایضاً ص: ۱۷۱

۲۱۔ ایضاً ص: ۱۵۳

۲۲۔ ایضاً ص: ۱۳۷

۲۳۔ ایضاً ص: ۱۲۵

۲۴۔ ایضاً ص: ۱۵۵

۲۵۔ ایضاً ص: ۱۴،۱۳

۲۶۔ ایضاً ص: ۱۰۵

۲۷۔ ایضاً ص: ۳۷،۳۶

۲۸۔ ایضاً ص:۴۱

۲۹۔ مظہر حسین سید، سکوت، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء ص: ۳۲

۳۰۔ ایضاً ص: ۶۷

۳۱۔ ایضاً ص: ۸۹

۳۲۔ ایضاً ص: ۳۳

۳۳۔ مقتدا منصور، ریاست، سیاست اور تاریخ، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۸ء ص: ۱۶۱،۱۶۰

۳۴۔ مظہر حسین سید، سکوت، ایضاً ص: ۳۵

۳۵۔ ایضاً ص: ۵۵

۳۶۔ ایضاً ص: ۷۵

۳۷۔ ایضاً ص: ۱۳۲

۳۸۔ ایضاً ص: ۱۱۸

۳۹۔ ایضاً ص: ۱۳۳

۴۰۔ ایضاً ص: ۱۳۴

۴۱۔ ایضاً ص: ۱۴۳

۴۲۔ ایضاً ص: ۵۷

۴۳۔ ایضاً ص: ۵۸

۴۴۔ ایضاً ص: ۲۶

۴۵۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، القا پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء ص: ۵۷

۴۶۔ انوار فطرت، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، مشمولہ، سہ ماہی، کہکشاں انٹرنیشنل، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء جلد ۲، شمارہ ۹ ص: ۳۲

۴۷۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۵۳،۵۲

۴۸۔ ایضاً ص: ۵۷،۵۶

۴۹۔ آفتاب اقبال شمیم، تبصرے، مشمولہ سہ ماہی، فنون، لاہور شمارہ ۱۲۳ص: ۳۳۸
۵۰۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۷۹،۷۸
۵۱۔ روش ندیم، ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں، حرف اکادمی راولپنڈی ۲۰۰۱ء ص: ۳۴
۵۲۔ ایضاً ص: ۴۶
۵۳۔ ایضاً ص: ۴۷
۵۴۔ Asif Farrukhi Startling images Daily Dawn Islamabad 13 december 2015
۵۵۔ لینن، سوشلسٹ جمہوریت، (مترجم: امیر اللہ خان) فکشن ہاؤس لاہور ۲۰۱۳ء ص: ۱۰
۵۶۔ ضیاء الحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۰۷ء ص: ۹۸
۵۷۔ ایضاً ص: ۹۲
۵۸۔ لینن، سوشلسٹ جمہوریت، (مترجم: امیر اللہ خان) ایضاً ص: ۷۵
۵۹۔ ضیاء الحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، ایضاً ص: ۱۰۷
۶۰۔ ضیاء الحسن، بار مسلسل، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۱۴ء ص: ۱۱۵
۶۱۔ ایضاً ص: ۷۳
۶۲۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور ۲۰۱۷ء ص: ۶۷
۶۳۔ لینن، سوشلسٹ جمہوریت، (مترجم امیر اللہ خان) ایضاً ص: ۱۱۳
۶۴۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص: ۹۹
۶۵۔ ایضاً ص: ۱۰۱
۶۶۔ لینن، سوشلسٹ جمہوریت، (مترجم امیر اللہ خان) ایضاً ص: ۱۹،۱۸
۶۷۔ سعادت سعید، شناخت، سنگ میل پبلشرز، لاہور ۲۰۱۷ء ص: ۳۶
۶۸۔ ایضاً ص: ۷۳
۶۹۔ ایضاً ص: ۸۷
۷۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی سامراج (ایک تجزیہ) تاریخ پبلیکیشنز ۲۰۱۶ء لاہور ص: ۵۱
۷۱۔ کاشف رضا، سید، ممنوع موسموں کی کتاب، شہرزاد پبلشرز، کراچی ۲۰۱۲ء ص: ۱۲۴
۷۲۔ لینن، اشتراکی نظریات اور ثقافت، (مترجم: اشفاق سلیم مرزا) فکشن ہاؤس لاہور ۲۰۱۳ء ص: ۱۰
۷۳۔ کاشف رضا، سید، محبت کا محل وقوع، شہرزاد پبلشرز، کراچی ۲۰۰۳ء ص: ۵۸

۷۴۔ کاشف رضا، سید، ممنوع موسموں کی کتاب، ایضاً ص:۱۲،۱۱

۷۵۔ کاشف رضا، سید، محبت کا محل وقوع، ایضاً ص:۴۲

۷۶۔ ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، بہزاد پبلشرز، راولپنڈی ۲۰۰۶ء ص: ۱۱

۷۷۔ ایضاً ص:۳۵

۷۸۔ ایضاً ص: ۳۴

۷۹۔ ایضاً ص: ۶۹،۶۸

۸۰۔ ارشد معراج، دوستوں کے درمیاں، رِمیل ہاؤس آف پبلشنگ راولپنڈی، ۲۰۱۹ء ص: ۱۱۰،۱۰۹

۸۱۔ ایضاً ص: ۷۶

۸۲۔ ایضاً ص: ۵۷

۸۳۔ ایضاً ص: ۱۳

۸۴۔ حارث خلیق، میلے میں، پاکستان پبلشنگ ہاؤس، کراچی ۲۰۱۲ء ص: ۸۵

۸۵۔ ایضاً ص: ۳۵،۳۴

۸۶۔ ایضاً ص: ۱۱۱

۸۷۔ حارث خلیق، عشق کی تقویم میں، پاکستان پبلشنگ ہاؤس، کراچی ۲۰۱۲ء ص:۱۹۵

۸۸۔ ایضاً ص:۱۸۲

۸۹۔ ایضاً ص: ۱۹۶

۹۰۔ فضل احمد خسرو، شہر بے اذاں، ایضاً ص: ۱۳۱

۹۱۔ ایضاً ص: ۲۶،۲۵

۹۲۔ افضل آدرش، مضمون، صبح صدا، مشمولہ جنگ، لاہور، ۱۹۸۵ء ص: ۱۵

۹۳۔ فضل احمد خسرو، لمحہ موجود، ایضاً ص: ۸۹،۸۸

۹۴۔ ایضاً ص: ۴۵،۴۴

۹۵۔ جیلانی کامران، (پیش لفظ) صبح صدا، یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۴ء ص:۰۴

۹۶۔ نواز شاہد، سایہ تاک، ایضاً ص:۱۹

۹۷۔ ایضاً ص: ۲۴

۹۸۔ ایضاً ص: ۲۹

۹۹۔ ایضاً ص: ۵۰

۱۰۰۔ ایضاً ص: ۳۵

۱۰۱۔ ایضاً ص: ۳۸

۱۰۲۔ذکاء الدین شایان ،نثری نظم اور آزاد غزل نمبر،جدت کا ایک تجربہ،جلد ۵۴شمارہ ۸،۷،۶مکتبہ قصر الادب، بمبئی ۱۹۸۳ء ص: ۲۲۵

۱۰۳۔ نواز شاہد،سایہ تاک،ایضاً ص: ۲۲

۱۰۴۔ ایضاً ص: ۵۰

۱۰۵۔ ایضاً ص: ۱۲۵

۱۰۶۔ ایضاً ص: ۱۵

۱۰۷۔ایضاً ص: ۱۶۹

۱۰۸۔ ایضاً ص: ۱۶۸

۱۰۹۔ایضاً ص: ۸۵،۸۴

۱۱۰۔ ایضاً ص: ۹۶

۱۱۱۔ ایضاً ص: ۹۷

۱۱۲۔ ایضاً ص: ۱۰۸

۱۱۳۔ ایضاً ص: ۱۱۴

۱۱۴۔ ایضاً ص: ۱۵۹

۱۱۵۔مظہر حسین،سید،سکوت، ایضاً ص:۲۱

۱۱۶۔ ایضاً ص: ۴۲

۱۱۷۔ ایضاً ص: ۴۴

۱۱۸۔ ایضاً ص: ۴۶

۱۱۹۔ ایضاً ص: ۱۱۱

۱۲۰۔ ایضاً ص: ۴۰

۱۲۱۔ ایضاً ص: ۴۸

۱۲۲۔ ایضاً ص: ۵۲

۱۲۳۔ ایضاً ص: ۹۱

۱۲۴۔ ایضاً ص: ۹۷

۱۲۵۔ ایضاً ص: ۱۲۲

۱۲۶۔ ایضاً ص: ۱۳۸

۱۲۷۔ ایضاً ص: ۳۷

۱۲۸۔ ایضاً ص: ۵۸

۱۲۹۔ ایضاً ص: ۷۳

۱۳۰۔ ایضاً ص: ۱۰۷

۱۳۱۔ ایضاً ص: ۷۷

۱۳۲۔ ایضاً ص: ۱۰۴

۱۳۳۔ ایضاً ص: ۷۹

۱۳۴۔ ایضاً ص: ۱۳۱

۱۳۵۔ ایضاً ص: ۸۳

۱۳۶۔ ایضاً ص: ۸۴

۱۳۷۔ ایضاً ص: ۸۶

۱۳۸۔ ایضاً ص: ۱۳۱

۱۳۹۔ ایضاً ص: ۱۷

۱۴۰۔ قاسم یعقوب، طاقت اور سماج، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۱ء ص: ۳۱

۱۴۱۔ روش ندیم، ڈاکٹر، مضمون، انسانی ترقی اور انقلاب، مشمولہ سہ ماہی عزم، ستمبر ۱۹۹۲ء لاہور ص: ۷۶

۱۴۲۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۳۲

۱۴۳۔ ایضاً ص: ۳۸

۱۴۴۔ روش ندیم، ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۶۷

۱۴۵۔ ایضاً ص: ۳۸

۱۴۶۔ ریاض صدیقی، پروفیسر، ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں، مشمولہ ماہنامہ، عوامی منشور، کراچی شمارہ ۴ جولائی ۲۰۰۲ء ص: ۱۲۱

۱۴۷۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ایضاً ص:۵۹

۱۴۸۔ محمد اسلوب قریشی، عزم الممتاز، ملتان، ۱۹۹۰ء ص: ۳۱

۱۴۹۔ روش ندیم، ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۲۱

۱۵۰۔ احتشام حسین، اردو نظم پر تنقیدی نظر، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۰ء ص:۳۸

۱۵۱۔ ضیاء الحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، ایضاً ص: ۹

۱۵۲۔ ایضاً ص: ۸۸

۱۵۳۔ ایضاً ص: ۹۸

۱۵۴۔ ایضاً ص: ۱۰۲

۱۵۵۔ ایضاً ص: ۱۲۱

۱۵۶۔ ایضاً ص: ۱۱۱

۱۵۷۔ ایضاً ص: ۱۱۶

۱۵۸۔ ایضاً ص: ۸۶

۱۵۹۔ ایضاً ص: ۵۷

۱۶۰۔ ایضاً ص: ۶۲

۱۶۱۔ ضیاء الحسن، بار مسلسل، ایضاً ص: ۱۲،۱۱

۱۶۲۔ ایضاً ص: ۲۲

۱۶۳۔ ایضاً ص: ۲۶

۱۶۴۔ ایضاً ص: ۱۰۱

۱۶۵۔ ایضاً ص: ۱۶۶

۱۶۶۔ ایضاً ص: ۱۱۹

۱۶۷۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص: ۲۰

۱۶۸۔ سعادت سعید، شناخت، ایضاً ص: ۸۱

۱۶۹۔ احمد سہیل، اردو میں نثری نظم کا مزاج، ہیت آہنگ اور اس کا جدید مخاطبہ، مشمولہ سہ ماہی فروغ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء کراچی ص: ۴۱

۱۷۰۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص: ۴۵

۱۷۱۔ ایضاً ص: ۴۴

۱۷۲۔ ایضاً ص: ۵۷،۵۶

۱۷۳۔ حمیرا اشفاق، ترقی پسند تنقید۔۔۔۔پون صدی کا قصہ، سانجھ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء ص: ۸۴

۱۷۴۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص:۴۶

۱۷۵۔ سعادت سعید، شناخت، ایضاً ص: ۱۷

۱۷۶۔ ایضاً ص: ۵۰

۱۷۷۔ ایضاً ص: ۱۲

۱۷۸۔ ایضاً ص: ۱۹

۱۷۹۔ ایضاً ص: ۲۱،۲۰

۱۸۰۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص: ۱۰۳

۱۸۱۔ کاشف رضا، سید، محبت کا محل وقوع، ایضاً ص: ۵۶

۱۸۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، غلامی اور نسل پرستی، تاریخ پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء ص: ۷۷

۱۸۳۔ کاشف رضا، سید، محبت کا محل وقوع، ایضاً ص: ۲۱

۱۸۴۔ ایضاً ص: ۵۶

۱۸۵۔ کاشف رضا، سید، ممنوع موسموں کی کتاب، ایضاً ص: ۱۸

۱۸۶۔ ایضاً ص: ۱۱۴

۱۸۷۔ ارشد معراج، دوستوں کے درمیاں، ایضاً ص: ۳۶

۱۸۸۔ ایضاً ص: ۲۶

۱۸۹۔ قاسم یعقوب، طاقت اور سماج، ایضاً ص:۳۲

۱۹۰۔ ارشد معراج، دوستوں کے درمیاں، ایضاً ص: ۱۲۴

۱۹۱۔ ایضاً ص: ۱۵۷،۱۵۶

۱۹۲۔ ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، (فلیپ)

۱۹۳۔ ایضاً ص:۱۰۱،۱۰۰

۱۹۴۔ ایضاً ص: ۸۷

۱۹۵۔ ایضاً ص: ۸۲

۱۹۶۔ ارشد معراج، دوستوں کے درمیاں، ایضاً ص: ۶۵،۶۴

۱۹۷۔ ایضاً ص: ۱۰۶

۱۹۸۔ ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، ایضاً ص: ۷۹،۷۸

۱۹۹۔ حارث خلیق، میلے میں، ایضاً ص: ۱۶

۲۰۰۔ ایضاً ص: ۲۶

۲۰۱۔ حارث خلیق، عشق کی تقویم، ایضاً ص: ۱۹۳

۲۰۲۔ حارث خلیق، میلے میں، ایضاً ص: ۵۱

۲۰۳۔ ایضاً ص: ۵۶

۲۰۴۔ حارث خلیق، عشق کی تقویم، ایضاً ص: ۹۴

۲۰۵۔ ایضاً ص: ۱۱۴

۲۰۶۔ ایضاً ص: ۶۷،۶۶

۲۰۷۔ ایضاً ص: ۱۲۹

۲۰۸۔ ایضاً ص: ۱۸۶،۱۸۵

۲۰۹۔ ایضاً ص: ۲۰۱

۲۱۰۔ ایضاً ص: ۲۱۷،۲۱۶

۲۱۱۔ حارث خلیق، میلے میں، ایضاً ص: ۵۹

۲۱۲۔ ایضاً ص: ۵۶

۲۱۳۔ ایضاً ص: ۲۰۵

باب چہارم:

معاصر اردو ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے فنی اور لسانی اثرات

معاصر اردو ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے فنی اثرات:

بنیادی طور پر فن کا اصل مقصد تفریح کا سبب پیدا کرنا ہے اب وہ تفریح کسی بھی صورت میں ہو سکتی ہے۔ فن کی واضح طور پر کوئی توضیح نہیں ہے۔ مگر جب فن کا جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فن زندگی کی ترجمانی کرنے میں معاون ہے۔ فن کے ذریعے نہ صرف سماج کی حقیقت واضح ہوتی ہے بلکہ اس سے فنکار کے خیالات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ایک فنکار کس نظر سے زندگی کو دیکھتا اور پرکھتا ہے ان سب سے آگاہی ہمیں اس کے فن پارے کو دیکھ کر ہی ہوتی ہے۔ عہد حاضر کی مابعد نو آبادیاتی صورتحال کا ذکر کیا جائے تو اس کی واضح ترجمانی ہمیں تخلیق کار کے فن پاروں میں ملتی ہے۔ ان کے فن پارے نہ صرف اپنے عہد کے ترجمان ہیں بلکہ معاشرتی حقائق کو منظر عام پر لانے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ کسی بھی دور کے حالات و واقعات سے آگہی حاصل کرنے اور اس دور کی تاریخی حیثیت جانچنے کے لیے اس دور کے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے اسی سے ہم نہ صرف اس دور سے واقفیت حاصل کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہم اس دور کے تخلیق کاروں کے فن سے بھی آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ اردو نظم نے ہر دور میں اپنے معاشرے کی عکاسی کی ہے اور یہ عکاسی صرف سماج کی حد تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں سماج کے ساتھ ساتھ سیاست، معیشت اور زراعت بھی شامل بحث رہے ہیں۔ نظم میں نہ صرف ان حالات و واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بدلتی قدروں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ عہد حاضر کے ممتاز ترقی پسند شاعروں نے بھی اپنی شاعری میں مابعد نو آبادیاتی اثرات کا ذکر برملا کیا ہے۔ معاصر شعراء کی شاعری کے فن پر مابعد نو آبادیاتی اثرات کس حد تک اثر انداز ہوئے ذیل میں ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

تشبیہ و استعارہ : فضل احمد خسرو کی شاعری میں ہمیں شعری خصوصیات تشبیہ، استعارہ، صنائع بدائع، پیکر تراشی، تکرار لفظی، منظر نگاری اور صنعت تضاد جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔ علم بیان کی رو سے تشبیہ سے مراد

مماثلت تلاش کرنا یا بالکل اس جیسا قرار دے دینا اور فضل احمد خسرو کی شاعری میں ہمیں یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔

سورج کی آنکھ میں اجالا نہیں رہا
کوئی بھی روشنی کا حوالہ نہیں رہا(۱)
اگ رہی ہیں دل میں خواہش کی ستم چنگاریاں
اب تو سانسوں پر بھی شعلوں کا گماں ہونے لگا(۲)

استعارہ ہی در حقیقت شعر کی زینت ہوتا ہے۔ اور کسی بھی شعری فن پارے کے حسن کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ فضل احمد خسرو کی شاعری میں بھی ہمیں استعارے کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ شاعری استعارے کے بغیر ممکن ہی نہیں تو یہ بے جا نہ ہو گا۔

ترے حسن کا عکس ہے تری خوشبو ہے
ورنہ سرخ گلابوں سے جی ڈرتا ہے(۳)
یہ برگ برگ بکھرنا بھی معجزہ ہے کوئی
تو شاخ دار پہ کھلتے گلاب دیکھے گا(۴)

مابعد نو آبادیات کے اثرات کے حوالے سے خسرو کی شاعری میں استعارہ کی صورت ہمارے معاشی، معاشرتی اور سماجی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔

جانے پھر کیوں بھوک بستی کھا گئی
تھے ہوا، پانی، اناج اپنی جگہ (۵)
اندھی کالی رات کے سونے منظر میں
دیکھا جگنو تنہا تو پھر شعر کہے(۶)

اندھی کالی رات ہی دراصل استعارہ ہے جو ہمارے موجودہ حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والے معاصر شاعر فضل احمد خسرو کی شعری تصنیفات میں ہمیں ان کی شاعری کے فکری و فنی محاسن واضح انداز میں نظر آتے ہیں۔ ان کی شعری تصنیفات ہمیں مابعد نو آبادیاتی اثرات پر مبنی دکھائی دیتی ہیں۔ نو آبادکاروں کے چلے جانے کے بعد بھی مقامی آبادی کے ذہنوں پر قابض ہونے کا جو ہنر ان کو آتا تھا اس کے اثرات ابھی تک ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں۔ نو آبادکاروں کی نئی صورت جاگیر دار، سرمایہ دار اور بورژوا طبقہ ہے جو کہ

محکوموں، مزدوروں کے استحصال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ان کی شاعری میں ہمیں فکری اور فنی لحاظ سے مابعد نو آبادیات کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔

زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے جس طرح روح اور جسم کا تعلق لازم وملزوم ہے بالکل اسی طرح کوئی بھی شعری فن پارہ فکر اور فن کی خصوصیات سے مل کر ہی مکمل ہوتا ہے۔ فضل احمد خسرو کی شاعری میں ہمیں جہاں ان کے فن کی دبیز تہیں ملتی ہیں وہیں صنائع بدائع بھی اپنا حسن پیش کرتے ہیں۔ان کے فنی رویے کے حوالے سے ظفر اقبال کا کہنا ہے:

" تخلیقی اذیت کے نشے میں ہر وقت مست رہنے والا یہ خاموش طبع اور پر اسرار لڑکا جب بولتا ہے تو کوئی راز ہی کھولتا ہے" (۷) فضل احمد خسرو کی شاعری میں ہمیں قافیہ اور ردیف کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔وہ ان کے انتخاب میں جدت طراز ہیں نئی نئی ردیفیں اور قافیے انہوں نے متعارف کروائے۔ان کی اسی خوبی کے بارے میں اقبال صلاح الدین کا کہنا ہے۔

" صبح صدا کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر کہی جاسکتی ہے کہ یہ مجموعہ چند ایک مردف مجموعوں میں سے ہے جس کے ساتھ ساتھ چند نئی اور مترنم ردیفیں تاریخ ادب کو فراہم کی ہیں۔واقف نہیں، مٹی سے آگے تلک ،اوڑھ کر اور ساتھ ہے جیسی ردیفیں کم از کم میری نظر سے تاہنوز نہیں گزریں۔اس مجموعے نے بہت سی پرانی ردیفوں کو بھی عمدہ قافیوں کا تناسب دے کر جمیل آہنگ اور معنی آفرینی سے آگاہ کیا ہے۔(۸)

ارشد معراج کی شاعری میں تشبیہات واستعارات کا استعمال جاندار ہے انہوں نے اپنی شاعری میں جدید معنویت کے حامل استعاروں کو استعمال کیا ہے۔مابعد نو آبادیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو نو آبادکاروں، مقامی باشندوں، محکوموں اور حاکموں کے لیے خوبصورت استعاروں کا استعمال ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

ہم جان ہی نہ پائے
قزاق نیلی آنکھیں
نمکین پانیوں سے وہ کھارے پانیوں تک
جس نے بگل بجائے
سوچوں کے ہنس اس نے رکھے ہیں رہن ایسے
پہچان ہی نہ پائے
ٹھہرے ہوئے بدن میں کنکر ہزار پھینکے

خلیوں میں خون دوڑا لیکن تہی ہے دامن
سو چھید چھلنیوں سے ہیں جسم و جاں کے اندر
کب جنتی کھجوریں اتریں ہماری خاطر
سانسیں اڑھائی فیصد خیرات میں ملی ہیں
یہ زندگی نہیں ہے (۹)

سیاست کا ذکر کرتے ہوئے وہ سیاسی حالات کی ابتری پر بات کرتے ہیں۔ سیاسی حالات کی ابتری کو وہ اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی اثرات ہمیں ان کی شاعری میں اور خاص طور پر نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہی مابعد نو آبادیاتی اثرات دراصل معاشرے کی ابتری کو ظاہر کرتے ہیں اور ہمارے ارد گرد موجود انسانی رویوں اور انسانی دکھوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

فاحشہ عورتیں
شہر بیمار کی فاحشہ عورتیں
نان و نفقہ ہے جن کا لہو میں نہائی ہوئی پستیاں
جن کی مٹھی میں ہیں
بادشہ، فیل، گھوڑے، پیادے
فاحشہ عورتوں کی مسیحا سے جب آشنائی بڑھی
نقرئی کاغذوں پر سیاہی اگلنے لگی
اور بھری چھاتیاں خشک ہونے لگیں
انگلیاں بھی پگھلنے لگی ہیں (۱۰)

شاعری میں تشبیہ و استعارہ کا استعمال شاعری کا حسن بڑھا دیتا ہے۔ روش ندیم کی آزد نظموں میں بھی ہمیں تشبیہ و استعارہ نظر آتے ہیں۔ تشبیہ کے حوالے سے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں: " یہ وہ فن ہے جس کے ذریعے انشاء پرداز، خطیب مختلف چیزوں میں مشابہے دریافت کرتا ہے گویا ایک چیز کو دوسری کے مشابہ کر دیتا ہے۔" (۱۱) استعارہ میں لفظوں کو اوڑھ کر شاعری کی خوبصورتی میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ روش ندیم کی شاعری میں استعمال ہونے والی تشبیہیں اور استعارے ہماری روزمرہ زندگی سے اخذ شدہ ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں رہتے ہوئے روش ندیم ملکی حالات کو مد نظر رکھتے ہیں اور اپنی شاعری میں استعارات کی صورت میں ان کا ذکر

کرتے ہیں۔ اشکر فاروقی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:" روش اپنے استعارے، تشبیہیں اور علامتیں جدید شہری زندگی سے اخذ کرتا ہے۔ چونکہ وہ بچپن سے جوانی تک ایک شہری کے طور پر زندگی گزارتا رہا ہے اس لیے اس نے خوامخواہ دیہاتی مناظر کی عکس بندی کرنے کی بجائے اپنے اردگرد سے ہی شعری میٹافر اخذ کیے ہیں ۔"(۱۲)روش ندیم کی نظموں میں شہری زندگی سے ہی اخذ شدہ تشبیہات اور استعارات کو استعمال کرتے ہوئے شاعری کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تری سانسیں حسین موسم کو تھامے دور کی راہوں پہ
جا نکلیں
مگر پھر بھی مری آنکھوں کے ساحل پر یہ لکھا ہے
کہ تو اک دن ہمیشہ کی طرح ہنستی مہکتی
شام کی پازیب چھنکاتی مرے گھر لوٹ آئے گی
مگر اس خواب کی کچی کلی جب مہکنے کو ذرا تڑپی(۱۳)

ایسے ہی ایک اور نظم میں وہ لکھتے ہیں:

تمہارے کولہے پر اک تھپڑ
اک غلاظت پھرا تبسم
اور ایک گالی حرامجادی(۱۴)

ضیاء الحسن نے عمدہ استعارے استعمال کر کے اپنے خیالات کو پیراہن عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں بیشتر مقامات پر دل بطور استعارہ استعمال ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

دل بدبخت وہ آوارہ وہ خود سر ہے
کیا کسی کا ہو، ہمارا بھی نہیں ہوتا(۱۵)
چمکے گا کسی بام تمنا پر کسی روز
یہ دل، یہ ستارہ ہے سر خاک ابھی تو(۱۶)

سعادت سید کی شاعری کی بابت بات کی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تحریریں مابعد نو آبادیات کی بہترین عکاس ہیں۔ ان کی نظموں میں ہمیں یہ کرب واضح دکھائی دیتا ہے کہ مابعد نو آبادیاتی دور میں انسانوں کی اوقات کیڑے مکوڑوں سے بھی کم تر ہے۔ ان سے جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

چاروں جانب برساتی کیڑوں کی صورت
سسکتی مخلوق پوچھتی ہے
دارورسن کی تماشا گاہ کھلنے میں
تاخیر کیوں ہے؟(۱۷)

مظہر حسین سید کی شاعری میں بھی ہمیں نو آبادکاروں اور مابعد نو آبادکاروں کا ذکر دکھائی دیتا ہے۔ شاعر نہ صرف ان کا ذکر کرتے ہیں بلکہ ان کو درپیش مسائل بھی بیان کرتے ہیں۔

خبیث بھڑیئے شہروں میں دندناتے تھے
اور ان کی کھال پہ لفظ بشر لکھا ہوا تھا(۱۸)

شاعر نہایت خوبصورتی سے نو آبادکاروں کو بھیڑیوں سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ عہد حاضر کے حالات سے نالاں دکھائی دیتے ہوئے وہ ان حالات پر اور موجودہ آزادی پر بھی طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

شور فرمائیں جو آزادی سمجھتے ہیں اسے
ہم حوالات سمجھتے ہیں سو چپ رہتے ہیں(۱۹)

شاعر نے غلامی کے لیے حولات کا لفظ بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ اور اسی سے نو آبادکاروں کے چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔

نواز شاہد اپنی شاعری میں عمدہ تشبیہات کا استعمال کرتے ہوئے اسے یادگار بناتے ہیں اپنی ایک غزل میں وہ اپنے آپ کو آفتاب سے تشبیہ دے رہے ہیں۔

پی رہا ہوں شراب زندہ ہوں
مانند آفتاب زندہ ہوں(۲۰)

شاعر کے نزدیک ظلم و جبر کو برداشت کرنے کے باوجود مر مر کر جیئے جانا ہی انسانی مقدر ہے۔ ان کی غزلیات میں ہمیں نادر استعارات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جو عہد حاضر کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔

جس کی منزل غروب ہونا نہیں
آسمان پر نیا ستارہ ہوں میں(۲۱)

ایک اور جگہ ستارے کا بطور استعارہ استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میں ہنستی شام کا پہلا ستارہ

اجالوں کو روایت کر رہا ہوں (۲۲)

نواز شاہد عہد حاضر کے حالات سے نالاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ہمیں روشن مستقبل کی آس واضح دکھائی دیتی ہے۔ نواز شاہد کی شاعری کے فکری اور فنی حوالے سے روش ندیم کا کہنا ہے: " نواز شاہد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔۔۔ دجلہ و بغداد، شمع و شاعر، دیار و حرم، دار و رسن، شورش جنوں، جرس کاروان اور چاکِ گریبان جیسے استعارے، علامتیں اور تلمیحات عہد میر و درد سے عہد فیض و فراز تک ایک سلسلہ قائم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ "(۲۳)

حارث خلیق کی شاعری میں مختلف استعارات کا استعمال ہمیں حالات کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

سرمائے کے بھوکے شیروں نے
محنت کے ریوڑ پالے ہیں
جب چاہیں ان کو کھا جائیں
آخر کو قوت والے ہیں (۲۴)

شاعر سرمایہ داروں کے لیے بھوکے شیروں کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔

تلمیح: فضل احمد خسرو کی شاعری میں نادر تلمیحات کا ذکر بھی ملتا ہے وہ ان تلمیحات کا ذکر کرتے ہوئے عہد حاضر کے حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

حر تو لشکر میں ایک ہوتا ہے
اور سارے یزید ہوتے ہیں (۲۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

آنے والا کل ہمارے خواب سے ہے شادماں
موسم کرب و بلا خسرو گزر جانے کو ہے (۲۶)
ایک جیسا ہم سے برتاؤ نہ کر تو اے خدا
میں مکیں ہوں پستیوں کا، وہ کلیم طور تھا (۲۷)

ارشد معراج کی شاعری میں خوبصورت تلمیحات کا استعمال کر کے تاریخ کو عمدہ انداز میں بیان کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ تاریخی و مذہبی واقعات کو نہایت سلیقے سے شاعری کی صورت میں برتا گیا ہے۔

گوتما!

درد ہی درد ہے
روشنی رہگزاروں میں چلتی رہی
جسم ایندھن بنا
اور منصور نے ایک کروٹ جولی
درد بڑھتا گیا(۲۸)

ارشد معراج کی نظموں میں تلمیحاتی انداز اپناتے ہوئے مابعد نو آبادیاتی اثرات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

روش ندیم کی نظموں میں بھی عمدہ تلمیح کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔

انامیکا جنم بھومی ہے یہ مری
جہاں عیسیٰ صلیب شہر کا ہمزاد ہو بیٹھا(۲۹)

عیسیٰ کے ذکر کے ساتھ ساتھ وہ سدھارتھ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

سدھارتھ!
آج تو صدیوں کی حیرانی لیے ان پتھروں کی قید سہتا ہے
پڑی ہے دھول جن پر ان گنت عہدوں کے رستوں کی
عیاں ہیں کس قدر گہری دراڑیں جن پہ وقتوں کی(۳۰)

ضیاء الحسن اپنی شاعری میں تلمیح کے سے انداز میں مابعد نو آبادیات کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے بہتر مستقبل کے خواہاں ہیں۔ وہ غلامی، بدامنی اور بے سکونی کے دنوں کا خاتمہ چاہتے ہیں۔

شاعری کا کام موقوف ہوا
دن ہاتھوں سے نکلتے جارہے ہیں
مجھے جوہری بم کہیں چھپا دینا چاہیے
ایسا نہ ہو کہ سراج کھیلنے کے لیے لے جائے
ڈالر کے کاغذ پر
محبت کا قاعدہ چھاپ دینا چاہیے

تا کہ ہمارے بچے
ہیروشیما اور ناگاساکی
سیر کے لیے جا سکیں (۳۱)

ایک اور جگہ اور اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اپنی ہی ذات کا ہر کوئی اسیر
کوئی غالب ہے نہ میر
کوئی فرہاد ہے نہ قیس
کوچہ یار بھی ویران ہوا (۳۲)

سعادت سعید کی شاعری میں ہمیں مختلف تلمیحات کا ذکر گاہے گاہے دکھائی دیتا ہے۔ تلمیحات کا استعمال کرتے ہوئے وہ نو آبادکاروں کی اصلیت بے نقاب کرتے ہیں اور عہد حاضر کے مسائل کا ذکر بھی ان کی شاعری کی ذینت ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

میں آوارہ ہوا کا جھونکا تھا
مسیحاؤں کو مصلوب کرتی
منصوروں کو سولیوں پہ لٹکاتی
سرمدوں کو قتل کرتی
آوارہ ہوا!!! (۳۳)

مظہر حسین سید تلمیح کے انداز میں حالات حاضرہ کو منظر عام پر لانے کی سعی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ حالات حاضرہ سے بد ظن ہوتے ہوئے انہیں بدلنے کے خواہاں ہیں۔

یہ دل قیام پہ مائل ہے ان دنوں ورنہ
عصا اٹھاؤں تو دریا بھی راستہ ہو جائے (۳۴)

سماجی حالات کی ابتری کا ذکر کرتے ہوئے ان کو کرب وبلا سے تشبیہ دیتے ہیں۔

یہ رنج و غم، یہ مصیبت، یہ دشت تنہائی
مرے خدا مجھے درپیش کربلا تو نہیں (۳۵)

ایک اور جگہ نہایت عمدگی سے منصور کی تلمیح استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہماری لاش پہ منصور بین کرتا تھا
ہم اپنے قتل پہ اس کو بلا کے لے آئے(۳۶)

نواز شاہد کی ترقی پسند فکر میں ہمیں عہد حاضر کی صورتحال کا ذکر مختلف تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اپنی ترقی پسند فکر کو الفاظ کے پیراہن میں ڈھالنے کے لیے وہ تلمیحات و استعارات کا استعمال کرتے ہوئے انہیں صفحہ قرطاس پر اتارتے ہیں۔ ان کی شاعری مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی عمدہ عکاس ہے۔ انہوں نے معاشی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر مابعد نو آبادیاتی نظام کو واضح کرنے کی سعی کی ہے ۔ وہ تلمیحات کا سہارا لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

تخت بلقیس مرا خواب نہیں
خاک پر بوریا بچھالوں گا(۳۷)
علقمہ کے کنارے جانتے ہیں
میں کہاں تشنگی میں خرچ ہوا(۳۸)
جوئے شیر لانا کوہکنی کا سپنا تھا(۳۹)
آب زم زم کا اتنا قصہ تھا
ایک بچہ بلا کا پیاسا تھا(۴۰)
وہ مصر حسن کی ایسی زلیخا
میں یوسف ہوں مگر تقصیر کر دوں
میں وارث شاہ شہر عاشقی کا
کوئی بھاگوں بھری ہو ہیر کر دوں(۴۱)

ان کی اسی تلمیحاتی انداز کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے روش ندیم ان کی شاعری کی فکری و فنی خصوصیات کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں استعارات و تلمیحات کے ساتھ ساتھ نئی اور انوکھی علامتیں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"وہ کلاسیکی، فارسی اور اردو شاعری کے ساتھ ساتھ مقامی شاعری، قومی انقلابی ترقی پسند اور تاریخی خزینوں سے بھی فیض یاب نظر آتے ہیں۔ ایلیا، اصحاب کہف، باغِ عدن، غار حرا، کربلا، وارث شاہ، ہیر رانجھا، کتے، دریائے نیل، سلیمان، یوسف، زلیخا، میر، لشکر، فصیلیں، غلام، شاہ و پیادہ، زنجیر شکم جیسے بیسویں الفاظ ان کے اسلوب

فکر و شعر کی تشکیل کرتے ہیں جن سے وہ مترنم بحروں، منفرد مقطعوں اور متحرک ردیفوں کے ذریعے آرٹ کا دلکش نمونہ تعمیر کرتے ہیں۔"(۴۲)

حارث خلیق کی شاعری میں مستعمل تلمیحات عہد حاضر کی بہترین عکاس ہیں۔ تاریخی اور مذہبی تلمیحات کا استعمال کرتے ہوئے وہ عہد حاضر کے حالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ، جاگیر دارانہ اور آمرانہ نظام حکومت کا ذکر ہمیں ان کی تلمیحات میں بھی نظر آتا ہے۔

پھر ہے طوفانِ نوح کے آثار
کشتی نوح پھر بنانی ہے(۴۳)

کون لا سکتا ہے پانی چچا عباس کے بعد
پیاسے بچوں کی یہ وحشت نہیں دیکھی جاتی
آگ خیموں میں لگاتے ہیں ردا کھینچتے ہیں
بنتِ زہرا کی ہذیمت نہیں دیکھی جاتی(۴۴)

ان کی کتاب "عشق کی تقویم میں" بھی ہمیں تلمیحاتی انداز میں حالات کی ابتری دکھائی دیتی ہے۔

خون سر پر
سارا لشکر ہاتھیوں پر ہے سوار
ابرہا آمادہ جنگ اور ہاتھی بے شمار
چیختے، چنگھاڑتے ان ہاتھیوں کا ڈیل ڈول
الاماں والحفیظ
اک نظر پڑنے سے
سارے شہر پر طاری ہے ہول۔۔۔(۴۵)

عہد حاضر کے نامور شاعر اشکر فاروقی کی شاعری میں بھی ہمیں حالات کی ستم ظریفی واضح دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقے سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی شاعری میں وہ خوبصورت تلمیحات کا استعمال کرتے ہوئے عوام تک اپنے خیالات پہنچانے اور انہیں جھنجھوڑنے کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

غار تاریک سے اک سحر پھوٹ کر
مثل آبِ رواں کشتِ بے زرع میں اس ادا سے بھی

اس کو باغِ جہاں کر دیا
دشت خاموش میں ایک نخلِ صدا محو نغمہ ہوا(۴۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

یا تو سب کو ہی توزر گون ہیولوں میں اتار
ڈھال نمرود کے ہمرنگ فرعونوں کی مثال
مشت قاروں کا ہنر چھین لے قاروں سے بھی
یا سیاہی مرے لوہے کی سنہری کر دے(۴۷)

منظر نگاری: ارشد معراج کی نظموں میں بھی مابعد نو آبادیاتی مناظر کی عکاسی کی گئی ہے کہ گویا سارا منظر قاری کی نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

بارش رکی تو سامنے منظر وہی رہے
ہم خواب بیچنے چلے تھے کہ شہر میں
شیشہ گروں کے آئینہ خانے تڑخ گئے
پھیلی ہوئی چار سو سو دوزیاں کی دھند
آنکھوں کے روزنوں پہ تھا نروان کا غبار(۴۸)

ضیاء الحسن کی شاعری میں بھی ہمیں منظر نگاری کے نمونے دیکھنے میں ملتے ہیں۔ ان کا شاعرانہ انداز اتنا دلکش ہے کہ پڑھنے والا خود کو وہاں محسوس کرتا ہے۔

میں نے ایک ایسا کھیت تیار کرنے میں
عمر صرف کر دی
جس میں کانٹے اگتے ہیں
پہلا پانی چرا کر لگایا
اور فصل پکنے سے پہلے کاٹ لی
اب اس کھیت میں کانٹے اگتے ہیں
میں اس گناہ کی تلاش میں ہوں
جس نے مجھے چوری پر اکسایا(۴۹)

کسی بھی شاعر کی تخلیق میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ جو بھی تخلیق پیش کرے اس میں اتنا اثر ہو کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے نواز شاہد کی شاعری میں ہمیں یہ خصوصیت نظر آتی ہے ان کی شاعری کا حسن یہ ہے کہ وہ جو بھی تحریر کرتے ہیں اس میں کسی نہ کسی منظر کی عکاسی محسوس ہوتی ہے اور ایک قابل شاعر اپنی شاعری سے ایسا منظر کشید کرتا ہے کہ قاری خود کو اس منظر کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اور اپنے آپ کو وہاں محسوس کرتا ہے۔

شب کے خیمے جلا دیئے اس نے
مرے سپنے جلا دیئے اس نے
ہنستا سورج لہو میں ڈوب گیا
دن سہانے جلا دیئے اس نے
مرے بچوں سے چھین کر بستے
آتے لمحے جلا دئے اس نے (۵۰)

حارث خلیق کی نظمیں اس خوبصورتی سے ترتیب دی گئی ہیں کہ ان میں بعض اوقات ہمیں واقعات کا سا گماں ہوتا ہے کہ شاعر نے حسین لمحات کو واقعہ کی صورت میں بیان کر کے قاری کو محظوظ کیا ہے۔ اپنی نظم "بلوچستان ۲۰۱۱ء میں وہ لکھتے ہیں:

بے کفن لاشے بچھے ہیں کُو بہ کُو
پھر سے ارزاں ہے بلوچوں کا لہو
دشت میں کاریز سارے خشک ہیں
خون سے لبریز ہیں جام و سبُو (۵۱)

صنعت تضاد: : مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی ہمیں انہی مسائل کا سامنا ہے جو آج سے برس ہا برس در پیش تھے اور انھی مسائل کا ذکر شاعر حضرات اپنی شاعری میں بھی کرتے ہیں۔ فضل احمد خسرو کی شاعری میں صنعت حسن تضاد کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

خدا کے روبرو آنکھوں کو تر ہونے نہیں دیتا
مرا ابلیس مجھ کو معتبر ہونے نہیں دیتا (۵۲)

سعادت سعید کی تحریروں میں بھی ہمیں صنعت تضاد کے نمونے ملتے ہیں۔ صنعت تضاد کا استعمال کرتے ہوئے شاعر اپنا مدعا قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں وہ غمزدہ بھی ہوتے ہیں اور دوسرے

ہی لمحے وہ ہنستے ہوئے بھی دکھائے دیتے ہیں۔ باختیار ہوتے ہوئے اپنی مجبوری کا ذکر بھی نہایت عمدگی سے کرتے ہیں۔

اپنے ہی سوگ کی آگ میں
اپنا جسم جلانا ہے
ہمارا اختیار بھی ہے
اور مجبوری بھی
جبر و اختیار کے
بے ہوش کرتے کرے میں
اختیار اور جبر کا اختیار بھی
ہمارے ہی پاس ہے (۵۳)

ایسے ہی ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں۔

روتے حکمرانوں کی سلطنت سے
مسکراتے چہرے جلاوطن ہو جاتے ہیں (۵۴)

شاعری میں حسن پیدا کرنے اور عام روایت سے ہٹ کر لفظوں کا عمدہ انتخاب کرتے ہوئے انہیں صفحہ قرطاس پر اتارنے کا ہنر ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ مظہر حسین سید کمال مہارت کے ساتھ شاعری کی انہی خصوصیات کو اپنی تحریروں میں برتتے ہیں اور انہی کے استعمال سے اپنی تخلیقات کو نمایاں کرتے ہیں۔ صنعت تضاد کا استعمال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

تمہی تو باعث آغاز عشق تھے مظہر
تمہی نے ترک تعلق کی ابتدا کی ہے (۵۵)

مظہر حسین سید کی شاعری کے حوالے سے ناصر علی سید کا کہنا ہے: "اس کے شعر کے فکری منظر نامے میں سارے رنگ سفر کے ہیں، راستوں کے ہیں، منزلوں کی تلاش کے ہیں اور اس تلاش میں وہ صرف روایتی راستوں سے نہیں گزرا بلکہ اس نے اپنی تخلیقی اپج سے اس سفر کے لیے نئے افق اور نئے راستے تراشے ہیں۔" (۵۶)

استفہامیہ انداز: روش ندیم کی شاعرانہ خصوصیات میں یہ صفت بھی شامل ہے کہ ان کی نظموں میں استفہامیہ انداز ملتا ہے۔ وہ عہد حاضر کے حکمرانوں سے نالاں ہیں اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے استفساری انداز اپناتے ہیں:

ستارے کیوں نہیں چمکے؟
سویرے کیوں نہیں مہکے؟
چوراہے میں کھڑی برگد کی آنکھیں کیوں نہیں
برسیں؟
زبانوں پر لگے چپ کے یہ تالے کیوں نہیں ٹوٹے؟
خیالوں میں تنے مکڑی کے جالے کیوں نہیں اترے؟
(۵۷)

ضیاء الحسن اپنی تحریروں میں مابعد نو آبادیات کو بیان کرتے ہوئے عہد حاضر کے حکمرانوں سے سوالیہ انداز میں بات کرتے ہیں، وہ ان سے رزق کی کمی کی بابت دریافت کرتے ہیں اور کس خوبصورتی سے اپنا مدعا ان تک پہنچاتے ہیں۔

جنرل صاحب!
میرے بچے کیا کھائیں گے؟
نیشنل سیکورٹی کونسل؟
غیر جانبدار اور شفاف احتساب؟
یا قومی یک جہتی کونسل؟
میں کتنا بے شعور ہوں
آپ اتنے عظیم فیصلے کر رہے ہیں
اور میں سوچتا ہوں
پُھٹی کی قیمت میں کب اضافہ ہو گا؟(۵۸)

عہد حاضر کا یہ نامور شاعر داخلی اور خارجی ماحول کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا نہیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی تخلیقات، انسانی معاشرے، ماحول اور مزاج سے مربوط ہیں۔ وہ اپنے افکار و خیالات

کو جمنے نہیں دیتا بلکہ ان کو صفحہ قرطاس پر اتارتے ہوئے عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ضیاءالحسن کی تحریروں کے حوالے سے سعادت سعید کہتے ہیں: " آدھی بھوک اور پوری گالیاں" کی نظمیں فکر و فلسفہ کے اعتبار سے سامنے کے انسانی ماحول سے مربوط اور منسلک ہیں۔شاعر کے افکار کی بنیاد کوہکن کی اس گرسنگی پر قائم نظر آتی ہے جس کی بدولت وہ طرب گاہ رقیب کا مزدور بنا ہے ایسی صورت میں حالات کی عکاسی میں یہ احتمال بھی ہوتا ہے کہ اسے اس کی جذباتی و نفسیاتی الجھنیں نہ لے بیٹھیں۔" (۵۹) ضیاءالحسن کی تحریریں ماحول کی تبدیلی کی خواہاں ہیں وہ اردگرد کے منجمند ماحول سے بیزار ہوتے ہوئے اسے بدلنے کے خواہاں ہیں۔شاعری میں مختلف مواقعوں پر اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے سوالیہ انداز بھی اختیار کیا جاتا ہے ایسے میں شعراء کا انداز اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ سننے اور پڑھنے والے کو ناگوار بھی نہ گزرے اور شاعر اپنا مدعا بھی بیان کر لے۔

کوئی تحریک چلے تو کیسے ؟
کوئی تائید ملے تو کیسے ؟(۶۰)

ایک اور جگہ شاعر طنزیہ انداز اپناتے ہوئے نو آبادکاروں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے مقامی آبادی سے اس انداز میں ہم کلام ہوتے ہیں۔

عقائد پرستی کے مارے ہوئے دوستو
تم تعصب کی عینک سے
زندہ حقائق کو دیکھو گے کیسے ؟
دکھوں کے لذائز کو بھولو گے کیسے ؟
سکھوں کی نئی وادیوں کو سراہوں گے کیسے ؟
غلامی کی عادت کو بدلو گے کیسے ؟(۶۱)

اشکر فاروقی اپنی تحریروں میں سوالیہ انداز اپناتے ہوئے کہتے ہیں۔

سمندر رائی ہوئی آنکھوں سے پوچھو!
کہ صحرائے ہوئے جذبوں کی وحشت
کہاں تک انتظار ائی ہوئی ہے۔۔۔؟(۶۲)

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں۔

شہر کے بیچ نئی کارگہ ظلم سجی
گھنٹیاں دیر ستم گار کی کیوں بجتی ہیں؟
کون دیتا ہے اذاں بر سرِ مینارِ سراں؟
کیوں مرا خواب سرا موجہء خوناب میں ہے؟
کس لیے شہر تماشا یہ سجا ہے آخر؟
روز یہ دار و رسن کا ہی تماشا کیوں ہے؟
دربدر محن صورت مزدور ہے کیوں؟
کس لیے آزر جاں روز ستم ڈھاتا ہے؟
چابک دستِ زر افروز کو روکے کوئی!
پشت مزدور پر پڑتا ہے سڑاسڑ دیکھو!
میرے شہر کو مری فوج نے لوٹا کیوں ہے؟
کیوں مرے شہر ہیں زنداں محافظ ہیں پھنسے؟
کون سے قریہء آزاد میں سانسوں کو گنوں؟(۶۳)

تمثال کاری: نوے کی دہائی کے بعد شاعروں نے اپنی نظموں، اپنی شاعری میں تمثال کاری کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ ارشد معراج تمثال کاری کا استعمال کرتے ہوئے کمال خوبصورتی سے مابعد نو آبادیاتی اثرات کو بیان کرتے ہیں۔ تمثال کاری در حقیقت شاعری کے مفہوم کو واضح انداز میں بیان کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے
۔

اپنے رومال میں روٹیاں باندھ کر
گاؤں سے ہم چلے
راستے میں کہیں قافلے لٹ گئے
روڑیوں پر پڑی رات رونے لگی
نیند پلکوں پر تھی وہیں سو گئی
خواب قیدی نہ تھے آپ بہنے لگے
پاؤں کیچڑ بنے

ہم مچلتے رہے اور دھنستے رہے
کتے بلی سبھی روٹیاں لے گئے
راستے ہنس پڑے، خواہشیں بجھ گئیں
جسم ایندھن بنے
پھر بھی چاروں طرف رات ہی رات ہے
سارے مدہوش ہیں
کس کو آواز دیں۔۔۔۔(۶۴)

ارشد معراج کی شاعری میں تمثال کاری کا اظہار ہمیں تجریدی آرٹ سے متعارف کراتا ہے۔ وہ ماہر مصور کی طرح کائنات کی خوبصورتی، رعنائی اور دلکشی کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ صناعی میں تمثال کاری کی صورت ہمیں زندگی کے مسائل کا ذکر ملتا ہے۔

سعادت سعید کی تحریروں میں بھی ہمیں تمثال کاری کے نمونے ملتے ہیں۔ مثالوں کے ذریعے شاعر اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اسی مد میں وہ کبھی کسی استاد شاعر کا کوئی مصرعہ اپنی شاعری میں استعمال کرتا ہے، کبھی کوئی قول، اور بعض اوقات کوئی محاورہ استعمال کرتا ہے۔ خدا بزرگ و برتر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جگ میں آکر ادھر ادھر۔۔۔
زمانہ خدا ہے(۶۵)

ایک اور جگہ شاعر مرزا غالب کا مصرعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"خاک میں پنہاں صورتیں، لالہ و گل" (۶۶)

فیض احمد فیض کی نظم " ہم دیکھیں گے " کے چند مصرعے انہوں نے مثال کے طور پر اپنی نظم " دار و رسن کی ۔۔۔" میں استعمال کیے ہیں۔

تخت کون گرائے گا؟
اور تاج کون اچھالے گا؟(۶۷)

فیض احمد فیض نے اسی نظم کو کچھ اس طرح لکھا ہے۔

سب تاج اچھالے جائیں گے

سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی(۶۸)

صنعت لف و نشر: سعادت سید اپنی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے معروف ہیں۔ انکی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عہد حاضر کے حالات کو بھی منظر عام پر لاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کائنات کی رنگینی و رعنائی کو بھی بیان کرتی ہے۔

بارشوں کے موسم میں
دل کے مرغزاروں میں ناگہاں مسرت کوکتی ہے
خاموشی
پر ہجوم لمحوں کی بھیگی ابتری مجھ کو
مشکبار لمحوں کی داستاں سناتی ہے
کوہسار دھلتے ہیں
سبزہ زار دھلتے ہیں آبشار گاتے ہیں اختلاط کے نغمے
بے لباس پیڑوں کی کپکپاتی بانہوں میں
ابر پوش مدہوشی سرسراتی رہتی ہے(۶۹)

مظہر حسین سید کی شاعری میں لف و نشر کا استعمال اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ اور جب الفاظ کا چناؤ نہایت عمدگی سے کیا گیا ہو تو وہ شاعر کے اعلیٰ ذوق اور اس کے بہترین ذخیرہ الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کی علم دوستی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

شجر، چراغ، ہوا، آئنہ، شفق، جگنو
مجھے بتا کہ ترے واسطے میں کیا ہو جاؤں(۷۰)
ہوائیں چلتی رہیں، بارشیں بھی ہوتی رہیں
شجر تنا ہوا ہے، گھونسلا بنا ہوا ہے(۷۱)

نواز شاہد کی شعری تخلیقات میں بھی ہمیں لف و نشر کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں بھی ہمیں ایک ہی چیز سے متعلقہ باقیات دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی ایک نظم " تانڈو" (بلھے شاہ کی نذر) میں ان کے کلام میں موسیقی اور رقص کے متعلقات نظر آتے ہیں۔

تیرے پیروں کے گھنگھرو سلامت رہیں
سلامت رہیں تا قیامت رہیں
رقص زندہ رہے، لے نہ ٹوٹے کبھی
شاہ عنایت کا دامن نہ چھوٹے کبھی
دائرہ دائرہ
سمت گھوما کرے
راہ پر شوق میں، اعلیٰ تر ذوق میں
آئینے ٹوٹ کر اور حیراں ہوں
مکیں جھوما کرے
کوئی موج ہوا، پیچ کھاتی ہوئی (۷۲)

حارث خلیق کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ ہمیں ان کے شاعری میں موجود الفاظ کے انتخاب سے ہوتا ہے ۔ حارث خلیق نے نہ صرف اردو بلکہ پنجابی زبان میں بھی شاعری کی۔ ان کی پنجابی زبان کے الفاظ نہایت حسین اور عوامی ہیں۔

پتراں وچ گھنگھور اداسی
رنگ بسنتی ڈسدا نئیں
بوٹا جا اگدا تے ٹیڈھا
پھل، پھول تہ کوئی لگدا نئیں (۷۳)

ایک اور جگہ وہ ایک کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

غلام اعظم مسلی عرف گاما
ناک چپٹی، ہونٹ موٹے
رنگ اوداا اور دھنسی بے شوق آنکھوں میں

وہ گدلا پن

جو ہر منظر کو دھندلاتا(۷۴)

تکرار لفظی: روش ندیم کی شاعری میں ہمیں بہت سی جگہوں میں تکرار لفظی کے ذریعے شاعرانہ حسن دیکھنے میں ملتا ہے۔اسی شاعرانہ لفظی سے نہ صرف تخلیق کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ سننے اور پڑھنے میں بھی نظم اپنا حسین تاثر چھوڑتی ہے۔

چلو یادیں بناتے ہیں

چلو خاموش رہتے ہیں

چلو ہم آج سب باتیں آنکھوں سے کہتے ہیں

یونہی ناراض ہو کر کبھی تم کو منانے کی

کوئی شرطیں لگاتے ہیں(۷۵)

تکرار لفظی سے شاعری کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ نئی نئی تراکیب کا استعمال شاعری کا حسن بڑھا دیتی ہیں۔ڈاکٹر رشید امجد کا کہنا ہے: " یہاں ہر شاعر نے تکرار لفظی کے ساتھ آنکھوں سے باتیں کرنے کی سعی کی ہے۔" (۷۶) سعادت سعید بھی اپنی شاعری میں تکرار لفظی کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔انکی شاعرانہ مہارت کے باعث یہ چیزیں پڑھنے والے کو بوجھ محسوس نہیں ہوتیں۔

وہ رات بن کر مجھے ملی تھی

میں راکھ بن کر اسے ملا ہوں

وہ رات بن کر مجھے ملے گی

میں راکھ بن کر اسے ملوں گا(۷۷)

مظہر حسین سید کی شاعری میں بھی ہمیں تکرار لفظی کے نمونے ملتے ہیں۔شاعری کا لطف اور حسن انہی الفاظ اور الفاظ کے استعمال میں ہی پوشیدہ ہے۔ مظہر حسین سید اپنی شاعری میں جہاں نادر تشبیہات اور استعارت کا استعمال اپنی شاعری میں کرتے ہیں وہیں ان کی شاعری میں ہمیں تکرار لفظی کی مثالیں بھی دیکھنے میں ملتی ہیں ۔تکرار لفظی بعض اوقات قاری کی طبیعت پر بوجھ کا سا اثر ڈالتی ہے مگر باذوق شاعر اپنے قاری کے لیے لطف کے مواقع پیدا کرتا ہے۔

مرا احساس ہوا اس کو بڑی دیر کے بعد

اور یہ احساس بھی احساس دلانے سے ہوا(۷۸)

پھر یوں ہوا کہ ہم نے اسے جان کہہ دیا

پھر یوں ہوا کہ جان سے جانا پڑا ہمیں(۷۹)

کردار نگاری: روش ندیم نے اپنی نظموں میں نہایت نفاست سے کرداروں کو مخاطب کیا ہے۔ اپنی نظموں میں ہی وہ کسی نظم میں اپنے بھائیوں کو، کسی میں اپنی ماں کو، کسی میں انامیکا کو مخاطب کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔اور کبھی وہ دوستوں کو مخاطب کرنے کے لیے " سنو ارشد " لکھ کر دوستوں سے ہم کلام ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

چھوٹے بھائیوں!

سات سمندر پار کسی دنیا کی چاہت دل میں لے کر

تم جو ہم سے سال و سال کی دوری پر ہو

تم کو ایسی کیا جلدی تھی!

وہ ایک دنیا جو ہم تم نے

ماں اور باپ کی انگلی تھامے قائم کی تھی

جس کے اندر وعدوں کی کچھ جھیلیں تھیں(۸۰)

بھائیوں کے علاوہ ان کی نظموں میں ہمیں انامیکا کا کردار بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کردار کے علاوہ ان کی ایک نظم " حرامجادی " میں تاجی کا کردار بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جو اپنے سیاہ رنگ کے باعث دھتکاری جاتی ہے۔ انامیکا کردار کے حوالے سے ڈاکٹر طارق ہاشمی کا کہنا ہے: " روش کے ہاں بعض نظموں میں ایک کردار ابھرتا ہے جس کے ساتھ کلام کر کے وہ اپنا کتھارسس کرتا ہے یہ کردار ایک دوشیزہ انامیکا کا ہے۔ شاعر نے اپنی نظموں میں اس کردار کے جمالیاتی خط و خال یا اس کے ساتھ ساتھ کسی نوعیت کے تعلق کی کسی کیفیت کو موضوع نہیں بنایا لیکن عصری مسائل کی تلخیوں اور ان سے جنم لینے والی پریشانیوں کو اس کے ساتھ ساتھ مختلف حوالوں سے شئیر کیا ہے۔" (۸۱)

شعور کی رو: سعادت سعید کی تحریروں میں ہمیں ناسٹلجیائی عناصر بھی ملتے ہیں۔ شاعر اپنے ماضی کے یادگار عہد کو یاد کرتے ہوئے افسردہ ہو جاتا ہے اور خیالات کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔ وہ خوبصورت اور حسین لمحوں کو یاد کرتا ہے جب ہر طرف سکون اور امن کا پہرہ تھا، کہیں کوئی ڈر اور خوف نہ تھا۔

کبھی میری آنکھیں منور تھیں
سوچوں کی کاری تگ و دو
خرابوں کے طوق الم سے معرّٰی
شب و روز ہستی کے
روشن مناظر سے مسرور
اپنی لگن میں
ہواؤں میں اڑتی
نگینوں کی صورت چمکتی
کئی تتلیاں دیکھی تھیں! (۸۲)

ترقی پسند شاعروں، نقادوں اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ لکھاریوں نے اپنے تئیں حالات کو سدھارنے اور ان کو بہتری کی طرف گامزن کرنے کی اپنی سی سعی کی ہے۔ کہ وہ عہد حاضر کے حالات سے نالاں ہیں اور ان کو بدلنے کے خواہاں ہیں۔ سعادت سعید کا کہنا ہے کہ "اردو ادب میں دو نظریئے ایسے ہیں جن کے وسیلے سے ادیب اور قاری کے شعور نے زندگی اور سماج کے ارتقاء اور مسائل کو کسی حد تک سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔ایک تو حقیقت نگاری کا نظریہ اور دوسرا ترقی پسند نظریہ۔ جہاں تک حقیقت نگاری کا تعلق ہے اس نظریے کے پیروکار سماج کی پراگندگی، خباثت اور بدحالی کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ مسائل اور صورت حال کا جیسے کہ وہ ہیں ویسے ہی مطالعہ سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن مسائل اور صورتحال کے ماضی اور مستقبل سے انہیں بحث نہیں ہے۔(۸۳)

نواز شاہد کی شاعری میں بھی ہمیں شعور کی رو کے نمونے ملتے ہیں۔ شاعر بعض اوقات اپنی سوچوں میں اس حد تک گم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں ماضی کی یادوں کو رقم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اپنے ماضی کے سنہرے دور کو یاد کرتے ہوئے شعور کی رو میں بہتے ہوئے ماضی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔

مرے جسم پر پھر سے لوہے کی کنگھی چلاو

گھنیرے شجر کی پناہ واماں سے مجھے کیا ملا
پھر سے آرہ بناو مجھے چیر ڈالو
کہ میں نے حصار اجازت کی تحقیر کر کے
تری مملکت میں قدم اپنی مرضی سے فرشِ زمیں پر
رکھا(۸۴)

مراعاۃ النظیر: فضل احمد خسرو کی شاعری میں مراعاۃ النظیر کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

بوند بوند امرت ہے بارش پیار کی
زہر میں ڈوبا سماج اپنی جگہ (۸۵)
جو سحر کی نوید ہوتے ہیں
وہ ستارے شہید ہوتے ہیں(۸۶)

قافیہ وردیف: کسی بھی شعری تخلیق کی خوبصورتی اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس میں شاعری کی فنی خصوصیات کو کس حد تک برتا گیا ہے۔ضیاء الحسن کی شاعری میں ہمیں یہ تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ان کی شاعری میں نہ صرف تشبیہ واستعارہ کا عمدہ استعمال برتا گیا ہے بلکہ قافیہ وردیف کو بھی نہایت خوبصورتی سے صفحہ قرطاس پر اتارا گیا ہے۔ان کی شعری تخلیقات میں ہمیں قافیہ وردیف کی پابندی نظر آتی ہے۔

کچھ نہیں مرگ وحیات
بے ثباتی،نہ ثبات
کام ہے عشق کا کام
بات ہے دل کی بات
کیا کریں جمع یاں
جائیں گے خالی ہاتھ (۸۷)

ایک اور لکھتے ہیں۔

مصروف بہت ہو گئے ہم کار جہاں میں
پھیلا ہوا ہے کچھ اتنا کہ سمیٹتا ہی نہیں

کیا خاک کوئی خواہشِ امروز کریں گے
اک عہد گزشتہ تو گزرتا ہی نہیں (۸۸)

نواز شاہد کی شاعری میں بھی ہمیں قافیہ وردیف کی پابندی دکھائی دیتی ہے۔ شاعری میں وزن کا مناسب اور متوازن استعمال ہی شاعری کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ جس سے قاری پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ نواز شاہد کی شاعری میں ہمیں مابعد نو آبادیاتی اثرات واضح انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔

سارے پیمان توڑ آیا ہوں
خود کو راستے میں چھوڑ آیا ہوں
ترے منظر بدل نہ سکتے تھے
اپنی آنکھیں ہی پھوڑ آیا ہوں
کاغذی پھول دے رہے ہو کیا
میں ستارے بھی چھوڑ آیا ہوں (۸۹)

مظہر حسین سید عہد حاضر کے ممتاز اور ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات میں ہمیں عہد حاضر کے مسائل، دکھ اور درد واضح انداز میں دکھائی دیتے ہیں، وہ باغیانہ انداز میں حاکم وقت سے بھی مخاطب ہوتے ہوئے حالات کی ستم ظریفی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی ہمیں شعری خصوصیات اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

امیر شہر سے سچ بات برملا کی ہے
غریب شہر نے کتنی بڑی خطا کی ہے
میں اس کے پاس رہوں پر ذرا پرے ہٹ کر
ستم ظریفی نے تجویز یہ سزا کی ہے (۹۰)

ایک اور جگہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ایک بے نام جزیرے کے مکیں ہیں ہم لوگ
ایسے موجود ہیں جیسے کہ نہیں ہیں ہم لوگ
ہم کو تہذیب و تمدن میں کہاں ڈھونڈتے ہو
عہد وحشت ہے میاں جسکے قریں ہیں ہم لوگ (۹۱)

اپنے اشعار میں عہد وحشت کا ذکر کرتے ہوئے شاعر موجودہ ملکی حالات کی ابتری کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان کے اسی انداز کے بارے میں روش ندیم کا کہنا ہے: " ایک آرٹسٹ کا لاشعور اگر اس کے خاموش اثرات سے تشکیل پاتا ہے تو اس کا شعور اس کی گہری آگہی اور جانکاری و تفکر سے بنتا ہے۔ مظہر حسین سید کا شعری آرٹ اسی تفکر اور شعری آرٹ سے مزین ہے۔ یہ تفکر و آگہی ایک ایسے شاعر کا اظہار ہے جو سماجی نظریے، اس کی ذمہ داریوں اور اس کی جدوجہد سے جڑے ہیں۔" (۹۲)

مجاز مرسل: شاعری در حقیقت الفاظ کا حسن انتخاب ہے۔ جس سے انسانی خیالات کو عمدگی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیرا جاتا ہے۔ شاعری کا لطف ہی دراصل الفاظ کے چناؤ اور ان کی خوبصورتی میں ہے۔ ایک لفظ کو استعمال کرتے ہوئے اس کے کئی طرح کے معانی پیش کرنا شاعر کا کمال ہے۔ اپنی شاعرانہ مہارت سے شاعر اپنے خیالات عوام تک پہنچاتا ہے۔ نواز شاہد کی شاعری میں ہمیں یہ عنصر دکھائی دیتا ہے۔ وہ مابعد نو آبادیاتی صورتحال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور اس کے اثرات کا ذکر ہمیں ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں تشبیہ، استعارہ کے ساتھ ساتھ مجاز مرسل کی مثالیں بھی دیکھنے میں ملتی ہیں۔ جس میں کوئی بھی تخلیق کار جز کہہ کر کل مراد لیتا ہے۔ اور کہیں کل کا ذکر کرتے ہوئے جز مراد لیا جاتا ہے۔

سوچتا ہوں تو ایک عالم ہوں
دیکھتا ہوں تو میں کہیں بھی نہیں (۹۳)
اس زمیں کو بھی چھو نہیں سکتے
اور کہنے کو آسماں ہم ہیں
یہ کسی اور جہاں میں نہ ہو
کوئی ہم سا نہیں، جہاں ہم ہیں (۹۴)

نظمیہ اسلوب: نوے کی دہائی میں اردو نظم نگاروں کی صف میں ایک اہم اور معتبر نام ارشد معراج کا ہے ۔ شاعری میں ہیت، تکنیک اور اسلوبی اثرات نے ان کی شاعری کو ایک نیا آہنگ دیا۔ آپ کی شاعری تشبیہ، استعارہ، تلمیح، تکرار لفظی، تمثال کاری اور پیکر تراشی سے لبریز ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں میں ہمیں فلیش بیک تکنیک کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کی شاعری فکر اور فن کے لحاظ سے اپنی ایک الگ اہمیت رکھتی

ہے۔ ارشد معراج کی شاعری میں ہمیں ترقی پسند فکر کی عکاسی ملتی ہے ان کی نظمیں اپنے اچھوتے انداز کی بناء پر دلوں میں گھر کر جاتی ہیں۔ ان کا اسلوب جدت آمیز ہے۔ جو ان کی شاعری کو جلا بخشتا ہے۔ محبت کا ذکر وہ اپنی نظم میں نہایت خوبصورتی اور عمدہ اسلوب میں کرتے ہیں۔

محبت کا سنی رنگت
جو دو رنگوں میں کھلتی ہے
تو پھر برسات ہوتی ہے
بدن قوس قزح میں اک نئی رنگت لیے
جب سانسیں لیتا ہے
شگفتہ تازگی کی مہکار بنتی ہے
ہوائیں گدگداتی ہیں
پرندے رقص کرتے ہیں(۹۵)

مکالماتی انداز: عصر حاضر کے معروف شاعر اور دانشور روش ندیم کی شاعرانہ تخلیقات میں بھی ہمیں مابعد نو آبادیاتی عناصر نظر آتے ہیں۔ نوے کی دہائی اور اس کے بعد کے عرصے میں ابھرنے والے شعراء نے معاشی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو نظم کے ذریعے اجاگر کیا۔ معاشرے کے مسائل، محکوموں، مزدوروں اور پرولتاریہ طبقے کے دکھوں اور رنج کو آزاد نظم، معرٰی اور نثری نظم کی صورت میں منظر عام پر لایا گیا۔ روش ندیم کی شاعری میں انہی محکوموں کے دکھوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ موجودہ سیاسی حالات سے نالاں ہیں اور ان کو بدلنے کے درپے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی نظموں میں کھلم کھلا بغاوت دکھائی دیتی ہے۔ فن کے لحاظ سے ان کی شاعری ہمیں عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ فنی خصوصیات سے بھرپور ان کی شاعری نادر تشبیہات و استعارات، منظر نگاری، تلمیحات، تکرار لفظی اور نظمیہ انداز سے بھرپور ہے۔ روش ندیم اپنی نظموں میں مکالماتی انداز اپنا کر حسن کی سی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ مکالماتی شاعری کا سا انداز ہمیں اردو ادب کے بڑے بڑے شاعروں کے ہاں ملتا ہے اور اسی انداز کا استعمال روش ندیم بھی کرتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں شاعری کی فنی خصوصیات میں بھی انہی عوامل کا ذکر ملتا ہے۔ مکالماتی انداز اپناتے ہوئے روش ندیم لکھتے ہیں:

انامیکا!
ذرا دیکھو

کہ سورج کتنے جنموں سے مری گلیوں میں ٹھہرا ہے
مگر ایسی سیاہی تو کبھی دیکھی نہیں ہو گی
سیہ سورج، سیہ گندم، سیہ آنسو، سیہ پرچم
سیہ اوراق کبھی تم نے دیکھے نہیں ہوں گے
انامیکا! جنم بھومی ہے یہ میری (۹۶)

خود کلامی: روش ندیم کی نظموں میں ہمیں خود کلامی کے عنصر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اے صنم! آ کہ ہم سوچنا چھوڑ دیں
بات یوں ہے کہ اب زندگی میری گردن دبوچے
مری آگہی کا ثمر مانگتی ہے (۹۷)

روش ندیم کی انہی شاعرانہ خصوصیات کے حوالے سے رشید امجد لکھتے ہیں:

"پیکر تراشی اور تمثیل نگاری کے ساتھ ساتھ روش ندیم کے ہاں مکالمہ اور خود کلامی بھی نظم کی داخلی بنت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔" (۹۸) روش ندیم کی خود کلامی میں بھی ہمیں مابعد نو آبادیاتی عناصر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں نو آبادکاروں کی طرف سے دیے گئے رنج و آلام کا ذکر کرتے ہیں۔

میں اس سے ملتجی ہوتا ہوں کہ اس منتظر سورج کو
ہنس کے دیکھ لے تا کہ وہ ڈھل جائے (۹۹)

عہد حاضر کے شعراء نے اپنی شاعری کی بدولت مابعد نو آبادیاتی اثرات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ نہ صرف اپنی اس کاوش میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے نو آبادکاروں کا اصل چہرہ بھی بے نقاب کیا ہے۔ نو آبادکار بظاہر اپنے آپ کو تہذیب و تمدن کا پروردہ سمجھتے تھے مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ محکوموں، مظلوموں اور مزدوروں کو مذید غربت کی چکی میں پسنے پر مجبور کرنا اور ان کی محنت کا ان کو جائز معاوضہ نہ دینا یہ نو آبادکاروں کا اصل مقصد تھا جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ انہوں نے محکوم طبقے کو اس حد تک مجبور کر دیا کہ وہ یہ سوچتے ہی نہیں تھے کہ ان کو آزادی کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے۔ ان کا مطمح نظر صرف اور صرف اپنے اور اپنی اولاد کے لیے رزق کا حصول تھا۔ معاصر شعراء نے اپنی تحریروں سے نہ صرف ان میں یہ احساس اجاگر کیا بلکہ انہیں اپنے حق کے لے لڑنے پر آمادہ بھی کیا۔

معاصر اردو ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے اسلوبی اثرات:

ترقی پسند اردو شاعری پر مابعد نو آبادیات کے اسلوبی اثرات کا جائزہ لینے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلوب کسے کہتے ہیں؟اس سے کیا مراد لیا جاتا ہے؟ مختلف لوگ اس کی وضاحت کس انداز میں کرتے ہیں یا ان کے نزدیک اسلوب کی اصل تعریف کیا ہے۔عام طور پر اسلوب سے مراد طرز تحریر یا انداز نگارش لیا جاتا ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کس طرح کی زبان یا کیسا انداز بیان اختیار کرتا ہے ۔ہر تخلیق کار کی یہ خواہش یا منشا ہوتی ہے کہ اس کا تخلیق کردہ شاہکار خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو نظم یا نثر کی صورت میں پڑھنے والے کو متاثر کرے اور اس پر اپنا دیرپا اثر چھوڑے۔اس مقصد کے لیے وہ زبان کا استعمال قاری کی سمجھ کے حساب سے کرتا ہے۔کچھ لکھاری سادہ یا سہل زبان استعمال کرتے ہیں جبکہ بعض لکھاری پیچیدہ اور مشکل اسلوب اختیار کرتے ہیں۔اسلوب ہی درحقیقت کسی بھی تخلیق کار کی پہچان ہوتا ہے۔

آسان لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی خیالات وافکار کا ایسا انداز بیان جو منفرد بھی ہو اور دلکش بھی اسلوب کہلاتا ہے۔انگریزی میں اس کے لیے style کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اردو میں اس کے لیے طرز بیان اور فارسی میں "سبک" کا لفظ مستعمل ہے۔اردو ادب میں اگر طرز کی بابت بات کی جائے تو اس کا آغاز سب سے پہلے میر نے کیا اثر لکھنوی لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلے میر نے طرز کو اہمیت دی اور سختی سے کاربند رہا بعد ازاں دوسروں نے تتبع کیا۔" (۱۰۰)

اسلوب کی تعریف وتوضیح اتنی سہل نہیں۔ہر کسی کے نزدیک یہ لفظ الگ معانی ومفہوم رکھتا ہے۔تاہم چند لغات اور مفکرین اس کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں۔فیروز اللغات میں اس کا مطلب کچھ اس طرح درج ہے: "اسلوب(ع۔امذ) طریقہ،طرز،روش،جمع۔اسالیب" (۱۰۱)فرہنگ تلفظ شان الحق حقی میں اس کے معنی اس طرح لکھے ہیں: "(امذ) طور۔طریقہ۔وضع۔انداز۔روش۔حکمت عملی"(۱۰۲) فرہنگ عامرہ میں اس کا معانی یہ ہے: "اسلوب(اس۔لوب) طریقہ۔طرز۔روش۔جمع،اسالیب" (۱۰۳) نور اللغات کے مطابق:"اسلوب(ع۔مذکر)راہ۔صورت طرز۔طریقہ۔روش"(۱۰۴) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس لفظ اسلوب کو لاطینی زبان سے منسوب کیا گیا ہے۔

انگریزی نثر نگار اور مورخ Gibbon لکھتے ہیں: "اسلوب کردار یا شخصیت کا عکس ہے" (۱۰۵) اسلوب کی بابت swift کا کہنا ہے کہ Proper words in proper places (مناسب الفاظ کا مناسب جگہ پر استعمال ہی اسلوب کی سچی تعریف ہے) (۱۰۶) امریکی شاعر ایمرسن لکھتا ہے: A man,s style is his mind,s voice (انسان کا اسلوب اس کی ذہنی آواز ہے) (۱۰۷) جرمن فلسفی سٹائل کے حوالے سے لکھتے ہیں: "اسٹائل خیال کا سایہ ہے" (۱۰۸) کروچے کا کہنا ہے: "جب اظہار وجدان کی برابری کرے تو اسٹائل وجود میں آتا ہے" (۱۰۹) انگریز مصنف کولرکوپ کے نزدیک: " تحریر میں اسلوب ویسا ہی ہے جیسے دیگر انسانی تعلقات میں اچھی عادتیں"

(Style in writing is much the same as good manners in others human intercourse.)(۱۱۰)

معروف نقاد مڈلٹن مرے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں: " یہ اظہار کی وہ ذاتی انفرادیت ہے جس کی بناء پر ہم کسی مصنف کو پہچان لیتے ہیں"

(Style means that personal idiosyncrasy of expression by which we recognize a writer).(۱۱۱)

انگریزی ادبیات کے ہی ایک اور مفکر نے سٹائل کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

زبان خیال کا لباس ہے، اور اسلوب اس لباس کی مخصوص تراش اور وضع ہے۔"

(Language is the dress of thought and style is the particular out and fashion of the dress.)(۱۱۲)

اسلوب کے حوالے سے رابعہ سرفراز کہتی ہیں: " ایک ادبی اصطلاح کے طور پر جو لفظ ان دنوں زیادہ رواج پزیر ہے اور جسے ایک مستند ادبی اصطلاح کا درجہ حاصل ہے وہ اسلوب ہے۔ اب یہ لفظ ایک ادبی اصطلاح ہی نہیں تنقیدی موضوعات میں جداگانہ فن کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے اسلوبیات اور اسلوبیاتی لفظ بن گئے ہیں جو Style اور Stylistic کے فنی پہلوؤں سے متعلق مباحث کے ذیل میں آتے ہیں" (۱۱۳) آل احمد سرور اس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

" ادب میں کسی چیز کی مکمل تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں ایسی تعریف ہو سکتی ہے جو بڑی حد تک صحیح ہو یا بیشتر حالتوں پر جس کا اطلاق ہوتا ہو۔ سٹائل یا اسلوب کی جامع مانع تعریف اسی وجہ سے خاصی مشکل ہے۔"

(۱۱۴) اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں اس لفظ کی باقاعدہ تعریف کرنا مشکل امر ہے۔ نثار احمد فاروقی کا کہنا ہے: " اسلوب یا طرز نگارش کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر کوئی فیصلہ کن یا دوٹوک بات کہی جاسکے۔ آسان لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشین بھی ہو اور منفرد بھی ہو۔ اسی کو انگریزی میں اسٹائل کہتے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے طرز یا اسلوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی یا جدید فارسی میں اس کو سبک کہتے ہیں۔" (۱۱۵) اسلوب سے کسی مصنف کی ذاتی زبان کا استعمال مراد لیا جاتا ہے۔ وہ مصنف اپنی مرضی اور منشا سے جس ڈھب سے چاہے زبان کا استعمال کرے کوئی بھی تخلیق کار جو اسلوب اختیار کرتا ہے وہ اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ اسی پہچان سے جانا مانا جاتا ہے جیسے کہ میر کا اسلوب، غالب کا اسلوب، پریم چند کا اسلوب وغیرہ۔ اس کے علاوہ مختلف شعراء یا مصنفین جب کسی مخصوص طبقے یا حلقے یا پھر کسی دور کے دبستان کی زبان کو استعمال کرتے ہیں تو وہ بھی اسلوب ہی کہلاتا ہے۔ مثلاً ایہام گوئی کا اسلوب ، لکھنؤ کا اسلوب، ترقی پسند مصنفین کا اسلوب۔ اس کے ساتھ ساتھ شعری اصناف میں زبان کے استعمال کو بھی اسلوب کا نام دیا جاتا ہے جیسا کہ غزل کا اسلوب، قصیدے یا مرثیے کا اسلوب، مثنوی کا اسلوب یا ناول کا اسلوب وغیرہ۔

اسلوب کی اقسام: اسلوب کی عام طور پر دو اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

نثری اسلوب

شعری اسلوب

نثری اسلوب: یہ اسلوب کی وہ قسم جو در حقیقت نثر کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں خیالات و جزبات کو بیان کیا جاتا ہے۔ خیالات یا جزبات کے اظہار یا ابلاغ کا ایسا انداز جو براہ راست قاری کے ذہن تک منتقل ہو جائے اور قاری مصنف یا تخلیق کار کے انداز بیان یا ابلاغ کو جاننے میں کامیابی حاصل کر لے۔ عموماً مصنف وہی انداز بیان اختیار کرتا ہے جو واضح، سادہ اور قطعی ہو۔ جس میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی یا جزباتیت نہ ہو۔

شعری اسلوب: شاعری میں ایسا انداز تحریر اختیار کرنا جس سے جزبات نغمگی کا پیراہن اوڑھ کر قاری تک پہنچ جائیں۔ یہ ایسی ماورائی کیفیت ہے جو قاری کے لیے وجدان کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ اس میں ہم شاعر کے نرم اور لطیف جزبات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ کومل جزبات کا اظہار اگر شاعری میں نہ کیا جائے تو اس سے شعر میں یا

شعری اسلوب میں خوبصورتی کا عنصر پیدا نہیں ہوتا۔ جس سے شاعر کا اپنا کلام دوسروں تک پہنچانے اور اپنا پیغام دوسروں تک ترسیل کرنے میں ناکامی کا سامنا رہتا ہے۔

نثری اور شعری اسلوب: امتیازات و خصائص: جیسا کہ ادب کو دو خانوں میں منقسم کیا جاتا ہے شعر و نثر ۔ دونوں کے لوازمات و عناصر ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہیں۔ بظاہر دونوں ہی تخلیقی عمل ہیں مگر دونوں کی اپنی الگ الگ ضرورتیں ہیں جو انہیں ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہیں۔ نثری اسلوب کو ادائے خیالات اور شعری اسلوب کو اظہار جزبات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر یہ کہا تو بے جا نہ ہو گا کہ نثری اسلوب میں تشبیہ ،استعارہ، ردیف، قافیہ کی جگہ سادگی و سلاست ہوتی ہے جبکہ شعری اسلوب میں ان سب کی جگہ جزبات کے اظہار کی زبان استعمال کی جاتی ہے، تخیل کی زبان استعمال کی جاتی ہے اور وہ زبان کسی قاعدے اور قانون کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ اس حوالے سے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

" نثر کی زبان اور نظم کی زبان میں فرق ہوتا ہے۔ حالانکہ دونوں ادب کی شاخیں ہیں۔ یعنی دونوں میں حسن بیان کی نوعیت مختلف ہے۔ نظم کی زبان تخلیقی ہوتی ہے نثر کی تعمیری۔ نظم اس چاندنی کی طرح ہے جس میں سائے اور گہرے اور بلیغ معلوم ہوتے ہیں۔ نثر اس دھوپ کی طرح ہے جو ہر چیز کو آئینہ کر دیتی ہے۔ نظم وہ کنجی ہے جو ذہنی تصویروں کا صنم کدہ وا کرتی ہے۔ نثر وہ تلوار ہے جو حق و باطل کا فیصلہ کرتی ہے۔ نظم میں ہر لفظ بقول غالب گنجینہ معنی کا طلسم ہوتا ہے۔ نثر میں (لفظ) وہ اینٹ ہے جو کسی دوسری اینٹ کے ساتھ مل کر تاج محل بناتی ہے۔ نظم زبان کی توسیع اور نثر اس کی حفاظت کا نام ہے۔ نظم مئے خانہ ہے اور نثر آئینہ خانہ۔" (۱۱۶)

پروفیسر آل احمد سرور کے اس بیان سے نظم اور نثر کے فرق کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم کی زبان اور نثر کی زبان دونوں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ایک میں اگر جزبات کی بات کی جاتی ہے تو دوسری میں خیالات کی بابت ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک کو اگر آئینہ خانہ مانا جاتا ہے تو دوسری کو مئے خانہ گردانا جاتا ہے۔

اسلوب کی تشکیل کے عناصر: اسلوب خواہ کوئی بھی ہو نثری یا شعری اس کی اپنی الگ خصوصیات اور عناصر ہوتے ہیں۔ اس میں عام طور پر مصنف کی اپنی ذات، عام انسانی رویے اور زبان و خیال کی خصوصیات شامل ہوتی ہیں۔

مصنف کی ذات: مصنف کی ذات یا اس کی انفرادیت کے حوالے سے اسلوب کی جو خصوصیت بیان کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنا مخصوص انداز فکر رکھتا ہے، مخصوص انداز بیان رکھتا ہے جو سراسر اس کا ذاتی ہوتا ہے۔ یہ انداز بیان ہی ہے جو اسے دوسروں سے ممیز کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مرزا خلیل بیگ لکھتے ہیں:" جس طرح ایک زبان کے محاورے کا سچائی کے ساتھ دوسری زبان کے محاورے میں ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح کسی مصنف کے اسلوب کو جو کہ اس کی اپنی ذاتی ملکیت ہوتی ہے نہ تو کوئی دوسرا مصنف اپنا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی نقل یا تقلید کر سکتا ہے۔"(۱۱۷) کسی بھی تخلیق کار کا اسلوب ہی اسے دوسروں سے نمایاں کرتا ہے۔ ہر شخص جس طرح اپنی مخصوص پہچان رکھتا ہے بالکل اسی طرح اس کا اپنا مخصوص اسلوب بھی ہوتا ہے۔ جو اس کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب یا چناؤ کے عمل سے ہم فوراً پہچان لیتے ہیں کہ یہ انداز کس شاعر یا مصنف کا ہے۔ آل احمد سرور کہتے ہیں" جو الفاظ کوئی مصنف استعمال کرتا ہے وہ ایک دور یا مزاج یا روایت کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یعنی وہ انفرادی کے ساتھ ساتھ اجتماعی خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔"(۱۱۸) اس کے علاوہ بہت سی رسمی اور کاروباری تحریروں میں مصنف کی ذات معدوم ہو کر رہ جاتی ہے۔

عام انسانی رویے: اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے ہم انسانی رویوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ انسانی رویے اسلوب کی وسعت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ تحریر و تقریر کی گرفت سے نکل کر انسانی رویوں سے متعلق قاری کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ انسانی رویے جس میں خوشی، غمی، جیت، ناکامی، بول چال، رہن سہن، چال ڈھال اور وضع قطع وغیرہ کا سا انداز شامل ہوتا ہے عموماً اس میں نفسیات، سماجیات، اور انسانیت جیسے علوم شامل ہوتے ہیں جو ہمارے انسانی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

زبان و خیال: اسلوب کی اس خصوصیت میں زبان اور خیال کا ذکر شامل ہے۔ کسی بھی بات کے اظہار کے لیے زبان کا موزوں اور مناسب استعمال اور خیال کے موثر اظہار کا ذکر اس میں بیان کیا جاتا ہے۔ معاصر ترقی پسند شاعری پر مابعد نو آبادیات کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اب یہ اثرات اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں خواہ وہ سیاست کی صورت میں ہو یا سماج کی صورت میں، معیشت کی صورت ہو یا تعلیمی میدان، ہمیں ہر جگہ مابعد نو آبادیات کے اثرات دکھائی دیتے ہیں معاصر شعراء کے اسلوب پر بھی ہمیں مابعد نو آبادیاتی اثرات کی چھاپ

دکھائی دیتی ہے۔ان کی شاعری میں یاان کے اسلوب پر مابعد نو آبادیات کے اثرات کس حد تک قائم ہیں ذیل میں ان کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

سعادت سعید: عہد حاضر کے شاعر سعادت سعید کے شعری مجموعوں " شناخت " اور " بانسری چپ ہے " کے اسلوب کا ذکر کیا جائے تو اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ انہیں لفظوں کا جادو گر کہا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں الفاظ کا استعمال اس مہارت اور خوبی سے کیا گیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔کہا جاتا ہے کہ الفاظ کا گھاؤ کبھی نہیں بھرتا،انسانی روح پر الفاظ کا اثر دیر پا رہتا ہے اور جب لفظ کہنے والا شاعر ہو اور اپنے فن میں یکتا اور بے مثال ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ انسانی دل و دماغ پر اپنے دیر پا اثرات نہ چھوڑیں۔ان کی کتاب " شناخت "کی ایک نظم " پل دو پل " میں وہ مابعد نو آبادیاتی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ جیتے جاگتے انسان کو سپیئر پارٹس کی مانند قرار دیتے ہیں۔یعنی ان کے نزدیک مابعد نو آبادیاتی دور میں انسان کی قیمت سپیئر پارٹس سے بھی کم ہے۔وہ لکھتے ہیں:

انسانوں کو سپیئر پارٹس کی مانند
اپنی کاروں کے انجنوں میں لگاتی ہنر وری
اس کے شعور سے کھلتی ہے
اور میں بدھ کے مجسمے کی طرح پتھر ایا رہوں!
یہ ممکن نہیں(۱۱۹)

نو آبادکاروں کے نزدیک انسانوں کی کوئی حیثیت نہیں۔وہ انسانوں کو پرزوں جتنی وقعت بھی نہیں دیتے ۔ایسے میں ہم دیکھتے ہیں کہ سعادت سعید مایوس نہیں ہیں۔وہ خاموش مجسمے کی مانند چپ چاپ بیٹھنے کی بجائے اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔سعادت سعید کے اسلوب کی بابت ذکر کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں تضمین کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔اپنی بات کی وضاحت کے لیے کسی دوسرے شاعر کا کلام یاان کا کوئی معروف مصرعہ استعمال کرنا تضمین کے زمرے میں آتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

خدا عظیم ہے،ہمیشہ باقی!
"جگ میں آکر ادھر ادھر۔۔۔"
" زمانہ خدا ہے! " (۱۲۰)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

" سب کچھ کہاں لالہ و گل میں۔۔۔" (۱۲۱)

ان کی شاعری میں ہمیں خوبصورت علامتیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اپنی بات کو مختلف علامتوں کی بدولت بیان کرنا دراصل بات کے دیرپا اثر کو قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

ضیاء الحسن: ترقی پسند فکر اور سوچ کے حامل شاعر کی تخلیقات میں مابعد نو آبادیاتی اثرات نہ صرف سیاسی سماجی سطح پر دیکھنے میں ملتے ہیں بلکہ اسلوبی لحاظ سے بھی ان کی شاعری میں ہمیں مابعد نو آبادیاتی عناصر جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تخلیق " آدھی بھوک اور پوری گالیاں" میں جس انداز سے انہوں نے اپنی نظموں کو ترتیب دیتے ہوئے ان کے نام رکھے ہیں اس سے ان کا ترقی پسند شعور واضح انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ ضیاء الحسن بنیادی طور پر میلان کنڈیرا کے مضامین سے متاثر ہوتے ہوئے شاعری کرتے ہیں۔ میلان کنڈیرا کے وہ مضامین جو محمد عمر میمن نے فکشن کے نام سے ترجمہ کیے ہیں ان میں وہ وجود کی بازیافت پر زور دیتے ہیں اور ضیاء الحسن کی شاعری میں بھی ہمیں انسان کے وجود کا ذکر ملتا ہے۔

ان کی شاعری میں مابعد نو آبادیاتی دور کے لیے علامتیں بھی ملتی ہیں۔ وہ حالات کی مطابقت سے کبھی بم، بارود، اسلحہ، بندوق، دہشت، گالیاں اور نفرت کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی وہ ماحول کی خوبصورتی اور آنے والے دنوں کی بہتری کا ذکر کرتے ہوئے خوش آئند مستقبل کی بابت بات کرتے ہوئے عمدہ علامتوں کو شاعری کی ذینت بناتے ہیں۔

شام کا پھول کھلا
خوش بوئیں پھیل گئیں مہکی رات
چاند ابھرا تو یہ دل ڈوب گیا
تن گئی نور کی چادر چار سو
گفتگو ہونے لگی
رات کی چاند کے ساتھ
چاند کی دل سے مرے
مرے دل کی تجھ سے
اک فسوں پھیل گیا
نور میں بھیگی ہوئی بات سے خوش بو نکلی

چار سو پھیل گئی (۱۲۲)

کلیاں، پھول، چاند، ستارے، آسماں، زمیں، تتلیاں، زنجیر، زنداں اور ستارہ جیسی علامتیں ہمیں ان کی شاعری میں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ ضیاء الحسن اپنی شاعری کے دوران بعض اوقات قرانی آیات کا سہارا لیتے ہوئے بات کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ عہد حاضر کے حالات سے نالاں اور انسان کے خسارے کا ذکر قرانی آیات کے حوالے سے بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہی کشاکش ہستی، وہی خرابی دل
قسم زمانے کی! انساں ابھی خسارے میں ہے (۱۲۳)

ضیاء الحسن کی شاعری سے، ان کی تحریروں اور ان کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا سیاسی سماجی شعور بہت پختہ ہے۔ وہ اپنے معاشرے میں رہتے ہوئے اس کی برائیوں سے نظریں نہیں چراتے، بلکہ ان پر کڑھتے ہوئے ان کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری مابعد نو آبادیات کے سیاسی، سماجی لحاظ سے پُر ہے۔ فکر و فن کے لحاظ سے انہوں نے شاعری میں جو فنی خصوصیات استعمال کی ہیں وہ بھی اپنے اندر ما بعد نو آبادیاتی اثرات کا وسیع سمندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کی تخلیق " بار مُسلسل " کے حوالے سے امجد طفیل کا کہنا ہے: " بار مُسلسل کی غزلوں میں اسالیب، موضوعات اور زبان و بیاں کا تنوع بہت خُوشگوار ہے۔ غزل مسلسل سے مزاج کی وحدت کی غزل اور روایتی غزل جس میں ہر شعر ایک مکمل اکائی میں ڈھلا ہوتا ہے ایمائیت، رمزیت، لہجے کا گُداز اور بعض اوقات براہ راست بیان، مگر یہ سب ایک شاعرانہ خوب صورتی کے ساتھ آئے ہیں اور ان میں کوئی بات بھی کھٹکتی نہیں۔ " (۱۲۴) ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہے کی جیسے وہ ہم سے براہ راست مخاطب ہوں۔ ان کا بیانیہ انداز انکی الگ پہچان بناتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

فصل کاشت کر لُوں
تو تمہاری خبر لیتا ہوں
فصل کاشت نہ کروں
تو بھوکے مر جائیں گے میرے بچے
اور تمہارے بھی
بنجر ہو جائے گی یہ دھرتی
گر جائیں گی دیواریں مرے آنگن کی

کھل جائیں گے جانور (۱۲۵)

ایسے ہی ایک اور جگہ وہ اپنی شاعری میں بیانیہ انداز اپناتے ہوئے مقامی آبادی سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں ان کے لباس، رنگ اور جسم سے گھن کا ذکر کرتے ہیں۔ نو آبادکاروں کے لیے مقامی آبادی کا وجود کسی اچھوت سے کم نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں افضل اور اعلیٰ جانتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

کنیز فاطمہ!
تمہارے ہاتھ پانو، یوں تڑخے ہوئے نہ ہوتے
پسینے سے بُو نہ آتی
لباس بدرنگ اور میلا نہ ہوتا
تم گندم کاٹنے اور کپاس چُنتے
عظیم تو لگتی ہو، حسین نہیں
تم سے ہمدردی تو کی جاسکتی ہے، محبت نہیں (۱۲۶)

روش ندیم: عہد حاضر کے نقاد، ترقی پسند فکر رکھنے والے مفکر روش ندیم کا تعلق بھی ترقی پسند سوچ رکھنے والے طبقے سے ہے۔ ان کی تحریریں بھی ہمیں ان کے ترقی پسند شعور سے آگاہ کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ سیاسی سماجی حالات سے نالاں اور ان کو بدلنے کے خواہاں روش ندیم اپنی تحریروں میں مظلوم طبقے کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب ہمیں بعض جگہوں پر باغیانہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ امراء و وزراء سے مخاطب ہوتے ان سے استفہامیہ انداز میں بات کرتے ہیں۔ انکی تحریریں جہاں محکوم طبقے کے لیے آس امید کا پیغام لے کر آتی ہیں وہیں وہ مابعد نو آبادیاتی نظام کے خلاف بھی تحریریں رقم کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ زندگی کا خواہ کوئی سا بھی شعبہ ہو نو آبادکاروں کے اثرات ہر جگہ ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی شاعرانہ تخلیقات میں وہ الگ اسلوب کے حامل ہیں اور یہ اسلوب ہی ان کی پہچان کا باعث ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی شاعری میں انہوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ بات کی وضاحت کے لیے انگریزی الفاظ کا استعمال معیوب بھی نہیں مانا جاتا۔ جین، جیکٹ، پینٹ، وڈکا، کیلنڈر، اسٹاک ایکسچینج، ڈپلومیسی، داس کیپیٹال، بگ بینگ، گارشیا، بایوڈیٹا، ٹارگٹ کلنگ، مال روڑ، نیوز کاسٹر، پبلک اور میسجز جیسے الفاظ ہمیں ان کے اسلوب میں دکھائی دیتے ہیں جو انہیں دوسروں سے نمایاں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری

میں ہمیں بیانیہ انداز نظر آتا ہے۔ بیانیہ اسلوب اپناتے ہوئے وہ اپنے خیالات ہم تک پہنچاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

کب سنتے ہیں۔۔۔۔۔!
یہ دروازے آخر کب سنتے ہیں؟
کب کھلتے ہیں۔۔۔۔۔!!
ہر آنے جانے والے پر یہ کب کھلتے ہیں؟
ہم تو بس دہلیز پہ رک کر
ہاتھ میں تازہ پھول لیے
تکتے رہتے ہیں (۱۲۷)

ان کی تخلیقات کو پڑھتے ہوئے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں مکالماتی اسلوب بھی اختیار کیا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے بات کر رہے ہیں۔ مکالماتی اسلوب بھی تحریر کا حسن ہوتا ہے اس سے تحریر میں ایک لُطف اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے جس سے نہ صرف قاری محظوظ ہوتا ہے بلکہ اس تحریر کا اثر بھی دیرپا ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

سُنو!
معذرت چاہتا ہوں!
وہ جو کچھ بھی تھا
۔۔۔۔وہ محبت نہیں تھی
قسم سے نہیں تھی! (۱۲۸)

ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سوچتا ہوا ذہن رکھتے ہیں جس سے ان کے شعور کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے کسی پابندی کے بغیر اپنی نظمیں تحریر کی ہیں۔ ان کی نظموں میں ہمیں نئے تصورات ملتے ہیں اور ان کا اسلوب ان کے اس تصور کے تابع دکھائی دیتا ہے۔ اپنے منفرد اسلوب کے تحت وہ معاشرتی بگاڑ کو واضح کرنے میں کوشاں ہیں اور نہ صرف کوشاں ہیں بلکہ ان کے حل کے لیے سرگرداں بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مابعد نو آبادیاتی دور کی شاعری میں ہمیں انسانی بے بسی اور حقیقت پسندی کی واضح مثال ملتی ہے۔

فضل احمد خسرو: ترقی پسند فکر کے حامل شاعر کی شاعری اور ان کے شاعرانہ اسلوب میں ہمیں ایک نکھار اور دلکشی کا عنصر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں ہمیں مابعد نو آبادیات کے اثرات سے بھرپور دکھائی دیتی ہیں۔ اسلوب کا ذکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب میں الفاظ کا انتخاب بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ایسے میں کسی بھی تحریر میں فصاحت وبلاغت اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے الفاظ کے انتخاب میں ماہر ہونا اور زمانہ کے مطابق اپنے اسلوب کو بدلنا ہی ماہر اور کامیاب شاعر کی پہچان ہوتی ہے۔ فضل احمد خسرو کی شاعری میں ہمیں یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں غم جہاں کو بیان کیا ہے۔ تخلیق کار کا یہ کام ہے کہ وہ کائنات کے سربستہ رازوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں منظم انداز میں بہترین اسلوب کے اندر عوام کے سامنے پیش کرے۔ اسلوب میں ہی ترنم اور نغمگی جیسی صفات بھی آتی ہیں۔ اور اگر کسی تخلیق میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہوں اور کسی دوسری زبان کا فرد اس تخلیق کو سنے تو وہ یہ جان جائے گا کہ اس میں نغمگی کے عناصر اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ کسی کا کلام ہے۔ فضل احمد خسرو لکھتے ہیں:

بڑا پوتر سا جزبہ
بہت مقدس کا ایک رشتہ
عجیب بھی ہے
غریب بھی ہے
محبتوں کا امین بھی ہے
دلوں میں پلتا یقین بھی ہے
مری نفی ہے
اسی نفی میں ہے ایک اثبات زندگانی
مری کہانی
کہ جیسے خوشبو گلاب اوڑھے ہوا سے کھیلے
کوئی مغنی دلوں کے راز و نیاز چھیڑے
فضا میں چاہت کے ساز چھیڑے
یہی گھڑی ہے
یہی وہ لمحہ

خدا سے جو ہم کلام کر دے
مسافتوں کو تمام کر دے(۱۲۹)

فضل احمد خسرو کے اسلوب کی یہ صفت ہے کہ وہ زندہ اور جاندار لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ان کے الفاظ سادہ اور سہل ہوتے ہیں کہ عام قاری اس سے آسانی سے مطلب اخذ کر سکے۔اپنی تحریر کو پر زور بنانے کے لیے شاعر اسلوب میں زور بیان کا استعمال کرتے ہوئے اسلوب کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔اس حوالے سے ماجد مشتاق رائے کا کہنا ہے:

" اسلوب کی ایک اہم خوبی زورِ بیان ہے ۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فن کار کس حد تک جزبے کے شدید عوامل اور قوی محرکات سے متاثر ہوا ہے ۔شعری اسلوب میں زورِ بیان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ شاعری میں جزبات کی شدت کو قائم رکھنا بڑے فن کار کا کام ہے ۔زورِ بیان کی بدولت جزبے کی شدت کی آنچ الفاظ کو کندن بنا دیتی ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ شاعر جوش بیان میں آگ کے استعارے کو اپنائے اور ہر لفظ کو گرما دے ۔"
(۱۳۰)

کسی بھی شاعر کے اسلوب میں خیال کو کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔کیونکہ خیال کی بناہر ہی کوئی شاعر اپنے جزبات قاری تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کر پاتا ہے۔اور انہی خیالات کی بنا پر ہی قاری مصنف یا شاعر کے اصل مقصد کو جاننے میں کامیابی حاصل کر پاتا ہے۔فضل احمد خسرو کی شاعری میں ہمیں زور بیان اور خیال کی بلندی جیسی اسلوبی صفات نظر آتی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

کیا اس کو کہتے ہیں جینا؟
آہیں بھرنا، آنسو پینا
غم روزینہ، رنج شبینہ
پل میں مرنا، پل میں جینا

ایسے کب تک کرنا ہو گا

جینا ہے تو لڑنا ہو گا(۱۳۱)

الفاظ انسان کے خیالات کو عملی جامہ پہنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔اب اگر الفاظ کا انتخاب عمدہ اور دلکش ہو گا تو وہ قاری پر مثبت اثر ڈالے گا اور اس کا اثر بھی دیرپا ہو گا۔خیالات کو نہایت عمدگی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر اتارنا بھی کسی فن سے کم نہیں اور ایسے میں بہترین اسلوب کے تحت ہی اس فریضے کو انجام دیا جاسکتا ہے۔شاعر عہد حاضر کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے نالاں ہیں اور اس کا ذکر کرنے کے لیے بہترین اسلوب اختیار کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

خلیفتہ الارض محض انساں تھا

اور انساں میں دوریوں کا رواج کب تھا

جسے خدا نے امیں بنایا یہ اس بشر کا مزاج کب تھا

محبتیں ہی محبتیں تھیں

یہ تفرقہ اور خراج تب تھا

جو آج انساں کا ضابطہ ہے(۱۳۲)

عہد حاضر کے یہ نامور شاعر اپنی شاعری میں مابعد نو آبادیاتی اثرات کا بیاں بھی بڑے بلیغ انداز میں کرتے ہیں ۔ان کا شاعرانہ اسلوب ہمیں ان کے عہد کے دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔یہ اسلوب ہی ہے جو ان کی شعری حسن کو دوبالا کرتے ہوئے اس میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

نواز شاہد: عہد حاضر کے بے باک اور منفرد لہجے کے حامل شاعر نواز شاہد کا ترقی پسند شعور ہمیں ان کے خیالات کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کی مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی جھلک بھی دکھاتا ہے۔ان کی شعری خصوصیات فکر و فن میں اپنی مثال آپ ہیں۔ان کے شاعرانہ اسلوب کا ذکر کیا جائے تو نواز شاہد کی شاعری اور ان کا اسلوب یکتا اور بے مثال ہے وہ مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی عکاسی کے لیے منفرد اسلوب کا سہارا لیتے ہیں ۔ایسا شعری اسلوب جو قاری کی طبیعت پر گراں گزرے بغیر اپنا اثر چھوڑے۔ان کی شاعری میں ہمیں نظمیہ اسلوب دکھائی دیتا ہے۔اپنی ایک نظم اعتراف میں وہ لکھتے ہیں:

میر کی بے خودی سے حال تک

روز و شب اور ماہ و سال تک

کتنے موسم آتے جاتے ہوئے
لذت ہجر سے وصال تک
کاسۂ چشم حیرتی ء تمام
غیرتِ خواب سے خیال تلک (۱۳۳)

ان کی شاعری میں ہمیں ایسے عناصر ملتے ہیں جو ان کی شعری خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنی بات کی وضاحت کے لیے واقعہ نگاری کا سا اسلوب اپناتے ہیں جس کو پڑھتے ہوئے سارا منظر قاری کی آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم " رُوداد " میں لکھتے ہیں:

میں اپنی ذات کی بنجر زمیں پر ہل چلانے میں
حسین شاموں کے سائے ہار دیتا ہوں
دمکتے خواب کا چہرہ
بڑی تازہ فضائیں وار دیتا ہوں
میں اپنے گرم لوہو اور پسینے کی
رواں لہروں سے
سیرابی و شادابی کے ریوڑ ہانک لاتا ہوں (۱۳۴)

ان کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف ان کے ہم عصر شعراء بڑی بے باکی اور فراخ دلی سے کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں علامتوں کا عمدہ استعمال، تشبیہات و استعارات کا کمال مہارت سے استعمال انہیں دوسروں سے ممیز کرتا ہے۔ روش ندیم لکھتے ہیں: "ان کے ہاں سب سے قابل توجہ دیا، مئے، شب اور روشنی کے الفاظ اور ان کے دیگر مترادفات ہیں۔ جیسے انہوں نے اپنی شعری آرٹ میں گوناگوں معنوی حیات کے ذریعے اسے ایک فنی اور فکری وحدت میں پرو دیا ہے۔ یہ علامتیں اور استعارے ان کی فکری تفہیم کے سلسلے میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔" (۱۳۵) کسی بھی تخلیق کار کو عمدہ اسلوب اپنانے کے لیے محنت اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تخلیق کار ایسے الفاظ کو منتخب کرتا ہے جو عبارت میں ربط اور جان پیدا کرنے کا باعث بنیں۔ ایسے الفاظ جو تخلیق کار کے اسلوب کو پراگندہ اور منتشر کر دیں ان کا استعمال عمدہ اسلوب میں معیوب سمجھا جاتا ہے اور کسی بھی تخلیق کار کے لیے لازم ہے کہ وہ ایسے الفاظ کا انتخاب عمل میں لائے جو قاری کے ساتھ خوش اخلاقی کا سا شیوہ اپنائیں۔ زبان سلیس، سادہ اور سہل ہو جو پڑھتے ہی دل میں گھر کرتی جائے۔ نواز شاہر کی شاعری میں

ہمیں زندگی کے حوالے سے خوبصورت استعارے اور علامتیں ملتی ہیں جو ان کے عمدہ اسلوب کی پہچان ہیں ۔عہد حاضر میں مابعد نو آبادیاتی صورتحال کے حوالے سے جہاں وہ پشیمان ہیں وہیں ان کی تحریروں میں ہمیں روشن مستقبل کی آس بھی دکھائی دیتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

صبح نگاراں کی پہلی کرن
دن کی بانہوں میں سمٹا ہوا روشنی کا بدن
چاندنی کی بہاروں میں گھلی ہوئی
نرم لہجے کی لو
کھلتی کلیوں کی سرگوشی میں اٹی
زندگی کی مہک
رقص کرتی ہواؤں کی مدہم کھنک
پہلی بارش کے قطروں میں بھیگا ہوا آرزوئے جہاں
(۱۳۶)

مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی عمدہ وضاحت ہمیں ان کی شاعری میں جابجا دکھائی دیتی ہے۔ان کی نظمیں ہمیں اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ نو آبادکاروں کے جانے کے باوجود ہم ابھی تک ان کے دیے گئے نظام میں جکڑے ہیں اور اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔نواز شاہد اسی بات کا ذکر عمدہ شاعرانہ اسلوب اپناتے ہوئے اس میں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مظہر حسین سید: معاصر ترقی پسند شاعروں کی صف میں منفرد لہجے اور مزاج کے حامل شاعر کی شاعری جہاں سیاسی، سماجی حالات کی عکاس ہے وہیں ان کی شاعری مابعد نو آبادیاتی صورتحال کے حوالے سے بھی معروف ہے۔ان کی شاعرانہ فکر انہیں دوسرے شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔انہوں نے معاشرے کے دکھی، بے بس اور کمزار عوام کے لیے شاعری کی۔انہوں نے اپنی شاعری میں شاعرانہ اور اسلوبی مہارتوں کا استعمال کرتے ہوئے اس بات کا بین ثبوت دیا کہ ان کی شاعری جہاں عہد حاضر کے حالات کی نمائندہ ہے وہیں ان کی شاعری میں ہمیں عمدہ شعری تراکیب اور فکری وفنی خصوصیات ملتی ہیں۔ان کی شاعرانہ خوبصورتی ان کے لہجے کا اثر اور الفاظ وتراکیب کا عمدہ استعمال انہیں اپنے عہد کے شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ان کا شعری اسلوب سادہ اور سہل ہے۔

لفظوں کا انبار لگایا
لیکن بات نہیں کہہ پایا
مجھ کو تو اس بات کا دکھ ہے
اس نے بھی مجھ کو سمجھایا(۱۳۷)

مظہر حسین سید کی شاعری میں ہمیں ایک الگ ہی انداز دکھائی دیتا ہے۔ کائنات کا یہ دستور رہا ہے کہ نئے آنے والوں کو اپنی جگہ اور اپنا راستہ خود بنانا پڑتا ہے، کچھ نیا کر کے، کچھ نئے خیالات منظر عام پر لا کر اپنا مقام بنانا پڑتا ہے ورنہ ان کے الفاظ بھی وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ مظہر حسین سید اسلوب میں اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت رکھتے ہیں۔ اور یہی شناخت انہیں دوسرے شاعروں کی صف میں ممیز کرتی ہے ۔ قاضی قیصر الاسلام لکھتے ہیں:" کسی سیاق کے ہاتھوں کسی اسلوب کا تعین کیا جانا ایک ایسا عمل ہے جو ادب کی طرف خارجی اور داخلی کے ہر دو قطبین یا ہر دو حیات کے اندر رہتے ہوئے ہوتا ہے۔ لہذا ادب میں اسلوب کی مذکورہ صورتحال کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں اسلوب کی مختلف صورتوں کے اوصاف کو دیکھا جانا ممکن ہے تو ان اوصاف کو کسی مخصوص مصنف یا ادیب کی ایک عہد یا پھر کسی مخصوص ترغیب و تحریک یعنی کسی ایک صنف ادب کے حوالے میں زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔" (۱۳۸) مظہر حسین سید کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ہم ایک الگ ہی دنیا سے آشنا ہوتے ہیں اور حیرت و مسرت کی سی کیفیت ہمیں ان کے خیالات سے متعارف کراتی ہے۔ اپنے شعری اسلوب میں وہ "میں" کے ساتھ " ہم "کا لفظ استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا رشتہ مقامی آبادی سے کس قدر گہرا ہے۔

کوئی آیا نہیں جواب اس کا
میں خلا تک پکار آیا ہوں(۱۳۹)
ایک بے نام جزیرے کے مکیں ہیں ہم لوگ
ایسے موجود ہیں جیسے کہ نہیں ہیں ہم لوگ(۱۴۰)

تخلیق کار کی تخلیقات کو جانتے ہوئے ان کی انفرادیت کو ہی ان کا اسلوب کہہ دینا سراسر غلط ہے۔ انفرادیت بری اور بھلی دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ اچھی انفرادیت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچھا اسلوب تشکیل پاتا ہے۔ مظہر حسین سید کی شاعری میں بھی ہمیں وہی انفرادیت نظر آتی ہے۔

اشکر فاروقی: معاشرتی حالات وواقعات سے متاثر ہوتے ہوئے کچھ بھی تحریر کرنا درد مند دل رکھنے والوں کا وطیرہ ہے۔ عہد حاضر میں وہ تخلیق کار جو نام نہاد جمہوریت کے خلاف ہیں اور عوام کا ساتھ دیتے ہوئے ان پر ہونے والے مظالم کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔ اپنی تحریروں اور تخلیقات میں وہ ایسے ایسے شاہکار عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ جس کے باعث عوام میں شعور بیدار ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے حق کی جنگ لڑنے کے لیے کمر کس لیتے ہیں۔ نامور شاعر اشکر فاروقی بھی عہد حاضر کے حالات سے نالاں ہیں۔ معاشرتی ناہمواری، نا انصافی اور ظلم و جبر کے خلاف ان کا دل بھی کڑھتا ہے۔ وہ ان سب کا ذکر اپنی شاعری میں کرتے ہوئے ان کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ اپنی شاعری اور اپنے بے باک انداز سے وہ عوام میں معروف ہیں۔ وہ معاشرے کے سلگتے ہوئے موضوعات کو اس خوبصورتی اور عمدگی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔ عہد حاضر میں مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو مختلف شعراء نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ ظلم و جبر اور نا انصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اشکر فاروقی نے اپنے عمدہ اسلوب کے باعث معاشرتی خود غرضی، ریاکاری اور آدم زاد کی بے توقیری کے خلاف لکھا۔ ان کا منفرد اور، منجھا ہوا اسلوب انہیں اپنے ہم عصروں میں نمایاں کرتا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہم بھی سرِ ناسُوت ہیں
تم بھی سرِ ناسُوت ہو
ایک دن یم لاہُوت میں
ہم بھی فنا ہو جائیں گے
تم بھی فنا ہو جاؤ گے (۱۴۱)

کسی بھی دور میں تخلیق کار معاشرتی صورتحال کو دیکھتے ہوئے وہاں کے حالات وواقعات کو اپنی تحریروں میں اجاگر کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاعر اور ادیب معاشرے کے رہنما اور ہادی ہوتے ہیں تو یہ بے جا نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ معاشرے کے ان مسائل کو منظر عام پر لاتے ہیں جو معاشرے میں رواج پا چکے ہوتے ہیں اور جن سے چھٹکارا پانا ناممکن سی بات نظر آتی ہے۔ اپنی ایک نظم " جرم کیا غریبوں کا" میں وہ خدائے بزرگ و برتر کو مخاطب کرتے ہوئے غرباء کی بابت دریافت کرتے ہیں کہ ان غریبوں نے ایسا کیا جرم کیا کہ ان کی قسمت میں ایسی ذلت لکھ دی گئی۔ اپنی ایک نظم میں عمدہ اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے حالات کی ستم ظریفی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جرم کیا غریبوں کا
ذلتوں کے ماروں کا
بھوک کے علاوہ
ان گنت عذابوں کا
آہنی سلاخوں میں
زندگی بتانی ہے۔۔۔
منڈیوں کے مقتل میں
جبر کے بزاروں میں
مفلسوں کی آہیں بھی
اک نوائے قسمت ہیں
اک ادائے قسمت ہیں
قاسم جہاں مولا
تجھ سے پوچھتا ہوں میں
تو رحیم ہے تو پھر
تو نے ایسی قسمت کو
خلق کر دیا کیسے ؟(۱۴۲)

اشکر فاروقی رب تعالیٰ سے مخلوق کی بابت دریافت کرتے ہیں کی غریب ہونا کہاں کا جرم ہے۔ جس کی پاداش میں غرباء ذلتوں میں گھری زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ایسے ہی ایک اور جگہ عمدہ اسلوب کا استعمال کرتے ہوئے وہ باری تعالیٰ سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خدائے تقدیر!
میری قسمت!
اور تیرا وہ عدل و انصاف کا ترازو
عجب تفاوت

کہ میں ہمیشہ ہی دوسروں کے غموں کا کوئی مداوا
سوچوں
مگر یہ تیری وسیع دنیا
کوئی بھی اک دل نہیں ہے اس میں
جو میرے غم کو بھی کھوج سکتا(۱۴۳)

اشکر فاروقی کا ترقی پسند شعور ہمیں ان کی شاعری میں واضح دکھائی دیتا ہے۔ ان کا اسلوب بھی ان کے اسی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اشکر فاروقی کا منفرد اسلوب اپنے معاشرے کے مسائل کو عمدگی سے اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اسی اسلوبی انداز کی بناء پر وہ اپنے ہم عصروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ہم عصر قاضی فیض الاسلام لکھتے ہیں: "محاروات اور ضرب الامثال کسی بھی زبان وادب کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ لیکن تراکیب ان میں نئی روح پھونکتی ہیں۔ اشکر نے اسلوب بیان کی رنگینی اور دلکشی کے لیے خوبصورت تراکیب وضع کی ہیں۔ جس سے الفاظ کی شوکت اور سلاست میں کمال درجے کی رعنائی وجود میں آگئی۔ فارسی زبان سے ان کی دلچسپی نے خوبصورت تراکیب کی تراش خراش اور بناوٹ میں ان کی مدد کی۔ اور یوں اردو زبان وادب نئی تراکیب سے مزین ہو کر حیاتِ تازہ کی جائے رواں میں بدل گیا۔" (۱۴۴)اشکر فاروقی کی شاعری اپنے انوکھے موضوعات اور جداگانہ اسلوب کی بناء پر نمایاں مقام رکھتی ہے۔ عہد حاضر کی مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی وضاحت کے لیے ان کی شاعری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ارشد معراج: عہد حاضر کے منجھے ہوئے لہجے اور خیال کی ندرت رکھنے والے معروف شاعر ارشد معراج کی شاعری فکر و فن کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اسلوبی حوالے سے بھی نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں مابعد نو آبادیاتی حالات کا ذکر نسل در نسل کے دکھوں اور مصائب کا ذکر کر کے واضح کیا گیا ہے۔ ان کے شعری اسلوب کی یہ خصوصیت ہے کہ چند الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے پوری کہانی، پورا واقعہ بیان کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

تقاضا کب کیا ہم نے
کہ سورج، چاند تارے
آسماں، قوس قزح، جھیلیں
ہمارے نام ہو جائیں(۱۴۵)

ارشد معراج کے شاعرانہ اسلوب کا ذکر کریں تو ہمیں ان کی شاعری میں عمدہ علامتیں اور تراکیب نظر آتی ہیں ۔جو ان کی شاعری کے حسن کو بڑھا دیتی ہیں۔ تتلیاں، جگنو، ستارے، چاند تارے، گھٹا، شام، سائے، شاعر و مطرب را، جام و مینا، سہانی شام جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی شاعری کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں ۔ارشد معراج عہد حاضر کے حالات سے نالاں ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اس عمدگی سے حالات کا ذکر کرتے ہیں کہ سارا منظر آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ ایسے ہی خیالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ردی کی ٹوکری اندر پھیلے لفظوں کے انبار
ان میں راتوں کا آسیب
تنہائی کی بگڑی صورت
ہونٹوں پر گالی کی بو
سر درتوں کی بے کیفی
ایک ابلتی راکھ کا ڈھیر
منظر میں بے ہوش ٹریفک
کھانسنے اور کھنگارنے والا اندھا دھند دھواں (۱۴۶)

ارشد معراج کی شاعرانہ خصوصیات کا ذکر کریں تو قاری پر یہ ادراک ہوتا ہے کہ ان کے خیالات کی سمجھ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ان کی شاعری میں جزبات کی شدت کو وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو خود اس کرب سے گزرا ہو۔ ارشد کے مطالعے اور تجربے سے ابھرتی ہوئی محکوموں اور مظلوم طبقے کے وہ دکھ، درد اور اذیت ہے جو آج ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکی ہے اور جس کا ذکر اگر ہمارے عہد حاضر کے حکمرانوں کے سامنے کیا جائے تو وہ اسے گناہ اور جرم تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ارشد معراج عمدہ شعری اسلوب کا سہارا لیتے ہوئے ان تمام احساسات، جزبات اور خیالات کو صفحہ قرطاس پر اتارتے ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ ارشد معراج نے مخلص تخلیق کار کی حیثیت سے معاشرے کے ان زخموں کو زبان دی ہے جو عہد حاضر میں اس معاشرے میں رچ بس گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

عجب یہ سوگواری ہے
نہ شامیں سرمئی رنگت، نہ صُبحیں نور بنتی ہیں
نہ راتیں نیند کے مشکیزے لاتی ہیں

(ہماری آنکھ، صحرا، خواب پیاسے ہیں)
نہ نٹ کھٹ بارشوں کی رت ہی باقی ہے
نہ ہاتھوں کے کٹوروں میں دعا کے حرف باقی ہیں
تھکن اعصاب پر طاری
زبان لکنت زدہ، باتیں قنوطی
پھول پژمردہ، تعلق دوستی، رشتے
محبت، آشتی، قصے
جو قصہ گو سناتے ہیں
اداسی خان خلیوں میں مسلسل رقص کرتی ہے
ہماری نظم کی ہر سطر میں بینائی روتی ہے (۱۴۷)

ایسی اور اس طرح کی کئی نظمیں ارشد معراج کے ترقی پسند شعور کی عکاس ہیں۔ اپنی شاعری میں وہ ان خیالات کا ذکر کرتے ہوئے عوام کی زبان بنتے ہیں اور حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں حالات کی بربادی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

حارث خلیق: عہد حاضر کے ترقی پسند شاعر حارث خلیق کی شاعری ان کے ترقی پسند شعور کو اجاگر کرنے میں معاون کردار ادا کرتی ہے۔ فکر و فن کے حوالے سے ان کی شاعری کی بابت کہا جائے تو یہی فکری و فنی خصوصیات ان کی شاعری کے حسن کو بڑھا دیتی ہیں اور نہ صرف شاعری کے حسن کو بڑھاتی ہیں بلکہ اسے یادگار بھی بنا دیتی ہیں۔ خوبصورت استعارے اور تراکیب کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے شاعری کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔ اس کے اسلوب کا ذکر کریں تو اس کا اسلوب سادہ اور سہل ہے۔ اکثر مقامات پر ان کی زبان اس قدر سہل ہوتی ہے کہ عام قاری بھی آسانی سے ان کے خیالات کو جان جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

آج جب بارش ہوئی
یہ بھی ایک خیال آیا
کیوں نہ ایک بادل کو
رازداں بناؤں میں
جو بھی مجھ پر گزری ہے

اس کو سب سناؤں میں
تم سے جو بھی کہنا ہے اس کو سب بتاؤں میں (۱۴۸)

سید کاشف رضا: معاصر اردو ترقی پسند شعراء میں بے باک لکھاریوں میں ایک نام سید کاشف رضا کا بھی ہے جن کی تحریروں میں ہمیں ملک و قوم کے لیے احساس کے جزبات دکھائے دیتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی اثرات کا ذکر انہوں نے برملا کیا ہے۔ ان کا عمدہ شعری اسلوب ان کے خیالات کو جاننے، پرکھنے اور سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی تمام شاعری میں ملک و قوم کی سیاسی و سماجی صورتحال کی عکاسی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے رومانیت پر بھی لکھا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں ان کی محبوبہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ بعض جگہوں پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض کی طرح ان کی محبوبہ بھی ان کا وطن ہے۔ جس کے لیے وہ پریشان اور فکر مند رہتے ہیں۔ اسے سنوارنے اور یہاں کی گلیوں کو رنج والم سے دور کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کا ترقی پسند شعور میں ہمیں پرولتاریہ طبقے کی فکر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اپنی ایک نظم میں وہ طالبان کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کا ذکر کرتے ہیں۔ بہترین اسلوب کا استعمال کرتے ہوئے کس مہارت سے انہوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔

اس کی عمر بیالس برس تھی
اسے بوچڑ خانے لے جایا گیا
وہ نہیں بچ سکا اسے مترادف لگے ہوں گے
انسان اور حیوان کے لفظ
جب اسے اندازہ ہوا ہو گا
دونوں کو ایک ہی طریقے سے
مارا جا سکتا ہے (۱۴۹)

سید کاشف رضا کی شاعرانہ تخلیقات ہمیں عہد حاضر کے حالات وواقعات سے آگاہ کرتی ہیں۔ ان کی شاعری ما بعد نو آبادیاتی اثرات کو بھرپور انداز میں بیان کرتی ہے۔ انہوں نے اسی عمدہ اسلوب کی بدولت مابعد نو آبادیاتی اثرات کو بے باک انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں ہمیں ملک و قوم کے حالات وواقعات کا ذکر ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فضل احمد خسرو، لمحہ موجود، سانجھ پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۲ء ص: ۴۲

۲۔ ایضاً ص: ۵۹

۳۔ ایضاً ص: ۸۵

۴۔ فضل احمد خسرو، شہر بے اذاں، لیبر فرنٹ اوکاڑہ، ۲۰۰۶ء ص: ۳۲

۵۔ ایضاً ص: ۴۹

۶۔ فضل احمد خسرو، لمحہ موجود، ایضاً ص: ۶۹

۷۔ ظفر اقبال، ننھے شہر کا منا شاعر، مشمولہ نوائے وقت لاہور، ۷ فروری ۱۹۸۴ء

۸۔ اقبال صلاح الدین، تقریب، دریافت، دیباچہ، صبح صدا، یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۴ء

۹۔ ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، بہزاد پبلیشرز راولپنڈی، ۲۰۰۶ء ص: ۷۸

۱۰۔ ایضاً ص: ۸۶

۱۱۔ عابد علی عابد، سید، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲ء ص: ۸۸

۱۲۔ اشکر فاروقی، دانش کی صلیب کا گوتم، مشمولہ کوہسار، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اصغر مال کالج راولپنڈی، ۲۰۱۱ء ص: ۱۲۸

۱۳۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، القا پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۱۴ء ص: ۳۲

۱۴۔ ایضاً ص: ۳۵

۱۵۔ ضیاء الحسن، بار مسلسل، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور ۲۰۱۴ء ص: ۹۹

۱۶۔ ایضاً ص: ۳۲

۱۷۔ سعادت سعید، شناخت، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۲۰۱۷ء ص: ۸۱

۱۸۔ مظہر حسین سید، سکوت، مثال پبلیشرز فیصل آباد ۲۱۰۹ء ص: ۱۰۳

۱۹۔ ایضاً ص: ۷۳

۲۰۔ نواز شاہد، سایہ تاک، الحمد پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۶ء ص: ۱۴۵

۲۱۔ ایضاً ص: ۱۵۰

۲۲۔ ایضاً ص: ۱۳۷

۲۳۔ روش ندیم، نواز شاہد کی، مئے لالہ فام، مشمولہ سایہ تاک، ص: ۱۴

۲۴۔ حارث خلیق، عشق کی تقویم میں، مکتبہ دانیال کراچی، ۲۰۱۲ء ص: ۲۰۳

۲۵۔ فضل احمد خسرو، لمحہ موجود، ایضاً ص: ۸۲

۲۶۔ ایضاً ص:۶۸

۲۷۔ فضل احمد خسرو، شہر بے اذاں، ایضاً ص: ۵۶

۲۸۔ ارشد معراج، دوستوں کے درمیاں، رمیل ہاؤس آف پبلشنگ راولپنڈی، ۲۰۱۹ء ص: ۱۲۴

۲۹۔ روش ندیم، ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں، حرف اکادمی راولپنڈی ۲۰۰۱ء ص: ۳۹

۳۰۔ ایضاً ص: ۲۴

۳۱۔ ضیاء الحسن، بار مسلسل، ایضاً ص: ۵۲

۳۲۔ ایضاً ص: ۱۱۴

۳۳۔ سعادت سعید، شناخت، ایضاً ص: ۱۰۵

۳۴۔ مظہر حسین سید، سکوت، ایضاً ص: ۳۰

۳۵۔ ایضاً ص: ۴۸

۳۶۔ ایضاً ص:۱۲۰

۳۷۔ نواز شاہد، سایہ تاک، ایضاً ص: ۱۲۵

۳۸۔ ایضاً ص:۱۳۶

۳۹۔ ایضاً ص:۱۰۶

۴۰۔ ایضاً ص:۱۴۷

۴۱۔ ایضاً ص:۶۹

۴۲۔ روش ندیم، نواز شاہد کی مئے لالہ فام، سایہ تاک، نواز شاہد، ص: ۱۴

۴۳۔ حارث خلیق، میلے میں، پاکستان پبلشنگ ہاؤس کراچی ۲۰۱۲ء ص:۸۴

۴۴۔ ایضاً ص: ۷۵

۴۵۔ حارث خلیق، عشق کی تقویم میں، ایضاً ص: ۱۸۳

۴۶۔ اشکر فاروقی، ہر مجدون کا نوحہ گر، اسلوب، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء ص:۱۶

۴۷۔ ایضاً ص: ۲۰

۴۸۔ ارشد معراج۔ کتھا نیلے پانی کی ایضاً ص: ۵۱

۴۹۔ ضیاء الحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور ۲۰۱۷ء ص: ۱۰۵

۵۰۔ نواز شاہد، سایہ تاک، ایضاً ص: ۱۷۱

۵۱۔ حارث خلیق، میلے میں، ایضاً ص: ۴۸

۵۲۔ فضل احمد خسرو۔ لمحہ موجود، ایضاً ص: ۴۷

۵۳۔ سعادت سعید، شناخت، ایضاً ص: ۸۹

۵۴۔ ایضاً ص: ۱۰۸

۵۵۔ مظہر حسین سید، سکوت، ایضاً ص: ۱۳۰

۵۶۔ ناصر علی سید، مظہر حسین سید کا سکوت،، مشمولہ، سکوت، مظہر حسین سید، ایضاً ص: ۲۵

۵۷۔ روش ندیم، ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۴۰

۵۸۔ ضیاء الحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، ایضاً ص: ۸۹

۵۹۔ سعادت سعید، کچھ کام اور بھی کرنے کے ہیں، مشمولہ آدھی بھوک اور پوری گالیاں، ضیاء الحسن، ص: ۱۰

۶۰۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص: ۴۶

۶۱۔ ایضاً ص: ۴۱

۶۲۔ اشکر فاروقی، ہر مجدون کا نوحہ گر، ایضاً ص: ۵۳

۶۳۔ ایضاً ص: ۲۷

۶۴۔ ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، ایضاً ص: ۸۰

۶۵۔ سعادت سعید، شناخت، ایضاً ص: ۱۱۰

۶۶۔ ایضاً ص: ۱۰۹

۶۷۔ ایضاً ص: ۸۹

۶۸۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ دانیال کراچی، ص: ۲۲۳

۶۹۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص: ۲۴

۷۰۔ مظہر حسین سید، سکوت، ایضاً ص: ۶۵

۷۱۔ ایضاً ص: ۸۹

۷۲۔ نواز شاہد، سایہ تاک، ایضاً ص: ۱۳۲

۷۳۔ حارث خلیق، عشق کی تقویم میں، ایضاً ص: ۲۳۱

۷۴۔ ایضاً ص: ۵۰

۷۵۔ روش ندیم، ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۸۵

۷۶۔ رشید امجد، غزل کی جبریت سے آزاد نظمیں، (مشمولہ) ماہنامہ ان کوٹ بریڈ فورڈ ص: ۱۶۱

۷۷۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص: ۲۴

۷۸۔ مظہر حسین سید، سکوت، ایضاً ص: ۳۸

۷۹۔ ایضاً ص: ۰۹

۸۰۔ روش ندیم، ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۹۵

۸۱۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، جدید نظم کی تیسری جہت اور چوتھا پڑاؤ، مثال پبلیشرز، فیصل آباد ۲۰۱۰ء ص: ۱۲۸

۸۲۔ سعادت سعید، بانسری چپ ہے، ایضاً ص: ۸۶

۸۳۔ ایضاً ص: ۱۲

۸۴۔ نواز شاہد، سایہ تاک، ایضاً ص: ۱۱۴

۸۵۔ فضل احمد خسرو، لمحہ موجود، ایضاً ص: ۷۶

۸۶۔ ایضاً ص: ۵۴

۸۷۔ ضیاء الحسن، بار مسلسل، ایضاً ص: ۹۹

۸۸۔ ایضاً ص: ۹۴

۸۹۔ نواز شاہد، سایہ تاک، ایضاً ص: ۷۴

۹۰۔ مظہر حسین سید، سکوت، ایضاً ص: ۷۴

۹۱۔ ایضاً ص: ۱۳۱

۹۲۔ روش ندیم، اک سکوت کے ان سنے شور کی تفہیم، مشمولہ سکوت، مظہر حسین سید، ص: ۰۶

۹۳۔ نواز شاہد، سایہ تاک، ایضاً ص: ۹۳

۹۴۔ ایضاً ص: ۱۱۶

۹۵۔ایضاً ص: ۶۲

۹۶۔ایضاً ص: ۶۳

۹۷۔اشکر فاروقی، ہر مجدون کا نوحہ گر، ایضاً ص: ۶۹

۹۸۔فضل احمد خسرو، شہر بے اذاں، ایضاً ص: ۷۶

۹۹۔ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، ایضاً ص: ۵۶

۱۰۰۔روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۳۸

۱۰۱۔ایضاً ص: ۵۹

۱۰۲۔رشید امجد، غزل کی جبریت سے آزاد نظمیں، (مشمولہ) ماہنامہ ان کوٹ بریڈ فورڈ، ص: ۱۵۹

۱۰۳۔روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۸

۱۰۴۔اثر لکھنوی، چھان بین، سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۵۰ء ص: ۳۷

۱۰۵۔فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات اردو جامع (نیا ایڈیشن) فیروز سنز لمیٹڈ لاہور س ن ص: ۹۴

۱۰۶۔شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد س ن، ص: ۴۸

۱۰۷۔محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول ۱۹۸۹ء ص: ۳۶

۱۰۸۔نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات (جلد اول الف ب) نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد طبع سوم ۱۹۸۹ء، ص: ۳۱

۱۰۹۔عابد علی عابد، اسلوب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۶ء ص: ۶۲

110- George Turner , Stylistics,pangeon book 1973 pg 21

111- Ailan ,warner ,A Short Guide to English Style ,Oxford University Press London 1961 pg.2

۱۱۲۔آل احد سرور، نثر کا اسٹائل، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۷۳ ص: ۴۸

۱۱۳۔ایضاً ص: ۴۹

114- Raimand Champion ,Linguistic and literature ,Adward Arnald Publishers London 1974 pg.12

115- John Midltonmary the problem of style Oxford Paper Book London 1967 pg. 04

116- Garaham Huff ,Style and stylistics Roultedge London 1972 pg. 03

۱۱۷۔ رابعہ سرفراز، ڈاکٹر، اسلوب کیا ہے؟ مشمولہ تخلیقی ادب، شمارہ ۵، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء ص: ۱۴۲، ۱۴۱

۱۱۸۔ آل احمد سرور، نثر کا اسٹائل، مشمولہ، اسالیب نثر پر ایک نظر، مرتب ڈاکٹر ضیاء الدین، ادارہ فکر جدید، دریا گنج نئی دہلی، نقش اول، ۱۹۸۹ء ص: ۲۷

۱۱۹۔ نثار احمد فاروقی، اسلوب کیا ہے، مشمولہ، اسالیب نثر پر ایک نظر، ایضاً ص: ۱۱

۱۲۰۔ آل احمد سرور، نثر کا سٹائل، ایضاً ص: ۳۸۔۳۹

۱۲۱۔ مرزا خلیل بیگ، زبان، اسلوب اور اسلوبیات، ادارہ زبان و اسلوب علی گڑھ ۱۹۸۳ء ص: ۱۶۶

۱۲۲۔ آل احمد سرور، نثر کا سٹائل، ایضاً ص: ۴۵

۱۲۳۔ سعادت سعید، شناخت، ایضاً ص: ۹۱

۱۲۴۔ ایضاً ص: ۱۱۰

۱۲۵۔ ایضاً ص: ۱۰۹

۱۲۶۔ ضیاء الحسن، بار مسلسل، ایضاً ص: ۶۵

۱۲۷۔ ایضاً ص: ۸۶

۱۲۸۔ ایضاً ص: ۰۹

۱۲۹۔ ضیاء الحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، ایضاً ص: ۶۰

۱۳۰۔ ایضاً ص: ۷۱

۱۳۱۔ روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، ایضاً ص: ۴۲

۱۳۲۔ ایضاً ص: ۴۶

۱۳۳۔ فضل احمد خسرو، لمحہ موجود، ایضاً ص: ۵۰

۱۳۴۔ماجد مشتاق رائے،اسلوب نگارش،عبداللہ اکیڈمی لاہور ۲۰۱۷ء ص: ۲۵

۱۳۵۔ فضل احمد خسرو،لمحہ موجود، ایضاً ص: ۴۵

۱۳۶۔ایضاًص: ۱۳۶

۱۳۷۔نواز شاہد،سایہ تاک، ایضاً ص: ۱۸۰

۱۳۸۔ایضاًص: ۱۶

۱۳۹۔ ایضاًص: ۱۴

۱۴۰۔ایضاًص: ۸۴

۱۴۱۔مظہر حسین سید،سکوت، ایضاً ص: ۸۱

۱۴۲۔ایضاًص: ۰۶

۱۴۳۔ایضاًص: ۴۳

۱۴۴۔ایضاًص: ۱۳۱

۱۴۵۔اشکر فاروقی،ہر مجدون کا نوحہ گر، ایضاًص: ۶۰

۱۴۶۔ایضاًص: ۶۳

۱۴۷۔ایضاًص: ۱۰۱

۱۴۸۔ایضاًص: ۰۶

۱۴۹۔ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، ایضاًص: ۶۲

۱۵۰۔ایضاًص: ۴۲

۱۵۱۔ ایضاًص: ۷۲

۱۵۲۔حارث خلیق، عشق کی تقویم میں، ایضاً ص:۶۵

۱۵۳۔کاشف رضا،سید، ممنوع موسموں کی کتاب،ایضاًص: ۷۱

باب پنجم

مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

مجموعی جائزہ:

ترقی پسند ادب کے بنیاد گزاروں نے ایک تحریک چند مقاصد کے حصول کے لیے شروع کی تھی۔ان میں زندگی کی ترجمانی یعنی "ادب برائے زندگی" کے رویے کو خصوصی مقام حاصل تھا۔اس تحریک سے وابستہ ادیبوں کے بارے میں آج بھی یہ تصور موجود ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے منشور اور روایت کے تحت ادب تخلیق کر رہے ہیں۔اس تحریک کی ابتدا سے لے کر تاحال نامی گرامی ادیب اس تحریک کی فکر سے متاثر ہوئے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔البتہ چند غور طلب پہلو ایسے بھی ہیں کہ جن کی طرف توجہ کرنا ضروری تھا مثلاً کیا ترقی پسند تحریک سے جڑنے والا ہر ادیب پوری طرح ترقی پسند فکر اور منشور کے تحت شاعری کرتا ہے یا ان کے ہاں اپنے عصر کے تقاضوں اور اثرات کے مطابق نئی چیزیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی میں اردو ادب کو جدید خیالات اور افکار نے بڑی تیزی اور قوت کے ساتھ متاثر کیا۔ذرائع ابلاغ کی ترقی اور دیگر وجوہات کے سبب پہلے کی نسبت اب علم کا سفر تیز رفتار ہے۔

نو آبادیاتی دور کے اختتام پر مابعد نو آبادیاتی مطالعات کا سلسلہ بھی مغرب سے شروع ہوا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے ان علاقوں کے لکھنے والوں کو خصوصیت کے ساتھ متاثر کیا جہاں کبھی نو آبادی قائم تھی۔پاک وہند بھی چونکہ برطانوی نو آبادی رہنے کے بعد آزاد ہوا تھا لہٰذا یہاں بھی ادبی حلقوں میں مابعد نو آبادیاتی افکار وخیالات نے لکھنے والوں کو متاثر کیا۔زیر نظر تحقیق میں معاصر ترقی پسند شاعروں کے ہاں مابعد نو آبادیاتی عناصر تلاش کرنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ادب میں نو آبادیات کے لفظ سے ہی یہ معانی سامنے آتے ہیں کہ "نئی آبادی"۔نو آبادکاروں کے آنے سے دو طرح کے گروہ ہمارے سامنے آئے۔ایک ایسا گروہ جو فاتح کی حیثیت سے وارد ہوا اور اپنے آپ کو افضل اور اعلیٰ گردانے لگا۔جبکہ دوسرا گروہ مفتوح کی حیثیت رکھتا تھا، جن پر حکومت کی گئی، جن کو زیر کیا گیا اور ان کو ہر طرح سے کم تر اور کم حیثیت گردانا جانے لگا۔نو آبادکاروں نے نئی آبادیاں قائم کر کے یہ ثابت کرنا چاہا کہ ہم

افضل ہیں، اعلیٰ ہیں اور مقامی باشندے ہم سے کم تر، کم حیثیت، جاہل، گنوار اور اجڈ ہیں۔ وہ غیر تہذیب یافتہ ہیں انہیں کوئی شعور نہیں۔ لہذا یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی اصلاح کریں۔ انہیں مہذب بنائیں اور انہیں علم دیں۔ اسی سوچ کو مقامی آبادی پر مسلط کر کے انہوں نے وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، رسم ورواج، زبان ، تہذیب وثقافت اور بول چال کو بدلنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ انہوں نے مقامی آبادی کو یہ باور کرایا کہ ہم آپکے خیر خواہ ہیں اور ہمیں قدرت نے آپکی بھلائی کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔ تاکہ ہم آپ کو مہذب اور تہذیب یافتہ بنا سکیں۔ ایسے ہی نو آبادکاروں کی آمد سے دو طرح کے طبقے ہمارے سامنے آئے، ایک فاتح اور دوسرا مفتوح کہلایا۔

دیکھا جائے تو برصغیر میں نو آبادیاتی نظام نے ایک طویل عرصے تک اپنا راج قائم رکھا، اپنی حکومت قائم رکھی ۔بظاہر تجارت کی غرض سے آنے والے برصغیر کے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے اور وہاں کی مقامی آبادی کو اپنے زیر کر لیا۔ اب عہد حاضر میں نو آبادیاتی نظام بظاہر ختم ہو چکا ہے مگر آج بھی ہم اس کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہم آزاد ہوتے ہوئے بھی خود کو آزاد محسوس نہیں کرتے۔ ہم آج بھی معاشی، معاشرتی اور ذہنی طور پر غلام ہیں، ان لوگوں کے ہم غلام ہیں جو ہم پر حکومت کر کے یہاں سے جا چکے ہیں۔ مگر وہ اتنے شاطر ہیں کہ جانے کے باوجود اپنی جڑیں وہ اتنی گہری کر گئے ہیں کہ ہم آج بھی ان کی غلامی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پائے۔ ہمارے لیے آج بھی ان کے فریب سے نکلنا ممکن نہیں۔

ترقی پسند فکر سے وابستہ شعراء عوام میں جلد ہی مقبول ہو گئے۔ کیونکہ وہ اپنی شاعری میں عوام کے مسائل اجاگر کرنے لگے۔ عوام کے مصائب کی ترجمانی ان کی شاعری میں ہونے لگی۔ ترقی پسند تحریک کا منشور درحقیقت نو آبادکاروں کے رویے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا تھا، اس میں نو آبادکاروں سے چھٹکارا پانے، ان سے اپنے مسائل کے حل کے لیے راہ ہموار کرنے اور غریبوں، محکوموں، مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کی ترجمانی کی گئی تھی۔ انہیں للکارتے ہوئے اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کا کہا گیا تھا۔

مجموعی جائزے کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بیشتر ترقی پسند شعراء کے ہاں ترقی پسند فکر آج بھی موجود ہے اور اسی فکر سے جڑے رہ کر وہ اپنے خیالات عوام تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کی ترقی پسند فکر اور ترقی پسند شعور ہمیں ان کی شاعری میں ان کی تخلیقات میں واضح دکھائی دیتا ہے۔ معاصر شعراء کا ترقی پسند شعور اسی منشور کی ترجمانی کرتا ہے جو ترقی پسند تحریک کی بنیاد کا باعث بنا اور اسی منشور کے تحت آج کے شعراء بھی اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ شعراء کے ہاں آج بھی وہ ترقی پسند فکر موجود ہے جس سے عوام کو جھنجھوڑ کر تبدیلی کی

طرف گامزن کیا جاسکتا ہے۔ عہد حاضر کے ترقی پسند شعراء اسی ترقی پسند فکر کو اپناتے ہوئے مابعد نو آبادیاتی اثرات اپنی شاعری میں بیان کر رہے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی اثرات کا غلبہ ہمارے سماج پر اس حد تک اثر انداز ہو چکا ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا ناممکن سی بات نظر آتی ہے۔

دیکھا جائے تو معاصر شعراء کی شاعری میں ترقی پسند فکر کی مشترکہ خصوصیات موجود ہیں۔ معاصر شعراء نے غربت، افلاس، بے روزگاری، معاشرتی ناانصافی، طبقاتی کشمکش اور زرعی ناانصافی کو اپنی شاعرانہ ترقی پسند فکر کا موضوع بنایا ہے۔ معمولی سے فرق کے ساتھ تقریباً سبھی شعراء کے ہاں ہمیں ایسی ہی ترقی پسند فکر کی خصوصیات ملتی ہیں۔

ادب خواہ کسی بھی دور سے تعلق رکھتا ہو اپنی مخصوص پہچان اور مزاج رکھتا ہے۔ کسی بھی دور سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے بہترین ذریعہ اس دور کا ادب ہے۔ جیسا ماحول ہو گا ویسا ہی ادب پروان چڑھے گا اور اسی کے اثرات ہمیں اس دور کے ادب پر نظر آتے ہیں۔ ناول، افسانہ، ڈرامہ یا شاعری میں اسی عہد کے حالات و واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے جو ادب کی سمجھ کے لیے ناگزیر جانے جاتے ہیں۔ کوئی بھی لکھاری اپنے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر ہی تخلیق کی طرف رخ کرتا ہے اس کی تخلیقات اس عہد کی ترجمان گردانی جاتی ہیں ۔ ایسا ادب جو اپنے حالات و واقعات سے مطابقت نہ رکھتا ہو بہت جلد اپنی حیثیت، اہمیت اور قدر کھو دیتا ہے ۔ لہذا یہ بھی لازم ہے کہ لکھاری ادب کی تخلیق کرتے ہوئے اس دور کے حالات و واقعات کو مدِ نظر رکھے اور انہیں اپنی تحریروں میں بیان کرنے کی سعی کرے، تاکہ اس کی تخلیق دیرپا اور پر اثر رہے اور قاری کے ذہن پر اپنا اثر چھوڑ سکے۔

معاصر شعراء کی شعری تخلیقات میں ہمیں مابعد نو آبادیاتی اثرات واضح محسوس ہوتے ہیں۔ معاصر شعراء کی شاعری میں اگر سیاست کا ذکر کریں تو ان کی بیشتر سیاسی شاعری نو آبادیاتی اثرات سے پُر ہے۔ حکمران اپنی تجوریاں بھرنے، اپنے اثاثے بڑھانے اور سپر پاورز سے اپنے تعلقات بنانے کی فکر میں ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ ان کی رعایا غربت کی چکی میں پس رہی ہے یا وہ اس حد تک مجبور ہو چکی ہے کہ ان کے پاس کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی اور رہنے کے لیے چھت بھی میسر نہیں۔ حکومت وقت محکوموں ، مزدوروں کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے انہیں تسلیاں دینی میں لگی ہے۔ محکوموں کی بھلائی کے لیے این جی اوز کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ درحقیقت اپنی نیک نامی کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں اس سے غریب عوام کا مزید استحصال ہوتا ہے۔ اور حکمرانِ وقت وہ تمام مراعات جو

غرباء کو دینے کا وعدہ کرتے ہیں وہ ان سے مکر جاتے ہیں۔ ایسا ہی حال نو آبادیاتی دور میں بھی ہوا۔ بظاہر سنہرا خواب نظر آنے والے حالات کے در پر درہ مقاصد کچھ اور ہی ہوتے تھے۔

مابعد نو آبادیاتی دور میں عصر حاضر کے معروف شعراء اپنی ترقی پسند فکر کے ذریعے نہ صرف مسائل کو اجاگر کرنے میں مصروف ہیں بلکہ ان مسائل کے حل کے لیے کوشاں بھی ہیں۔ روش ندیم کی تحریروں میں، ان کی شاعرانہ تخلیقات میں ہمیں حاکم وقت کے خلاف للکار سنائی دیتی ہے۔ وہ نہ صرف حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ معاشرے میں ہونے والی بے حسی اور بے بسی کو بھی اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں کسی بھی انسان کو دوسرے کا دکھ درد محسوس نہیں ہوتا۔ ہر طرف نفسا نفسی کا سا عالم ہے۔ آگے نکلنے کی دوڑ میں اچھائی برائی کے فرق کا مٹا دیا گیا ہے ۔ نیکی بدی کے مقابلے میں غالب آ رہی ہے۔ ایسے میں معاصر شعراء اپنی تحریروں سے عوام کو نہ صرف بیدار کرتے ہیں بلکہ ان کی شاعری عوام کے لیے ایک ڈھال کا کام بھی کرتی ہے۔ روش ندیم کی تحریروں میں ہمیں آج بھی وہی ترقی پسند فکر دکھائی دیتی ہے جس کے تحت باقاعدہ ترقی پسند تحریک کو شروع کیا گیا تھا۔

ادب کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کی تنقید کرتا ہے۔ عہد حاضر کے شعراء نے بھی اپنی شاعری میں معاشرتی حالات و واقعات کی نہ صرف ترجمانی کی ہے بلکہ اپنی ترقی پسند فکر سے سیاسی و سماجی مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو بھی بیان کیا ہے۔ سیاست میں جمہوریت کی بناء پر ہی عوام کو خوشحالی اور سکون میسر آ سکتا ہے۔ مگر مابعد نو آبادیاتی صورتحال میں سیاست میں جمہوریت بس نام کی حد تک رہ گئی ہے ۔ فضل احمد خسرو نے اپنی شاعری میں مابعد نو آبادیاتی سیاسی صورتحال کو اپنی ترقی پسند فکر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری میں سیاست اور سیاسی حکمرانوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر پائی جاتی ہے۔ وہ طاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ طاقت کا بدمست ہاتھی خونخوار ہو جاتا ہے۔ اور ہر اچھے برے کو اپنے قدموں تلے روندتا چلا جاتا ہے۔ اپنی کتاب "لمحہ موجود" کے صفحے نمبر ۳۰ پر وہ لکھتے ہیں:

طاقت کا بدمست و خونخوار ہاتھی
مری ہستیوں کو
مری بستیوں کو
سرے سے ہی نابود کرتا ہوا دوڑتا جا رہا ہے

معاصر شعراء کی شاعری میں مابعد نو آبادیاتی اثرات سے نہ صرف ملکی مسائل کو اجاگر کیا ہے بلکہ موجودہ سیاسی حالات پر تنقید بھی کی ہے۔ فضل احمد خسرو اپنی شاعری میں ہی آدم زاد کا آدم زاد سے بھیک مانگنے پر طنز کر رہے ہیں کہ جب سب کو پیدا کرنے والی ذات ایک ہے تو پھر دنیا میں آدم زاد کیوں دوسروں کا محتاج ہے۔ اور آدم زاد کیوں آقا اور دیوتا بن بیٹھا ہے۔ اپنی ایک نظم "اے میرے رب سچے" میں وہ لکھتے ہیں:

آدم کے پھر رزق میں رازق نے کی تفریقیں
آدم زاد ہی مانگ رہا ہے آدم زاد سے بھیکیں

اس شعر وہ مابعد نو آبادیاتی حالات کو واضح کرتے ہیں۔ نو آبادکاروں کے چلے جانے کے باوجود ملکی صورتحال ایسی ہی ہے کہ آقا اور غلام کا تصور آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ آج بھی ہم مغربی تہذیب کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مغربی اقدار و روایات کو ہم اپنی اقدار و روایات پر فوقیت دیتے ہیں جس مقصد کے تحت ترقی پسندوں نے اپنی الگ فکر کے باعث تحریک کو فروغ دیا وہی ترقی پسند فکر ہمیں فضل احمد خسرو کی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ اور اپنی اسی ترقی پسند فکر کو اپناتے ہوئے وہ اپنی شاعری میں مابعد نو آبادیاتی صورتحال کو بیان کرتے ہیں۔

زیر نظر موضوع کا تجزیہ کرتے ہوئے نظری دائرہ کار کے نکات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ جس کا ایک اہم نکتہ مغرب نے مشرق میں سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام متعارف کرایا۔ مابعد نو آبادیاتی صورتحال کی بات کی جائے تو یہ طبقے واضح انداز میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے حاکموں، امراء، جاگیر دار، سرمایہ دار اور صنعت کار طبقے کا ذکر کرتے ہوئے نو آبادکاروں سے تشبیہ دی ہے کہ وہ کس طرح باہر سے آکر ہم پر قابض ہو گئے اور ہماری زمین، جائیداد، رسم و رواج غرض زندگی کے ہر شعبے میں اپنا اثر قائم کرتے ہوئے یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ معاصر شعراء نے عہد حاضر میں نو آبادکاروں کی وضاحت کے لیے جاگیر دار اور سرمایہ دار طبقے کو پیش کیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک نو آبادکاروں اور ان جاگیر داروں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ۔ دونوں کا انداز ایک سا ہے۔ اور دونوں اپنے اپنے انداز سے محکوموں کا استحصال کرنے میں لگے ہیں اور غرباء کا استحصال کرنا ہی اپنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ عہد حاضر کی مابعد نو آبادیاتی شاعری میں یہ بات واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے کہ عہد حاضر کے ترقی پسند شاعر محنت اور معاوضے کے حوالے سے چپ نہیں ہیں اور نہ ہی وہ مزدوروں کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ محنت کے بدلے جائز اور مناسب

معاوضہ مزدور کا جائز حق ہے۔ اور اگر یہی مزدور یکجا ہو جائیں تو جاگیر دار اور سرمایہ دار اپنی طاقت کھو بیٹھیں گے کیونکہ ان کی طاقت مزدوروں کے بل بوتے پر ہی ہے۔

تخلیق کار چونکہ حساس ذہن کے مالک ہوتے ہیں کسی بھی واقعہ کا اثر وہ دوسروں کی نسبت زیادہ قبول کرتے ہیں ۔اور یہی حالات وواقعات ان کی تخلیق پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ حساس اور ترقی پسند فکر کے حامل ذہن کے تخلیق کار کی تخلیقات میں ہمیں وہ تمام عناصر ملتے ہیں جو ملکی سیاست اور بدامنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں یہ چیز واضح انداز میں دیکھی جاسکتی ہے کہ کس طرح ملکی سیاست بدامنی کا شکار ہوتے ہوئے تباہی کی طرف جارہی ہے۔ ایسے میں محکوموں کا استحصال کرنا فرض اولین سمجھا جاتا ہے۔ ان کو ان کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ انہی حالات کا ذکر معاصر شعراء کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ معاصر شعراء نے اپنی ترقی پسند فکر سے نہ صرف حالات کی خرابی کا ذکر کیا ہے بلکہ وہ ان کے حل کے لیے کوشاں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ معاصر شعراء نے اپنی شاعری میں زرعی معاشرتی نظام، طبقاتی کشمکش غرباء کے مسائل، محکوموں کی روزی روٹی اور رہائش کے مسائل کے ساتھ ساتھ ان کے اناج کے مسئلے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح کے خیالات کا ذکر ہمیں ضیاء الحسن کی شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اپنی شعری تخلیقات میں وہ غریب کسانوں پر ہونے والے مظالم کو واضح انداز میں بیان کرتے ہیں۔

عہد حاضر کے یہ شاعر اپنی تخلیقات میں ان سب پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں جو مابعد نو آبادیاتی دور میں ہمارے معاشرے اور ہمارے ذہنوں میں رچ بس گئے تھے۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے ذہن اور سماج کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ اب مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی ہم نو آبادیاتی اثرات سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ بظاہر اس بات کا دعوٰی کرنے والے ہم کہ آزاد جمہوری ملک کے باسی ہیں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ آزاد مملکتوں میں دل اور دماغ مفلوج نہیں ہوتے۔ ہر طرح کا فیصلہ کرنے کی آزادی عوام کو دی جاتی ہے۔ بلکہ عہد حاضر کی معاشرتی صورتحال، سیاسی وسماجی کشمکش اس بات کی نفی کرتی ہے کہ ہم آزاد جمہوری مملکت کے رہائشی ہیں۔ محبت، امن اور سکون جو معاشرے کو امن کا گہوارہ بنانے میں معاون ثابت ہوتے تھے اب عصر حاضر میں ناپید ہو چکے ہیں۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں ایک کو دوسرے کی پروا نہیں۔ ہر کوئی اپنی ہی دھن میں مگن ہے۔ امیر پہلے سے امیر تر ہوتا جارہا جبکہ غریب دن بدن غربت کی چکی میں پستا جارہا ہے۔ اس غریب کے لیے کوئی مناسب حل نہیں کہ وہ اپنے حالات درست کر سکے۔ ایسے میں پھر بغاوت ہی واحد حل ہے جو انہیں امراء کے خلاف نبرد آزما ہونے پر اکساتی ہے۔

کوئی بھی ملک اس وقت تک ترقی کہ دوڑ میں شامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی عوام کے مسائل کا مناسب حل تلاش نہ کر لے۔ افراد معاشرہ کا پر سکون ہونا ہی ملکی ترقی کا ضامن ہے۔ ترقی پزیر ممالک میں عوام کو بنیادی ضروریات کا حصول فراہم کرنا ہی اولین مسئلہ ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی معاشرہ کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ معاصر ترقی پسند شعراء کی شاعری میں بھی یہی جھلک نظر آتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی دور میں غربت اور مفلسی عوام کا اہم مسئلہ ہے۔ مظہر حسین سید اپنی کتاب "سکوت" کے صفحہ نمبر ۳۵ میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کسی طرح بھی نہ آسیب مفلسی اترا
دعا بھی کی گئی، تعویذ بھی پلایا گیا

مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی ہم اس مفلسی سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اور اب جب کہ نو آبادیاتی دور کا خاتمہ ہو چکا ہے، نو آبادکار اپنی اقدار، روایات اور رسم و رواج چھوڑ کر یہاں سے کوچ کر چکے ہیں مگر ان سب کے باوجود آج بھی غربت اور مفلسی کا راج ہے۔ اسی کا ہر طرف دور دورہ ہے۔ عوام آج بھی اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے سے گھبراتی ہے کیونکہ انہیں اس بات کا ڈر اور خوف ہے کہ کہیں انہیں حق بات کہنے کی پاداش میں سزا نہ دے دی جائے۔ اسی ڈر اور خوف کا ذکر معاصر شعراء اپنی شاعری میں برملا کرتے ہیں ۔ وہ عوام میں حوصلہ اور بہادری پیدا کرتے ہوئے انہیں اپنے حق کے لیے بولنا سکھاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد حاضر کی شاعری میں ہمیں اس بات کا نوحہ ملتا ہے کہ حالات آج بھی جوں کے توں ہیں۔ حکومت کرنے کا جو طریقہ نو آبادکار نافذ کر گئے تھے وہ آج بھی ویسا ہی ہے۔ امراء اپنے حکمرانوں کو خوش کرنے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کمزوروں پر ظلم کرتے ہوئے انہیں انسان تک نہیں سمجھتے۔ غرض جو کچھ نو آبادیاتی عہد میں تھا آج بھی سب کچھ ویسا ہی ہے۔ کچھ بھی تبدیلی نہیں آئی۔ تبدیلی صرف یہ ہوئی ہے کہ نو آبادکار چلے گئے ہیں اور اپنے باقیات چھوڑ گئے ہیں۔ ان کے بنائے گئے اصول و قوانین آج بھی ہر شعبے میں موجود ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کا تعلق مقامی آبادی سے صرف کھیل تماشے کی حد تک ہے۔ ہماری تعلیمی پالیسی آج بھی نو آبادکاروں کی مرہون منت ہے۔ معاصر شعراء نے اپنی ترقی پسند شاعری میں ان نکات کو اجاگر کیا ہے جو نو آبادیاتی عہد سے لے کر مابعد نو آبادیاتی عہد تک بالکل ویسے ہی ہیں، جن میں زرا بھی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ معاصر شعراء کی شاعری میں مارکسی فکر واضح دکھائی دیتی ہے اپنے حق کے لیے لڑنا اور

باطل کے سامنے ڈٹ جانا ان کے ترقی پسند شعور کا خاصہ ہے۔ یہی ترقی پسند شعور اور مارکسی فکر ہمیں معاصر شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔

بات سعادت سعید کی نئی تراکیب و تشبیہات کی ہو یا ارشد معراج کے ترقی پسند شعور کی، حارث خلیق کی شاعرانہ فکر ہو یا اشکر فاروقی کا سوچتا، محسوس کرتا اور کڑھتا ہوا ذہن، ہر ایک کی تحریر میں ہمیں عہد حاضر کے حالات کی عکاسی اور مسائل نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کی شاعری میں ترقی پسند فکر غالب نظر آتی ہے اور کسی کی تخلیقات میں ان کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ مظہر حسین سید، نواز شاہد، ارشد معراج، روش ندیم، ضیاء الحسن، سعادت سعید کی شعری تخلیقات میں ہمیں ان کا ترقی پسند شعور اور ترقی پسند فکر واضح دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ کاشف رضا، اشکر فاروقی اور حارث خلیق کی شاعری میں ترقی پسند فکر کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی آج کا انسان غلامی کی زنجیروں سے خود کو چھڑانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے ذہن ،اس کی سوچ، اس کی فکر، غرض ہر ایک میں نو آبادکار کا غلبہ ہے اور ہم چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ان کے شکنجے سے محفوظ نہیں کر سکتے۔

الغرض بدلتے ہوئے حالات وواقعات اور ادوار کے تقاضوں کو معاصر شعراء نے بخوبی اپنی شاعری میں سمیٹا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں اسلوب کی نئی جہتیں بھی ملتی ہیں اور حالات حاضرہ کا نوحہ بھی۔ جس سے ہم یہ فیصلہ کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں کہ معاصر شاعری اپنے اندر وہ تمام خصوصیات رکھتی ہے جو عہد حاضر کی ضرورت ہے۔ انہی میں عوام کے مسائل بھی شامل ہیں جن کا ذکر ہمیں ہر ترقی پسند شاعر کی شاعری میں برملا ملتا ہے۔ کہنے کو ہم جمہوری ملک میں سانس لے رہے ہیں مگر جمہوریت درحقیقت کیا ہے اس کا فیصلہ آج تک کوئی نہ کر سکا۔ ہر باشعور انسان کے ذہن و دماغ میں جمہوریت کی الگ تصویر ہے الگ تعریف ہے۔ کسی بھی ملک کی سیاسی و سماجی ترقی میں یہ کس حد تک مفید ہے اس کا فیصلہ اس ملک کے باشعور رعایا ہی جانتی ہے۔ جمہوری نظام حکومت کا ذکر ہی ہمیں ترقی پسند شعراء کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ آمریت کے برخلاف اگر جمہوریت کا نفاذ عمل میں لایا جائے تو مسائل پیدا ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیں۔ آمریت میں صرف حکومت کی جاتی ہے، حکم چلایا جاتا ہے اس بات کا احساس بالکل نہیں کیا جاتا کہ جو فیصلے حکمران وقت کر رہے ہیں کیا وہ عوام کی بھلائی کے لیے بھی ہیں یا محض ان کی اپنی بقا کے لیے ہیں۔ بیشتر معاصر شعراء کی شاعری میں ہمیں ترقی پسند فکر اور شعور واضح انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

(ب) نتائج:

مقالے کی تکمیل کے بعد اس کے تحقیقی سوالات کے جواب کچھ اس صورت میں ملے ہیں۔

ا۔ بیشتر ترقی پسند شاعروں کا عصر حاضر میں بنیادی امتیاز ترقی پسند سوچ اور فکر ہے۔ چند شعراء کے ہاں ترقی پسند تحریک کے منشور کو ثانوی حیثیت مل گئی ہے جن میں حارث خلیق، کاشف رضا سید اور اشکر فاروقی شامل ہیں۔ البتہ بعض معاصر ترقی پسند شعراء نے ترقی پسند تحریک کے منشور کی پیروی کرنے کے ساتھ ساتھ مابعد نو آبادیاتی فکر کے اثرات بھی قبول کیے ہیں جن میں سعادت سعید، روش ندیم، ضیاء الحسن، مظہر حسین سید شامل ہیں۔

۲۔ بعض ترقی پسند شاعروں کے ہاں مابعد نو آبادیاتی فکری رجحانات کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں ۔مابعد نو آبادیاتی فکر کے مطابق استعمار کار کو ہر سطح پر اجارہ داری حاصل ہوتی ہے۔ ان کی ترقی پسند شاعری میں استعمار کار کی اس برتری کے خلاف احتجاج اور رد عمل کی صورتیں نمایاں ہیں۔

۳۔ ترقی پسند تحریک کے منشور اور مقاصد کے مطابق ادب کو جدید زندگی کی پیچیدگیوں کا ترجمان ہونا چاہیے لہذا میری تحقیق کے مطابق معاصر ترقی پسند شعراء جدید زندگی کی ترجمانی کا حق بطریق احسن ادا کر رہے ہیں۔ معاشرے اور انسان کو درپیش مسائل، رجحانات اور افکار یعنی عصر حاضر سے منسلک تمام امور معاصر ترقی پسند شاعری کے موضوعات ہیں، ہر شاعر نے کم و بیش انہی پر خامہ فرسائی کی ہے۔

(ج) سفارشات:

۱۔ معاصر ترقی پسند شاعری کا دیگر جدید فکری تحریکوں کے تحت بھی مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

۲۔ ترقی پسند شاعری کا عروضی مطالعہ بھی اچھا موضوع ہو سکتا ہے۔ اس سے اردو شاعری کے ارتقائی سفر کی اہم منزل کی نشاندہی کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۳۔ ترقی پسند شاعری کے نمائندہ مجلوں کی ادارتی پالیسیوں کے تحت بھی ترقی پسند شاعری کے ارتقائی سفر پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی کتب:

ارشد معراج، کتھا نیلے پانی کی، ایریز پرنٹرز، راول پنڈی، ۲۰۰۶ء

ارشد معراج، دوستوں کے درمیان، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۹ء

اشکر فاروقی، ہر مجددوں کا نوحہ گر، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۸ء

حارث خلیق، میلے میں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۲ء

حارث خلیق، عشق کی تقویم میں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۲ء

روش ندیم، ٹشو پیپر پر لکھی نظمیں، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۱ء

روش ندیم، دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں، القا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

سعادت سعید، بانسری چپ ہے، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۲

سعادت سعید، شناخت، مکتبہ نسیم، لاہور، ۲۰۱۷ء

ضیاالحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۱۴ء

ضیاءالحسن، بارِ مسلسل، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۱۴ء

فضل احمد خسرو، تیرے بے اذاں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

فضل احمد خسرو، لمحۂ موجود، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

کاشف رضا سیّد، محبت کا محل وقوع، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

کاشف رضا سید، ممنوع موسموں کی کتاب، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

مظہر حسین سیّد، سکوت، مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء

نواز شاہد، سایہ ءتاک، الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۶ء

تحقیقی و تنقیدی کتب:

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، (مرتبہ) کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

اثر لکھنوی، چھان بین، سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۵۰ء

احمد سہیل۔ ہیت پسندی، ساختیات اور نئی تنقید کے قطبی افتراقات اور انسکلات، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ۱۹۸۳ء

احتشام حسین، اردو نظم پر تنقیدی نظر، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۰ء

اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ادارہ اشاعتِ اردو حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء

اسٹورٹ ہال، مغرب اور بقیہ دنیا، مشمولہ، جدید تاریخ، مبارک علی، ڈاکٹر، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۰۵ء

اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی نظریات اور اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن ۲۰۱۹ء

اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، بستانِ ادب لاہور ۱۹۸۸ء

افتخار حسین ڈاکٹر، جدیدیت، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، ۱۹۸۶ء

اقبال صلاح الدین، تقریب، دریافت، دیباچہ، صبح صدا، یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۴ء

انور جمال۔ پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، (مترجم یاسر جواد) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، مترجم، محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

آل احد سرور، نثر کا اسٹائل، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۷۳ء

جیلانی کامران، (پیش لفظ) صبح صدا، یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۴ء

جمال نقوی، ترقی پسند تحریک، ادب اور سجاد ظہیر، ادارہ تزئین دانش کراچی، ۲۰۰۶ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء

حسین محمد جعفری، ڈاکٹر، احمد سلیم (مرتبین) پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی، ۱۹۸۷ء

حمیرا اشفاق، ترقی پسند تنقید۔۔۔۔ پون صدی کا قصہ، سانجھ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء

خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء

دیوندر اسر، مابعد جدیدیت مشرق اور مغرب میں مکالمہ، مشمولہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، مرتبہ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء

ذکاء الدین شایان، نثری نظم اور آزاد غزل نمبر، جدت کا ایک تجربہ، جلد ۵۴ شمارہ ۸،۷،۶ مکتبہ قصر الادب، بمبئی ۱۹۸۳ء راجا شکیل انجم، ادب زندگی ہے، پورب اکادمی، ۲۰۰۴ء

راحت بدر، ڈاکٹر، جدید اردو غزل ۱۹۷۱ء سے ۲۰۱۰ء تک، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۱۱ء ص: ۱۰
رشید احمد صدیقی، جدید غزل، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ ۱۹۶۷ء
روش ندیم، صلاح الدین درویش، جدید ادبی تحریکوں کا زوال، گندھارا بکس، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء
سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۸ء
سجاد ظہیر، روشنائی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۷۶ء
سفیر اختر، ادب اور ادیب، دار لمعارف، واہ کینٹ ۱۹۹۸ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء
سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۵ء
سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمن (مولف) منتخب ادبی اصطلاحات، آرٹ پریس، لاہور، ۲۰۰۵ء
سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۵ء
سید محمد عقیل، ڈاکٹر، پوسٹ کلونیل ازم: تنقید کی دنیا میں ایک نئی ہوا، مشمولہ، نو آبادیات و مابعد نو آبادیات، مرتبہ، ڈاکٹر عامر سہیل، عکس پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۹ء
شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء
ضمیر علی بدایونی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، اختر مطبوعات، کراچی، ۱۹۹۹ء
طارق ہاشمی، ڈاکٹر، جدید نظم کی تیسری جہت اور چوتھا پڑاؤ، مثال پبلیشرز، فیصل آباد ۲۰۱۰ء
عابد علی عابد، اسلوب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۶ء
عابد علی عابد، سید، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲ء
عتیق اللہ، تنقید کی جمالیات، مارکسیت و نو مارکسیت، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۱۱ء
علی احمد فاطمی، ترقی پسند تحریک: سفر در سفر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۱ء
علی عباس جلالپوری، عام فکری مغالطے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۸ء
عامر ریاض، ڈاکٹر، اردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات، قومی پریس لکھنوء، ۱۹۹۶ء
عامر سہیل، محمد، نو آبادیات و مابعد نو آبادیات، (نظریہ، تاریخ، اطلاق) عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء
عینیہ لومبا، کلانیل ازم: پوسٹ کلونیل ازم، روٹلیج، لندن ۱۹۹۸ء
فرانز فینن، افتادگانِ خاک، (مترجم محمد پرویز، سجاد باقر رضوی) نگارشات لاہور، ۱۹۶۹ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، نیا اور پرانا ادب، کتاب گھر، کراچی ۱۹۷۴ء ص: ۲۳۴

فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ دانیال کراچی، س۔ن
قاسم یعقوب، طاقت اور سماج، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۱ء
قمر جمیل، جدید ادب کی سرحدیں، جلد دوم، مکتبہ دریات کراچی، ۲۰۰۰ء
قمر رئیس، عاشور کاظمی (مرتبہ) ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۹۴ء
قمر رئیس، معاصر اردو غزل مسائل و میلانات، اردو اکادمی دہلی ۲۰۰۶ء
کلیم الدین احمد، عملی تنقید، کتاب منزل، پٹنہ ۱۹۶۳ء
گوپی چند نارنگ، جدیدیت کے بعد، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۶ء
لینن، اشتراکی نظریات اور ثقافت، (مترجم: اشفاق سلیم مرزا) فکشن ہاؤس لاہور ۲۰۱۳ء
لینن، سوشلسٹ جمہوریت، (مترجم: امیر اللہ خان) فکشن ہاؤس لاہور ۲۰۱۳ء
ماجد مشتاق رائے، اسلوب نگارش، عبد اللہ اکیڈمی لاہور ۲۰۱۷ء
مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی ہندوستان، سانجھ پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء
مبارک علی، ڈاکٹر، غلامی اور نسل پرستی، تاریخ پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء
مبارک علی، ڈاکٹر، کلونیل آئیڈیالوجی اور اس کی بنیادیں، مشمولہ، نو آبادیات و مابعد نو آبادیات، مرتبہ، ڈاکٹر عامر سہیل، عکس پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۹ء
مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی، ایوان اشاعت گورکھ پور، س ن،
محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، توازن کی جہات، ارتقاء مطبوعات کراچی، ۲۰۰۴ء
مرزا خلیل بیگ، زبان، اسلوب اور اسلوبیات، ادارہ زبان و اسلوب علی گڑھ ۱۹۸۳ء
مقتدا منصور، ریاست، سیاست اور تاریخ، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۸ء
ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، اردو ادب کی تشکیل جدید، نو آبادیاتی و پس نو آبادیاتی عہد کے اردو ادب کے مطالعات، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۶ء
ناصر عباس نیر۔ ساختیات ایک تعارف، منتخب اردو مقالات، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء
ناصر عباس نیر، جدید اور مابعد جدید تنقید مغربی اردو تناظر میں، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۴ء
ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نو آبادیاتی صورتحال، مشمولہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن ،ڈاکٹر ناصر عباس نیر، کلیہ علوم شرقیہ پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور، ۲۰۰۸ء
نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، نو تاریخیت، مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱۸ء

ہمفرے، ہمفرے کے اعترافات، اکبر بک سیلرز، اردو بازار لاہور س۔ن، ص
ہنس راج رہبر، ترقی پسند ادب، ایک جائزہ، کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۷ء
یاسر ندیم، گلوبلائزیشن اور اسلام، دارالکتاب دیوبند، ۲۰۰۴ء
یعقوب یاور، ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری، سٹی بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۱۸ء

English Books and articles

1. A Dictionary of Politics: Walter Laqueurm Weiedenfeld and Nicolosm, London.

2. Ailan ,warner ,A Short Guide to English Style ,Oxford University Press London 1961.

3. Aine Cesaire,Discourse on Colonialism, monthly Review Press New York, 1965.

4. Albert Memmi,The Colonizer and the Colonized,Plunkett Lake Press,2013.

5. Ania Loomba,Colonialism/Post colonialism,Routledge London,1998.

6. Dr.Hitendra B.Dhote,Sanjeev Khobaragade,Homi K Bhabha,s thoughts of Post Colonialism and its impact on Indian Literature and Writers,Including Pune Research,Interanational Journal in English July,August 2017.

7. Edward Saeed,The world, The Text and the Critic,Vintage Books New York 1983.

8. Edward Saeed,Culture and Imperialism,Vintage London,1994.

9. Edward Saeed,Orientalism,Routledge and Kegan paul,London 1978.

10.Eleanor Ross,Can The Subaltern Speak?Innervate The Uniersity of Nottingham,School of English Studies,Volume 2, 2009,10.

11. Frantz Fanon,A dying Colonialism,Grove Press,Newyork,1959.

12. Garaham Huff ,Style and stylistics Roultedge London 1972.

13. George Turner , Stylistics, pangeon book 1973.

14.Homi K Bhabha,The Location of Culture, Routledge Classic 2004.

15.Javed masood,Sayed,Internationl Political Economy and Globlization ,World Wide Scientific Publishing Singapore 2008.

16.Jmal Malik Encyclopedia of Islam and the Muslim Worlsd, Richard C. Martin Editor, Macmillan Reference, New York, Vol.1.

17.Jonathan Culer: On Deconstruction,Routledge,London,1994.

18. John Midltonmary the problem of style Oxford Paper Book London 1967.

19.K.K.Aziz, The British in India, A Study in Imperialism, Lahore, Sang e Meal Publication, 2007.

20.Kalim uddin Ahmad, jami English Urdu Dictionary National Council for Promotion of Urdu new delhi,1996.

21.Malcom waters,Globlization,Routeldge,New York 2001.

22.Oxford Advanced Learners Dictionary,2004（7th Edition）London, Oxford University Press

23.Pearsall Judy,Oxford Dictionary of English 2nd Oxford University Press 2006.

24. Raimand Champion ,Linguistic and literature ,Adward Arnald Publishers London 1974 .

25.The New Encyclopedia Britannica,vol,20 Chicago 2005.

26.The New International Webster,s Comprehensive Dictionary of the English Language ,2006（Encyclopedia Edition）vol.1, Naples, Trident Reference Publishing.

01

News papers:

Daily Dawn

تحقیقی و تنقیدی مجلے:

بازیافت، شعبہ اردو، اورئینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷

تارکین وطن، لاہور، جنوری ۲۰۰۹ء جلد ۳ شمارہ ۱۲

تخلیقی ادب، شمارہ ۵، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء

خیابان، شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی، شمارہ، خزاں، ۲۰۰۶ء

سہ ماہی عزم، ستمبر ۱۹۹۲ء لاہور

سہ ماہی فروغ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء کراچی

سہ ماہی، فنون، لاہور شمارہ ۱۲۳

سہ ماہی، کہکشاں انٹرنیشنل، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء جلد ۲، شماہ ۹

کوہسار، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اصغر مال کالج راولپنڈی، ۲۰۱۱ء

، ماہنامہ ادب لطیف، اکتوبر ۱۹۵۵

مشمولہ ماہنامہ، عوامی منشور، کراچی شمارہ ۴ جولائی ۲۰۰۲ء

اخبارات:

روزنامہ جنگ، لاہور ۸ مارچ ۱۹۸۵ء

روزنامہ جنگ، اسلام آباد ۲۷ فروری ۲۰۲۰ء

روزنامہ دنیا، لاہور ۲۴ مئی ۲۰۱۳ء

روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۳ مارچ ۲۰۲۱ء

روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۷ فروری ۱۹۸۴ء

اللغات:

شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد س ن.

فرہنگ آصفیہ۔ج ۲۔ ۳ (مرتبہ) سید احمد دہلوی، حسن سہیل لمیٹڈ لاہور، ۱۹۰۸ء

فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات اردو جامع (نیا ایڈیشن) فیروز سنز لمیٹڈ لاہور س ن.

محمد عبد اللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول ۱۹۸۹

نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات (جلد اول الف ب) نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد طبع سوم، ۱۹۸۹ء

ویب گاہیں:

Deban magazine.com

www.dunya .com

www.humsub.com

www.muqalma.com

www.punjud.com

www.urduweb.com